ڈاکوؤں، رہزنوں، جعلی پیروں اور ان کے مزاروں کی ڈھکی چھپی کہانیاں

تاریک اُجالے

وقاص

پیش لفظ

وقاص ادبی دنیا میں ایک نیا نام ہے لیکن انہوں نے "تاریک اُجالے" کے عنوان سے جو داستان سناتی ہے اس میں منجھے ہوئے داستان گو کی پختگی پاتی جاتی ہے۔

پاکستان کی ادبی دنیا خاصے دلچسپ لوگوں کی بسائی ہوئی دنیا ہے۔ اس میں قلمکاروں کے دو گروہ پائے جاتے ہیں۔ ایک کو "نو آموز" یا "نیا" کہا جاتا ہے اور دوسرے "اُستاد" یعنی "پرانے ادیب" کہلاتے ہیں۔ "نو آموز" ادیب اُسے کہتے ہیں جو اُستاد ادیبوں کے حضور سر جھکا کر بیٹھا رہے اور وہ جب بات کریں تو اُن کی صرف ہاں میں ہاں ہی نہ ملائے بلکہ واہ واہ کرے۔ اس کے علاوہ وہ مشاعروں میں جائے اور اُستاد شاعروں کے مصرعے اٹھائے اور بے تحاشہ داد دے۔

اُستاد یا مشہور و معروف ادیب اُسے کہتے ہیں جو حاکمِ وقت کے دربار میں حاضری دیتا رہے۔ چڑھتے سورج کا پجاری ہو۔ کوئی حکمران سوشلزم کا نعرہ لے کر اقتدار میں آجائے تو اُستاد ادیب فوراً کھدر کے کپڑے پہن کر عوام کی ہمدردی کے چرچے کرنے لگے اور اگر حکومت اسلامی ہو تو فوراً داڑھی رکھ لے اور افسانوں اور شعروں میں نماز روزے کی تلقین شروع کر دے۔

شہرت اور تعریف کے لائق یہی ادیب سمجھے جاتے ہیں جو حاکمِ وقت کی خوشنودی حاصل کر لیتے ہیں پھر ریڈیو اُن کا، ٹی وی اُن کا اور سرکاری اخبار اور رسالے اُن کے اور رائٹرز گلڈ بھی اُن کا۔ یہ "ادیب" کوئی شاہکار تخلیق کریں نہ کریں انہیں کسی نہ کسی بہانے انعام مل جاتا ہے۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ کتاب ابھی چھپ رہی ہوتی

ہے لیکن انعام پہلے دے دیا جاتا ہے۔

"حکایت" کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے وہ قلمکار دریافت کئے ہیں جنہوں نے کبھی سوچا بھی نہ تھا کہ وہ کبھی کہانیاں بھی لکھا کریں گے۔ "حکایت" کے حلقوں میں انہوں نے نام پیدا کیا ہے، البتہ "ادبی دنیا" میں انہیں "نوآموز" کہا جاتے گا۔

وقاص جیسے ان گمنام قلمکاروں کی کامیابی کی وجہ یہ ہے کہ یہ افسانے نہیں لکھتے۔ یہ وہی لکھتے ہیں جو وہ دیکھتے ہیں۔ وقاص نے "تاریک اجالے" کو ناول کہا ہے۔ ہم بھی اسے ناول ہی کہیں گے لیکن اس کے بیشتر واقعات حقیقی زندگی سے لئے گئے ہیں۔ اگر کہیں افسانوی رنگ آیا ہے تو اسے بھی حقیقی زندگی کے قریب رکھا گیا ہے۔ اس داستان کے کئی کردار آپ کے اپنے گاؤں اور محلے میں موجود ہوں گے۔

ہم اس کہانی کا تجزیہ پیش نہیں کریں گے۔ یہ آپ کا کام ہے۔ ہم آپ پر اپنی رائے نہیں ٹھونسیں گے۔ کہانی پڑھیں اور خود ہی فیصلہ کریں کہ یہ حقیقت ہے یا افسانہ!

عنایت اللہ

مدیر ماہنامہ "حکایت" لاہور

انسان سینۂ کائنات کا ایک راز تھا — خدا نے اسے بھی فاش کر دیا۔

انسان جو ایک راز تھا اپنے لئے بھی راز ہی بنا رہا اور ابلیس اس راز کو پا گیا۔ ابلیس نے انسان کے آگے سجدہ کرنے سے انکار جو کیا تھا وہ تھا تو بہت بڑا گناہ لیکن ابلیس کے ذہن میں کوئی بات ضرور تھی ورنہ وہ خدا کی حکم عدولی نہ کرتا، اور وہ جو فرشتوں نے خدا سے کہا تھا کہ انسان زمین پر فساد پھیلائے گا اور قتل و غارت کرے گا وہ بھی کچھ غلط نہ تھا۔

خدا کی باتیں خدا ہی جانے۔ اُس نے انسان کو تخلیق کر کے اسے بڑے ہی کڑے امتحان میں ڈال دیا۔ دنیا کی تمام لذتیں، حُور و سرور اور رنگینیاں شیطان کے حوالے کر کے انسان سے کہا کہ اس سے بچو ورنہ جہنم کی آگ میں جلو گے۔

انسان مٹی کا پُتلا تھا۔ کچھ سمجھا کچھ نہ سمجھ سکا۔ جب سمجھنے اور نہ سمجھنے کے درمیان ایک مہیب خلاء میں بھٹکنے لگا تو شیطان نے اُس کا ہاتھ تھام لیا۔

"آ میرے عزیز!" — شیطان نے اُسے ورغلایا — "اللہ تجھے جہنم کی آگ میں جلائے گا، آ میں تجھے ابھی جنت میں لئے چلتا ہوں"

ابلیس نے انسان کو ایک راستے پر ڈال دیا اور کہا کہ چلتے جاؤ، آگے جنت آجائے گی۔

انسان ابھی تک اُس راستے پر چلا جا رہا ہے۔ کہیں دوراہا یا چوراہا آجاتا ہے تو جدھر کو مُنہ آتا ہے اُدھر مُڑ جاتا ہے۔ کہیں اُسے جنت کی جھلک مل جاتی ہے تو وہ اس پر مطمئن نہیں ہوتا اور آگے ہی آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ خدا نے اُسے اس راہ سے ہٹانے کے لئے پیغمبر بھیجے کتابیں

اتاریں لیکن انسان اُسی راہ پہ چلتا چلا گیا جو اُس کا خیال تھا کہ جنت میں جا ختم ہوتی ہے۔ بعض پیغمبروں کو بھی اُس نے کہا کہ آؤ میرے ساتھ۔

انسان نے فرشتوں کی وہ بات سچ کر دکھائی جو انہوں نے خدا سے کہی تھی کہ جسے تیری ذاتِ باری نے اپنا خلیفہ بنایا اور اپنی خدائی کا عکس کہا ہے، وہ تیرا نافرمان ہوگا۔

خدا نے پھر بھی کہا ——"جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے"۔

انسان کچھ نہ جانتے ہُوئے بھی کہتا ہے کہ میں سب کچھ جانتا ہوں۔ وہ کون سا طریقہ ہے جو انسان نے جنتِ ارضی کے حصول کے لئے اختیار نہیں کیا۔ اُس نے اپنے بھائیوں کا خون بہایا۔ ایک دوسرے کے بچوں کو زندہ جلایا۔ ایک طرف کالا علم تخلیق کر کے اپنی نوع کی بربادی کے سامان کئے۔ دوسری طرف کرۂ ارض کو فنا کر دینے کے لئے وہ بارود بنایا جس کی طاقت سُورج سے ہزاروں گُنا زیادہ ہے۔ وہ کون سا جرم تھا، وہ کون سا گناہ تھا جو انسان نے تخلیق نہ کیا۔ لذّت پرستی کو انسان نے اپنا مذہب سمجھا۔ اُس نے عورت میں، شراب میں، دولت میں جنّت کی خوشبو سونگھنے کی کوشش کی۔

خدا دیکھتا رہا۔ ابلیس ہنستا رہا۔

انسان نے ایک کمال یہ حاصل کیا کہ اپنے گناہ دوسروں کے چہروں پر ملنے کے فن کا اُستاد بن گیا، لیکن اُس کی بے بسی کا یہ عالم کہ اُس نے پیروں فقیروں، درویشوں، رشیوں اور سادھو مہنتوں کا سہارا حاصل کیا اور جنّات اور شر شرارے سے خوفزدہ رہنے لگا۔ اُس پر کوئی اُفتاد آپڑی تو اُس نے یہ ماننے کی بجائے کہ یہ اُس کے اپنے گناہوں کا نتیجہ ہو سکتا ہے، کہا کہ یہ جنّات کی کارستانی ہے۔

❖

نسیمہ کے گھر میں جب پہلا پتھر گرا تو کسی نے کہا کہ یہ جنّات نے پھینکا ہے۔

جنّات نے گھر میں اپنی موجودگی کا احساس دلا بھی دیا۔ وہ اس طرح کہ نسیمہ کا سونیلا بیٹا جس کی عمر گیارہ بارہ سال تھی صحن میں کھیلتے کھیلتے تیورا کر گرا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں مُڑنے لگے۔ اُس کا سارا جسم بڑی زور زور سے کانپ رہا تھا۔ نسیمہ گھر میں اکیلی تھی۔ وہ سمجھی کہ بچّے کو پتھر لگا ہے جو معلوم نہیں کس نے باہر سے پھینکا تھا، لیکن پتھر تو دور گرا تھا۔

نسیمہ بچّے کو اُٹھانے لگی تو ایک دھماکے نے اُسے چونکا دیا۔ یہ ایک اور پتھر تھا جو باہر سے آیا اور ایک گھڑے کو لگا تھا۔ اب نسیمہ ڈری۔ وقت رات کا ہوتا اور وہ یوں اکیلی ہوتی تو وہ خوف سے بے ہوش ہو جاتی۔ یہ دن کا وقت تھا۔ صبح کے ابھی دس ہی بجے تھے۔ بچّے کی حالت ابھی ویسی ہی تھی۔ نسیمہ نے اپنے آپ کو یوں تسلّی دی کہ کوئی شرارتی بچّہ پتھر پھینک رہا ہے۔

وہ اپنے بچّے کو پھر اُٹھانے لگی تو اُسے ایک دبی دبی سی اور عجیب سی آواز آئی اور ایسی بُو جیسے کپڑا جل رہا ہو۔ اُس نے گھوم کر دیکھا۔ تھوڑی دیر پہلے اُس نے صحن میں کپڑے لٹکانے والی تار پر اپنا جو دوپٹہ دھو کر پھیلایا تھا وہ جل رہا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے دوپٹہ جل کر راکھ ہو گیا۔

نسیمہ کی چیخ نکل گئی اور وہ باہر کو اُٹھ دوڑی۔ اُس نے پڑوسیوں کے گھر جا کر خوفزدہ سا واویلا کر دیا۔ اُس کے مُنہ سے پوری بات بھی نہیں نکل رہی تھی۔ پڑوسی یہ سمجھ گئے کہ نسیمہ خوف سے مری جا رہی ہے اور اس کے گھر میں کچھ ہو گیا ہے۔ اس گھر میں دو آدمی اور دو تین عورتیں تھیں۔ وہ سب دوڑتے ہُوئے نسیمہ کے گھر پہنچے۔

دونوں آدمیوں نے بچّے کو اُٹھا لیا۔ اُس کا جسم اکڑا ہُوا بدستور کانپ رہا تھا۔ یہ کوئی دَورہ تھا۔ بچّے کو اُنہوں نے برآمدے میں بچھی ہُوئی چارپائی پر ڈالا۔ باہر سے سنسناتا ہُوا ایک اور پتھر آیا جو اس چارپائی کے نیچے گرا۔ چارپائی کے اردگرد جو گھڑے تھے وہ بدک کر ایک طرف ہو گئے۔ کپڑوں والی تار پر ایک اور پُرانا سا کپڑا پڑا ہُوا تھا۔ اسے آگ لگ گئی۔ پہلے صرف نسیمہ ڈری ہوتی تھی اب دونوں آدمی اور تمام عورتیں اُس سے زیادہ خوفزدہ ہو گئے۔

"نہ بھابی!" ۔۔۔ ایک آدمی نے نسیمہ سے کہا ۔۔۔ "یہ تو کوئی اور ہی معاملہ ہے۔"

"لیکن اس شوکی کو کیا ہو گیا ہے؟" ۔۔۔ نسیمہ نے بے ہوشی میں کانپتے ہوئے بچے کے متعلق پوچھا۔

"جنات کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے بھابی!" ۔۔۔ دوسرے آدمی نے کہا ۔۔۔ "یہ کوئی نئی بات نہیں۔ میں ایسے دو واقعات دیکھ چکا ہوں۔ یہ بالکل وہی معاملہ ہے۔"

"یہ بھی تو ہو سکتا ہے" ۔۔۔ نسیمہ نے کہا ۔۔۔ "کہ پتھر کوئی اور پھینک رہا ہو اور شوکی کو کچھ اور ہو گیا ہو۔"

"پھر یہ کپڑے کس نے جلائے ہیں؟" ۔۔۔ ایک پڑوسن نے پوچھا اور مشورہ دیا ۔۔۔ "یوں کرو، صوفی صاحب مسجد میں ہوں گے یا گھر میں۔ انہیں بلا لو۔"

"ڈاکٹر کو نہ بلاؤں؟" ۔۔۔ نسیمہ نے پوچھا ۔۔۔ "وہ بچے کو تو دیکھ لے .... ڈاکٹر کو نہ بلایا تو اس کا باپ آ کر میری جان کھائے گا۔ کہے گا تو آخر سوتیلی ہی نکلی۔"

"کیا ڈاکٹر کو بھی پتھر پڑوائے گی تو؟" ۔۔۔ پڑوسن نے دبدبے سے کہا اور اپنے خاوند سے جو اس کے ساتھ ہی آیا تھا، کہنے لگی ۔۔۔ "تم صوفی صاحب کے پاس چلے جاؤ۔ اس بے چاری کے تو اوسان خطا ہو گئے ہیں۔"

◆

صوفی کے آنے تک بچہ نارمل حالت میں آ چکا تھا اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہر کسی کو دیکھتا تھا۔ اس سے پوچھتے تھے کہ اسے کیا ہو گیا تھا لیکن وہ ہر کسی کو ڈری ہوئی سوالیہ نگاہوں سے دیکھتا تھا جیسے یہی سوال وہ ان سے پوچھ رہا ہو۔ پتھر آنے بند ہو گئے تھے اور صوفی بچے کی چارپائی پر بیٹھ کر اس کے سر کو دونوں ہاتھوں میں پکڑ کے اس کی آنکھوں میں جھانک رہا تھا۔

"بتاؤ نا بیٹا!" ۔۔۔ صوفی نے پیار سے شوکت سے پوچھا ۔۔۔ "تمہیں کیا ہوا تھا؟.... بولو شوکی، بولو۔"

بچے نے رونا شروع کر دیا اور نسیمہ کی طرف دیکھنے لگا۔ نسیمہ نے اتنا بھی نہ کیا کہ آگے بڑھ کر اسے اپنے ساتھ لگا لیتی یا اس کے سر پہ ہاتھ ہی رکھ لیتی۔ صوفی کے پوچھنے پر نسیمہ نے اس طرح بیان دیا جس طرح کسی جرم کا عینی شاہد تھانیدار کو بیان دیا کرتا ہے۔ شوکت اتنا ہی بتا سکا کہ وہ صحن میں اکیلا ہی کانچ کی گولیوں سے کھیل رہا تھا۔ اسے کچھ پتہ نہیں چلا کہ کیا ہوا۔ ہوش میں آیا تو اس نے ان سب لوگوں کو اپنے اردگرد کھڑے دیکھا اور وہ ڈرنے لگا۔

صوفی اٹھا اور سارے گھر میں اس طرح آہستہ آہستہ گھومنے پھرنے لگا کہ کبھی چھتوں کی طرف دیکھتا، کبھی دیواروں پہ آہستہ آہستہ ہاتھ مارتا اور کبھی یوں چلتے چلتے رک کر ذرا پیچھے ہٹ آتا جیسے کوئی اچانک اس کے راستے میں آ گیا ہو۔ اس کا انداز ایسا ہی تھا جیسے کوئی تھانیدار ڈاکوؤں کے ہاتھوں لٹے ہوئے گھر کا معائنہ کرتا ہے۔

"معاملہ کچھ زیادہ ہی گڑبڑ ہے" ۔۔۔ صوفی نے مکان کے معائنے کے بعد ان لوگوں کو جو گھر میں آ گئے تھے، کہا ۔۔۔ "کوئی آدمی میرے ساتھ آؤ۔ میں ایک دھونی دوں گا جو اس گھر میں جلانی ہے اور بچے کے لئے تعویذ بھی دوں گا۔"

صوفی چلا گیا۔ ایک پڑوسی بھی اس کے ساتھ گیا لیکن گھر پر جو خوف و ہراس چھا گیا تھا وہ گھر میں ہی رہا۔ تین عورتیں بھی نسیمہ کے پاس بیٹھ گئیں۔ ایک عورت کے کہنے پر نسیمہ نے بچے کو دودھ گرم کر کے دیا۔ ان عورتوں نے نسیمہ کی حوصلہ افزائی اور دلجوئی کرنے کی بجائے اسے جنوں بھوتوں کی خوفناک اور سنسنی خیز کہانیاں سنانی شروع کر دیں۔ ہر کہانی کی تان، ایک پیر یا کسی عامل کے نام پہ آ کر ٹوٹتی تھی۔

"بچّے نے پرنالے کے نیچے پیشاب کیا ہوگا" ـــ ایک عورت نے پوچھا۔

"بچے ہیں کچھ سمجھتے نہیں"۔ دوسری بولی ـــ "قبرستان قریب ہی ہے۔ وہاں قبروں پر ناچتے کودتے رہتے ہیں۔ کسی بزرگ کی قبر کی بےحرمتی کر آیا ہوگا۔"

"اللہ جھوٹ نہ بلوائے"۔ تیسری نے کہا ـــ "اللہ بچے کو بُری نظر سے بچائے۔ یہ بہت خوبصورت بچّہ ہے۔ ایسے بچے پر تو پریاں بھی عاشق ہو جاتی ہیں۔"

"اری، وہ نہیں سُنا تھا تم نے؟" ـــ ایک عورت نے اُسے ہاتھ سے ہلکا سا دھکا دے کر کہا ـــ "وہ تھا نا ہندوؤں کا بیٹا، کتنا خوبصورت تھا۔ اُس پر ایک چڑیل عاشق ہوگئی تھی۔ رات بچّہ ماں کے پاس سوتا تھا۔ ماں کو پتہ ہی نہیں لگتا تھا اور بچے کو چڑیل اُٹھالے جاتی تھی اور خود ہی چھوڑ جاتی تھی۔ جب وہ جوان ہُوا اور اُس کی شادی ہوئی تو اگلے ہی روز اُس کی دلہن کو شوکی کی طرح دورہ پڑا اور وہ مرگئی۔"

"میں مرجاؤں گا امی؟" ـــ شوکت نے رندھی ہوئی خوفزدہ آواز میں پوچھا۔

"تم نہیں مروگے"۔ ـــ نسیمہ نے ایسے لہجے میں کہا جس میں پیار کی ذراسی بھی جھلک نہیں تھی۔

"نہ نسیمہ!" ـــ ایک عورت نے اُس کے کان میں کہا ـــ "بچّہ ڈرا ہُوا ہے۔ اس طرح غصّے سے بات نہ کرو۔"

نسیمہ خود ڈری ہوئی تھی۔ اُس وقت خود اُسے ہمدردی اور شفقت کی ضرورت تھی، لیکن جو عورتیں اُس کی دلجوئی کے لئے اُس کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں وہ اُسے ایک سے ایک بڑھ کر سنسنی خیز کہانی سنارہی تھیں۔ ان کہانیوں کا بچے پر جو اثر ہو رہا تھا وہ نہ نسیمہ دیکھ رہی تھی نہ یہ عورتیں۔ شوکت اگر نسیمہ کا اپنا بیٹا ہوتا تو وہ اُسے سینے سے لگالیتی اور اُسے جنوں بھوتوں سے بچانے کے لئے اپنی جان پیش کر دیتی لیکن وہ اُس کا سوتیلا بیٹا تھا۔ اُس کے خاوند عمر حیات کی پہلی بیوی شوکت کو اپنے خاوند کے حوالے کر کے اس دنیا سے اُٹھ گئی تھی، عمر حیات نے فیصلہ کر لیا تھا کہ بچے کو وہ سوتیلی ماں کے رحم وکرم پر نہیں رہنے دے گا۔ اس کے لئے اُس نے اپنے جذبات اور اپنی جوانی قربان کر دی تھی، لیکن نسیمہ اس طرح اُس کے راستے میں آگئی کہ اسے وہ نظر انداز نہ کر سکا۔ اُس وقت عمر حیات کی عمر چونتیس سال سے تجاوز کر رہی تھی اور نسیمہ کی عمر چوبیس سال تھی نسیمہ کو عمر حیات اچھا لگنے لگا۔

عمر حیات کی پہلی بیوی غیر معمولی طور پر حسین عورت تھی۔ عمر حیات کو اب ایسی بیوی نہیں مل سکتی تھی لیکن نسیمہ نے عمر حیات پر کچھ ایسا جادو چلایا کہ اس لڑکی کو وہ قبول کرنے پر تیار ہو گیا۔ نسیمہ عمر حیات کی پہلی بیوی جتنی خوبصورت تو نہیں تھی لیکن کسی اور سے وہ کم نہیں تھی۔ اگر اُس میں کوئی کمی رہ گئی تھی تو اسے وہ شوخیوں، ناز و انداز اور مسکراتی آنکھوں کی چمک سے پورا کر لیا کرتی تھی۔ عمر حیات میں بھی مردانہ حُسن تھا لیکن اس میں سب سے بڑی جاذبیت یہ تھی کہ وہ صاحبِ جائیداد تھا اور اُس کی آمدنی خاصی زیادہ تھی۔ وہ بیک وقت کئی کام کرتا تھا۔ اُس نے قصبے میں ایک دفتر بنا رکھا تھا۔ تین چار بڑی کمپنیوں کی سول ایجنسیاں اُس کے پاس تھیں۔

نسیمہ کی اُس وقت تک شادی ہو جانی چاہیئے تھی لیکن اتنی حسین اور اتنے پرکشش قد کاٹھ والی لڑکی کے رشتے کا کوئی پیغام آتا ہی نہیں تھا۔ ایک دو پیغام آئے بھی تو وہ نسیمہ نے خود یا اُس کی ماں نے ٹھکرا دیئے کیونکہ وہ ان کی حیثیت سے کم درجے کے لوگ تھے۔ جن گھروں پر ماں بیٹی کی نظر تھی وہ اس لئے رشتے کے لئے نہیں آتے تھے کہ نسیمہ کے چال چلن کو وہ مشکوک سمجھتے تھے۔

نسیمہ نے ماں کی حوصلہ افزائی سے ہمّت کی اور عمر حیات سے راہ ورسم پیدا کر لی۔ نسیمہ کا باپ اللہ لوک تھا۔ نوکری سے ریٹائر ہو کر وہ مسجد کی

خدمت میں لگ گیا۔ اس کے دونوں بھائیوں نے اسے اپنے کاروبار میں لگانے کی کوشش کی تھی لیکن وہ کہتا تھا کہ وہ باقی عمر یادِ الٰہی میں اور اللہ کے گھر کی خدمت میں گزارے گا۔ اُس کی ان سرگرمیوں کو دیکھتے ہوتے گھر میں کرتا دھرتا اُس کی بیوی تھی۔ نسیمہ کے دو بھائی تھے۔ ایک تو شادی کر کے ماں باپ سے ایسا الگ ہُوا تھا کہ اُن سے قطع تعلق کر گیا تھا۔ دوسرا دِلّی میں مرکزی حکومت کی ملازمت میں تھا۔

نسیمہ نے عمر حیات کو اپنی محبت کے دام میں ایسا پھانسا کہ وہ جو کہتا تھا کہ اپنے اکلوتے بیٹے کو سوتیلی ماں کے رحم وکرم پر نہیں پھینکے گا، نسیمہ کا ہو کے رہ گیا۔ نسیمہ کی اس کاوش میں جسے وہ والہانہ محبت کہتی تھی، اُس کی ماں کا خاص طور پہ ہاتھ تھا۔

عمر حیات کے قریبی رشتہ دار موجود تھے لیکن وہ روپے پیسے والا تھا۔ اُس نے کسی سے مشورہ لینا اپنی توہین سمجھا تھا۔ اُس نے نسیمہ کے ساتھ شادی کا دن مقرر کر کے اپنے عزیزوں کو اطلاع دی۔ شادی پر کوئی آیا کوئی نہ آیا۔ شادی ہو گئی — اور شادی کے چوتھے ہی مہینے عمر حیات کے بیٹے کو یہ دورہ پڑا، پتھر برسے اور دو کپڑے اپنے آپ ہی جل گئے۔

❖

صوفی کے ہاں سے ابھی کچھ بھی نہیں آیا تھا۔ نسیمہ عورتوں میں سے اُٹھ کر باورچی خانے میں گئی۔

"مجھے تو یہ کالا جادو لگتا ہے" — ایک عورت نے دوسری کے کان میں سرگوشی کی۔

"اِس کی ماں سے بڑھ کر اور جادوگرنی کون ہو گی" — دوسری عورت نے کہا۔

"یہ نسیمہ بھی تو ایک لفنتی ہے" — تیسری عورت بولی۔

نسیمہ باورچی خانے سے نکل آئی۔

"نسیمہ بیٹی!" — بوڑھی پڑوسن نے کہا — "تجھ جیسی شریف لڑکی

کو اس مصیبت میں دیکھ کر میرا تو دل پھٹ رہا ہے۔"

دوسری دونوں عورتوں نے بھی بڑے خوبصورت الفاظ میں ثابت کر دیا کہ نسیمہ اور اُس کی ماں سے بڑھ کر اس سارے شہر میں کوئی اور شریف اور بھلی عورت نہیں۔

"مشکل تو یہ ہے کہ میں اکیلی ہوں" — نسیمہ نے کہا — "شوکی کے ابّا باہر گئے ہوتے ہیں۔ وہ شام کی گاڑی سے واپس آئیں گے" — یہ کہہ کر وہ شوکت کے پاس بیٹھ گئی اور اُسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

ایسا کم ہی ہوتا تھا کہ اُس نے اس بچّے کو کبھی اپنے ساتھ لگایا ہو۔ عمر حیات نے شادی کا دن مقرر کر کے نسیمہ سے کہا تھا کہ وہ اُس کے بچّے کو اپنا بچّہ سمجھے گی۔ عمر حیات نے یہ بھی کہہ دیا تھا کہ جب بھی اُس نے دیکھا کہ بچّے کو اُس سے پیار نہیں مل رہا تو وہ اسے طلاق دے دے گا، لیکن عمر حیات نے ان تین چار مہینوں میں کبھی دیکھنے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی کہ بچّے کو پیار مل رہا ہے یا نہیں۔ نسیمہ عمر حیات کو گھر میں دیکھ کر بچّے کے ساتھ پیار کی دو باتیں کر لیا کرتی تھی۔ اُس نے بچّے کو کبھی مارا پیٹا نہیں تھا لیکن اُس نے بچّے کی ماں کی جگہ پُر کرنے کی ذرا سی بھی کوشش نہیں کی تھی۔

وہ آدمی واپس آ گیا جسے صوفی اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ اُس کے پاس لوبان کی بتّی تھی جو اُس نے نسیمہ کو دے کر کہا کہ یہ گھر کے بڑے کمرے میں کہیں جلا کر رکھ دے۔ اُس نے نسیمہ کو ایک تعویذ بھی دیا جسے کورے کپڑے میں باندھ کر باہر کے دروازے کے ساتھ لٹکانا تھا۔

"صوفی صاحب کچھ اور بھی کر رہے ہیں" — اُس آدمی نے نسیمہ سے کہا — "اُنھوں نے سوا روپیہ اور آدھ سیر چینی منگوائی ہے۔"

نسیمہ نے سوا روپیہ اور اندازے سے آدھ سیر چینی کپڑے میں باندھ کر اُس آدمی کے حوالے کر دی۔

❖

ان عورتوں کے باہر نکلنے کی دیر تھی کہ سارے قصبے میں یہ خبر پھیل گئی کہ ملک عمر حیات کے گھر میں پتھر پڑے ہیں اور دو تین کپڑے اپنے آپ جل گئے ہیں۔ یہ خبر جب شہر کے آخری کونے تک جا کر واپس آئی تو اس طرح تھی کہ ملک عمر حیات کے گھر پتھروں کی بارش ہوتی ہے اور ان کے سارے کپڑے جل گئے ہیں۔ ٹرنکوں میں پڑے ہوئے کپڑوں کو آگ لگی جو محلّے والوں نے بڑی مشکل سے بجھائی۔ خبر میں یہ بھی تھا کہ گھر سے ایسی آوازیں آئیں کہ یہ گھر خالی کر دو ورنہ ہم سارے گھر کو آگ لگا دیں گے۔ اس خبر نے عمر حیات کے محلّے میں رونق پیدا کر دی۔ اندر تو کوئی جا نہیں سکتا تھا حالانکہ نسیمہ پردہ نہیں کرتی تھی۔ لوگ سارا دن اس محلّے میں آکر عمر حیات کے مکان کو دیکھتے رہے۔ شام تک بے شمار کہانیاں تخلیق ہو چکی تھیں۔

شام کی ریل گاڑی سے عمر حیات اُترا تو سٹیشن سے نکلتے ہی ایک آدمی نے اُسے خبر سنائی کہ اُس کے گھر پر جنّوں نے حملہ کیا ہے۔ اُسے جو تانگہ قریب کھڑا نظر آیا وہ اُسی پر چڑھ بیٹھا اور تانگے والے سے کہا کہ جس قدر تیز گھوڑا دوڑا سکتے ہو، دوڑاؤ اور مجھے گھر پہنچاؤ۔

"ملک صاحب!" تانگے والے نے گھوڑے کو چھانٹا مارتے ہُوئے کہا ——"سنا ہے آپ کے گھر میں جنّات کی کوئی واردات ہوئی ہے؟"

"ہاں بھائی!" عمر حیات نے کہا ——"ابھی ابھی مجھے ایک آدمی نے بتایا ہے اسی لئے تمہیں کہا ہے کہ مجھے بہت جلدی گھر پہنچاؤ۔"

"ملک صاحب!" تانگے والے نے لگام کو زور سے جھٹکا دے کر کہا ——"آپ علم تعلیم والے لوگ ہیں۔ ہم تو جاہل اور گنوار ہیں۔ جو آپ سمجھ سکتے ہیں وہاں تک ہم چرسیوں کا دماغ کہاں پہنچ سکتا ہے۔ پھر بھی منہ آئی بات کہوں گا ضرور.... آپ نے لاکھ کتابیں پڑھی ہوں لیکن جو ہم جانتے ہیں وہ آپ نہیں جانتے۔ جنّ چڑیلیں ہوتی ہوں گی۔ سُنا ہے قرآن مجید میں بھی آیا ہے کہ جنّات کی بھی ایک مخلوق ہے جو انسانوں کو نظر نہیں آتی لیکن ملک صاحب! ایک مخلوق اور بھی ہے جو آپ کو اور آپ جیسوں

کو نظر نہیں آتی۔ اُسے مجھ جیسے چرسی اور افیمی دیکھ سکتے ہیں.... آپ بُرا نہ مانیں تو کہوں۔ ایک تو جنّات نے آپ کے گھر پر حملہ کیا ہے۔ اب دوسرا حملہ وہ لوگ کریں گے جو کہتے ہیں کہ اُن کے قبضے میں جنّات ہیں کہیں اُن کے چکر میں نہ پڑ جانا۔ ذرا خود بھی غور کر لینا۔ انسان کے ساتھ شیطان بھی لگا ہُوا ہے۔"

گھوڑے کی رفتار کے ساتھ تانگے والے کی زبان بھی تیزی سے چل رہی تھی، لیکن عمر حیات پر ایسی گھبراہٹ طاری تھی کہ وہ بے خیالی سی میں ہوں ہاں کرتا جا رہا تھا۔ گھر دُور نہیں تھا۔ تانگہ محلّے میں جہاں تک جا سکتا تھا وہاں رُکا۔ عمر حیات کے ہاتھ میں جتنے پیسے آئے وہ تانگے کی اگلی سیٹ پر پھینک کر تانگے سے اُترا اور گھر کو دوڑ پڑا۔

گھر میں نسیمہ کے پاس چند ایک عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ بچّہ ان عورتوں سے الگ پلنگ پر لیٹا ہُوا تھا۔ جونہی عمر حیات اندر کمرے میں داخل ہُوا نسیمہ اُٹھی اور لپک کر شوکت کو اُٹھا لیا، لیکن شوکت اپنے باپ کو دیکھ کر رو پڑا اور اُس کی طرف لپکنے لگا۔ عمر حیات سُن آیا تھا کہ بچّے کو بھی کوئی دَورہ پڑا تھا ورنہ شوکت اُس عمر سے چند سال اُوپر چلا گیا تھا جس میں ماں باپ بچّے کو اُٹھائے اُٹھائے پھرتے ہیں۔ نسیمہ نے ڈری اور گھبرائی ہوئی آواز میں عمر حیات کو بتایا کہ پتھر کس طرح آتے، کپڑوں کو آگ کس طرح لگی اور شوکت کو کس قسم کا دورہ پڑا۔ کچھ لقمے عورتوں نے دیتے۔ عورتوں نے بار بار کہا کہ یہ جنّات کا کام ہے۔

نسیمہ ایک بار پھر شوکت کو اُٹھانے کے لئے آگے بڑھی لیکن شوکت جسے باپ نے اُٹھا رکھا تھا پیٹھ پھیر کر باپ کے ساتھ لپٹ گیا۔ دن کو وہ نسیمہ کے سامنے اتنا نہیں رویا تھا جتنا باپ کے ساتھ لپٹ کر رویا۔

"شوکی کا جو حال ہُوا وہ میں برداشت نہیں کر سکتی" —— نسیمہ نے کہا ——"اس سے اچھا تھا کہ میری جان چلی جاتی۔ میں نے تو سارا دن اسے اپنے سینے سے لگائے رکھا ہے۔"

"نہیں ابّو!" — شوکت نے کہا — "امی جھوٹ بولتی ہے۔ اس نے تو مجھے ایک بار بھی پیار نہیں کیا۔"

"ہائے خدایا!" — نسیمہ نے دونوں ہاتھ دھماکے سے جوڑے اور ہاتھ ملتے ہوئے بولی — "یہ سُن لو۔ اپنا خون پلا دوں تو بھی سوتیلی کی سوتیلی ہی رہوں گی۔"

عورتوں نے ایک دوسری کی طرف دیکھا۔ کوئی مسکرائی۔ کسی نے اپنے کانوں پر ہاتھ رکھے اور کوئی نسیمہ کے مُنہ کی طرف دیکھنے لگی۔ عمر حیات نے جیسے سُنا ہی نہ ہو کہ نسیمہ نے کیا کہا تھا۔ وہ گہری سوچ میں کھو گیا اور بچے کو اٹھاتے ہوتے دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ کچھ وقت بعد عورتیں چلی گئیں تو نسیمہ عمر حیات کے پاس آئی۔ اتنی دیر میں بچہ سو گیا تھا۔ عمر حیات نے اُسے پلنگ پر لٹا دیا۔

"ہمیں کیا کرنا چاہیئے؟" — نسیمہ نے عمر حیات سے پوچھا — "کیا ایسی آفت پھر بھی آئے گی؟"

"نسیمہ!" — عمر حیات نے آہستگی سے کہا — "اس آفت کے متعلق بھی سوچ لیں گے لیکن میں تمہیں وہ شرط یاد دلانا چاہتا ہوں جو میں نے شادی سے پہلے تمہارے آگے رکھی تھی.... میں کہتا ہوں یہ پورا گھر جل جائے لیکن میرے بچے کو آنچ نہ آئے۔ اس نے اتنی عورتوں کے سامنے تمہیں کہا ہے کہ تم نے اسے ہاتھ تک نہیں لگایا۔ میں سمجھ سکتا ہوں کہ دَورے کے بعد اس کی ذہنی حالت کیا ہوتی ہوگی۔"

"آپ نے ایک بچے کی بات پر اعتبار کر لیا" — نسیمہ نے اپنے انداز میں کہا — "آپ نے محسوس نہیں کیا کہ بچے کے ذہن پر ابھی تک دَورے کا اثر ہے۔ اسے ابھی تک پوری طرح معلوم نہیں ہوا کہ اسے کیا ہوا تھا.... میں قسم کھا کر کہتی ہوں کہ شوکی کو اگر میں مر کر بچا سکتی ہوں تو میں مرنے کے لئے تیار ہوں.... لیکن اس وقت خدا کے لئے میرے ساتھ اس طرح کی باتیں نہ کریں۔ میرا دل ڈوب رہا ہے۔ مجھے آپ کے سہارے

کی ضرورت ہے۔ میں نے تو رو رو کر دن گزارا ہے" — اُس کے آنسو بہہ نکلے۔ عمر حیات نے اُسے بازو سے پکڑا اور اپنے پاس بٹھا لیا۔

"کچھ آپ کو سمجھ آتی ہے؟" — نسیمہ نے عمر حیات سے پوچھا — "یہ کیا تھا؟... اگر پھر ایسے ہُوا تو میں ڈر سے مر جاؤں گی یا اس گھر سے بھاگ جاؤں گی۔"

"دو ہی باتیں ہیں" — عمر حیات نے کہا — "کسی نے ہم پر یہ کالا علم کرایا ہے یا یہ جنّات کا حملہ ہے۔ کالا عمل دشمن کرایا کرتے ہیں لیکن میرے ساتھ کسی کی کیا دشمنی! میں دوست بنایا کرتا ہوں۔ آج تک کسی کو دشمن نہیں بنایا، اور اگر یہ جنّات ہیں تو پھر اس علم کے کسی عامل کو بلائیں گے۔ پہلے تو یہ دیکھیں گے کہ ایسا دوبارہ ہوتا ہے یا نہیں۔"

دو دنوں کے بعد دن کے دو بجے پھر ایسے ہی ہُوا۔ شوکت سکول سے آیا اور کھانا کھا کر اُٹھا ہی تھا کہ گر پڑا۔ اُس کی حالت ویسی ہی ہوگئی جیسی دو دن پہلے ہوئی تھی۔ یہ بظاہر تشنج یا مرگی کا دورہ لگتا تھا۔ اُس کے ہاتھ اور پاؤں مُڑ گئے۔ جسم زور زور سے کانپنے لگا اور اُس کے مُنہ سے ہلکے ہلکے خراٹے نکلنے لگے۔ اس کے ساتھ ہی برآمدے میں ایک پتھر گرا جو ٹینس کی گیند جتنا بڑا تھا۔ نسیمہ اتنی ڈری کہ اُس نے باہر جا کے نہ دیکھا اور کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔

دوسرا پتھر دھماکے سے دروازے کو لگا۔ اتنی زور کی آواز آئی کہ نسیمہ سر سے پاؤں تک ہل گئی اور اُس پر غشی کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ اُس میں اتنی سی ہمّت بھی نہیں تھی کہ شوکت کو اُٹھا کر پلنگ پر لٹا دیتی۔ برآمدے اور صحن میں تین چار اور پتھر ایک دوسرے کے بعد گرے۔ نسیمہ نے جل تُو جلال تُو کا ورد شروع کر دیا۔

کمرے میں کہیں سے دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ نسیمہ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُس کا پرس تپائی پر رکھا تھا۔ دُھواں اس میں سے نکل رہا تھا۔ نسیمہ

نے دوڑ کر پرس اُٹھایا۔ کھول کر دیکھا تو اُس میں تمام نوٹ جل چکے تھے۔
یہ پانچ پانچ اور دس دس روپوں کے نوٹ تھے۔ رقم تین سو سے کچھ زیادہ
تھی۔ عجیب بات یہ تھی کہ پرس کو آگ نے ذرا سا بھی نہیں جھلسایا تھا۔

نسیمہ پرس کو دیکھ ہی رہی تھی کہ دوسرے برآمدے میں ایک پتھر
دوسرے پتھر کے گرنے کی آوازیں سنائی دیں۔ نسیمہ اب اکیلی وہاں نہیں
ٹھہر سکتی تھی۔ شوکت کا کانپتا ہوا جسم، اُس کا عجیب طریقے سے مُڑا ہوا چہرہ،
کھُلی ہوئی آنکھیں جو سرخ ہو گئی تھیں اور اُس کے مُڑے ہوئے ہاتھ
نسیمہ کو ڈرا رہے تھے۔ وہ اس طرح اچانک باہر کو دوڑ پڑی جیسے کسی
نے اُسے پیچھے سے دھکا دیا ہو۔

باہر والے دروازے سے نکل کر گلی میں گئی تو اُس کی چیخیں نکل
گئیں۔ گلی میں تین چار آدمی گزر رہے تھے۔ وہ دوڑتے آتے، قریبی
پڑوسی بھی نکل آئے۔

"آج پھر پتھر گر رہے ہیں" ــــ نسیمہ نے خوف سے کانپتی اور روتی
ہوئی آواز میں کہا ــــ "شوکی کو پھر وہی دَورہ پڑ گیا ہے۔"

پانچ چھ آدمی اکٹھے اندر آ گئے۔ وہ صحن میں آئے تو ایک پتھر اُن کے
پاؤں میں گرا۔ کسی کو لگا نہیں۔ وہ اس پتھر کو دیکھ ہی رہے تھے کہ ایک اور
پتھر اُن کے قریب گرا۔ یہ آدمی ڈر کر باہر کو بھاگے۔ دو آدمی باہر جانے
کی بجائے برآمدے میں چلے گئے۔ نسیمہ بھی برآمدے میں تھی۔

"بچّہ اندر فرش پر پڑا تڑپ رہا ہے" ــــ نسیمہ نے اِن دو آدمیوں
سے کہا ــــ "اُسے پلنگ پر ڈال دیں۔"

دونوں آدمی اندر گئے اور شوکت کو اٹھا کر پلنگ پر لٹا دیا۔ وہ
اتنے ڈرے ہوئے تھے کہ کمرے سے باہر نہ نکلے۔ ایک اور پتھر آیا جو
برآمدے میں سے اُچھل کر کمرے میں آ گیا۔

یہ سلسلہ تقریباً پندرہ منٹ جاری رہا۔ شوکت نے انگڑائی لی اور
اُٹھ بیٹھا۔ چند منٹ اور گزر گئے۔ کوئی پتھر نہ آیا۔ اتنے میں عمر حیات آ

گیا۔ اُسے کسی نے اطلاع دے دی تھی۔ دونوں آدمی باہر نکل گئے۔ نسیمہ
رو رہی تھی۔ شوکت بھی رو رہا تھا۔ عمر حیات اُس کے پاس پلنگ پر بیٹھ گیا
اور اُسے اپنی گود میں لٹا لیا۔ نسیمہ اُسے بتا رہی تھی کہ پتھر کس طرح آتے رہے۔

لوگ صوفی کو لے آئے۔

"سب سے پہلے اس گھر میں ختم قرآن ہونا چاہیئے" ــــ صوفی نے کہا
ــــ "میں ابھی لڑکوں کو اکٹھا کر کے لے آتا ہوں۔ سیپارے مسجد سے لیتا
آؤں گا.... کیا دروازے کے ساتھ میرا تعویذ نہیں باندھا تھا؟"

"اُس روز سے وہیں بندھا ہے صوفی صاحب!"

"اور وہ دھونی؟"

"وہ دیکھیں" ــــ نسیمہ نے کہا ــــ "جل رہی ہے۔"

"پھر یہ کیوں آ گئے؟" ــــ صوفی نے پوچھا۔

"اس سوال کا جواب آپ ہی دیں گے صوفی صاحب!" ــــ
عمر حیات نے کہا۔

صوفی نے عمر حیات کی طرف دیکھا۔ اُس کی آنکھیں بے تاثر تھیں۔
اُس کے چہرے پر بھی تاثر نہ تھا۔ اگر کچھ تاثر تھا تو یہ اُس نالائق لڑکے
کا تاثر تھا جسے ماسٹر کے سوال کا جواب یاد نہ ہو لیکن صوفی اُن نالائق لڑکوں
میں سے تھا جنہیں ماسٹر مانیٹر بنا دیا کرتے اور خود حُقّے کا کش لگانے
کے لئے برآمدے میں یا سٹاف روم میں جا بیٹھتے ہیں۔

"اوہ!" ــــ صوفی نے چونک کر کہا ــــ "وقت تھوڑا رہ گیا ہے مغرب
سے پہلے قرآن ختم کرنا ہے۔ آپ لوگ ایک کمرہ خالی کر دیں .... اور
ملک صاحب! میں آپ کو کچھ چیزیں بتاتا ہوں، لکھ لیں اور ختم والے کمرے
میں رکھ دیں۔ میرے ساتھ بارہ چودہ لڑکے ہوں گے۔ ان کے کھانے کا
انتظام کر دیں۔"

"ان بے چاروں کو اتنی ہوش کہاں ہے جی!" ــــ ایک دردمند

محلے دار نے کہا — "آپ صوفی صاحب، مجھے چیزیں لکھوائیں۔ میں ملک صاحب سے پیسے لے کر لے آؤں گا۔ قرآن مجید پڑھنے والوں کے کھانے کا انتظام ملک صاحب کے گھر ہو جائے گا۔"

عمر حیات کی جان پر بنی ہوئی تھی۔ اُس کا چہرہ خوف اور پریشانی سے گھبرایا ہوا تھا۔ اُس نے جیب سے بہت سے نوٹ نکال کر اُس دردمند محلے دار کو دے دیئے اور کہا کہ کم پڑ جائیں تو اُس سے اور لے لے۔

صوفی بارہ چودہ کمسن لڑکوں کو لے آیا۔ اُن کے پاس سیپارے تھے۔ انہیں جس کمرے میں بٹھایا گیا، اُس کے در و دیوار چند منٹ بعد لرزنے لگے۔ ایسے لگتا تھا جیسے سینکڑوں چمگادڑ اُلٹے لٹکے ہوئے شور و غوغا بپا کئے ہوئے ہوں۔ کچھ دیر بعد وہ چیزیں آگئیں جو ختم قرآن میں رکھنی تھیں۔ ان میں ہر قسم کا فروٹ تھا، مٹھائی تھی اور خشک میوہ بھی تھا۔ جب یہ چیزیں قرآن پڑھنے والوں کے سامنے رکھی گئیں تو چمگادڑوں کی چڑ چڑ کا شور اور زیادہ بلند ہو گیا۔

عمر حیات اُس کمرے میں دیکھنے کے لئے گیا کہ کسی چیز کی کمی نہ رہ گئی ہو۔ اُس نے دیکھا کہ قرآن پڑھنے والے ہر لڑکے کے دائیں ہاتھ کی شہادت کی انگلی بڑی تیزی سے قرآن کی سطروں پر چل رہی تھی۔ اتنی تیز کہ عمر حیات کی نظر بھی انگلی کا تعاقب نہ کر سکتی تھی۔ بعض لڑکوں کی انگلیاں قرآن پر چل رہی تھیں اور اُن کی نظریں کیلوں، امرودوں اور مٹھائی وغیرہ کی ڈھیریوں پر گھوم رہی تھیں۔ اُن کے ہونٹ بڑی تیزی سے ہل رہے تھے اور زبانیں نہ جانے کیسا شور اُگل رہی تھیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد کوئی لڑکا اپنے پاس بیٹھے ہوئے لڑکے کو کہنی مار کر آنکھوں کے اشارے سے اُسے پھل فروٹ کی ڈھیریاں دکھاتا اور دونوں ہنس پڑتے پھر ان کی آواز پہلے سے زیادہ بلند ہو جاتی۔ دو تین لڑکے ایسے بھی تھے جن کی انگلیاں قرآن کی سطروں پر چل رہی تھیں، اُن کی زبانیں

بھی چل رہی تھیں لیکن وہ اِدھر اُدھر دیکھ رہے تھے۔

اور صوفی استغراق کے عالم میں تھا۔

ابھی ایک ہی گھنٹہ گزرا تھا کہ قرآن ختم ہو گیا۔ اس اعلان پر عمر حیات ختم قرآن کے کمرے میں گیا۔

"ملک صاحب!" — صوفی نے کہا — "قرآن ختم ہو گیا ہے۔"

"وہ تو میں نے پہلے ہی دیکھ لیا تھا کہ قرآن ختم ہو گیا ہے" — عمر حیات نے دل ہی دل میں کہا — "ان پیشہ ور لڑکوں کو صوفیوں، مولویوں اور اماموں نے ختم قرآن کی یہ ٹریننگ دے کر جس کا مظاہرہ میں نے دیکھا ہے، قرآن کی فضیلت اور برکت ختم کر دی ہے، ورنہ اللہ کے اس مقدس کلام کے سامنے کون سا جن اور کون سا شر شرارہ ٹھہر سکتا تھا۔"

"نہیں عمر حیات!" — اُسے اپنی آواز سنائی دی — "قرآن کو کون ختم کر سکتا ہے۔ یہ تو قیامت کے بعد بھی زندہ رہنے والی کتاب ہے۔ اس کی تلاوت جنات کو بھی مسحور کر لیا کرتی ہے۔ یوں کہو کہ ان لوگوں کا ایمان ختم ہو گیا ہے۔"

اگر اس مکان میں جنات ہی آتے تھے تو وہ یہاں اپنے پھینکے ہوئے پتھر تو چھوڑ گئے مگر صوفی اور اُس کے شاگرد کچھ بھی نہ چھوڑ گئے۔ انہوں نے جن ڈونگوں اور پلیٹوں میں کھانا کھایا تھا، انہیں تو جیسے وہ دھو گئے۔ عمر حیات، نسیمہ اور شوکت کے لئے نہ سالن بچا نہ روٹی۔

"کیا اب اس آفت سے چھٹکارا مل جائے گا؟" — نسیمہ نے عمر حیات سے پوچھا۔

"اگر صوفی صاحب کے شاگرد اسی طرح آکر قرآن ختم کرتے رہے تو اس سارے محلے میں کوئی جن، چڑیل اور بھوت نہیں ٹھہرے گا" — عمر حیات نے کہا — "اللہ سے مدد مانگو نسیمہ! صبح اُٹھ کر تلاوتِ قرآن ضرور کیا کرو۔"

نسیمہ کی ماں اور اُس کا باپ بھی آگیا تھا۔ باپ تو تسبیح پر کوئی وظیفہ

کر رہا تھا، کسی کے ساتھ بات ہی نہیں کرتا تھا اور ماں بھی کہ کسی کی سُنتی ہی نہیں تھی۔

"میں جانتی ہوں" — اُس نے آتے ہی کہا تھا — "مجھے معلوم ہے یہ کون کرا رہا ہے۔ تم کراتے رہو ختم قرآن۔ کچھ نہیں ہوگا.... گھبرا نہ نسیمہ! صبح ہو لینے دے۔ میں مستانے نقشبندی کے پاس جاؤں گی۔ وہ یہاں آ کر ایک منٹ میں بتا دے گا یہ کیا ہے۔ اگر کسی نے کچھ کرایا ہے تو اُس کا نام اور ساری نشانیاں بتا دے گا۔"

"میری عقل میں تو ایک اور بات آتی ہے بہن!" — نسیمہ کی ایک بوڑھی پڑوسن نے کہا — "مجھے اس لڑکے پر شک ہے .... شوکی پر.... یہ اسی کی نحوست ہے۔ اتنا خوبصورت لڑکا.... اتنا خوبصورت!.... یا تو اس پر کوئی چڑیل عاشق ہوگئی ہے یا اس کی ماں کی بدرُوح آتی ہے۔ وہ نسیمہ کو بھٹر مارتی ہے۔ اس کے کپڑے اور نوٹ جلاتی ہے اور اپنے بچّے سے پیار کرتی ہے۔"

"ہاں نسیمہ!" — ماں نے اُسے کہا — "اِسے جھوٹ نہ سمجھنا.... بُوا ٹھیک کہہ رہی ہے۔ اس شوکی کو چلتا کرو۔"

"اس کا باپ مجھے اُسی روز طلاق دے دے گا" — نسیمہ نے کہا — "وہ تو اُسے گرم سرد ہوا بھی نہیں لگنے دیتا۔"

"کچھ کرنا پڑے گا" — نسیمہ کی ماں نے اپنے آپ سے باتیں کرنے کے لہجے میں کہا — "کچھ کرنا پڑے گا" — وہ چونک پڑی اور نسیمہ کی بوڑھی پڑوسن کے کان میں کہا — "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس بدرُوح کی بددعا سے میری بیٹی کی اولاد ہی نہ ہو۔"

"ہاں ہاں!" — بوڑھی پڑوسن نے وثوق سے کہا — "ایسا ہو سکتا ہے اور ہوگا بھی یہی.... وہ نہیں تھی تلے زری والوں کی بیٹی؟.... اُس کے ساتھ ایسے ہُوا تھا نا" — اور پڑوسن نے ایک پُراسرار اور سنسنی خیز داستان سنا ڈالی۔

نسیمہ کی ماں یوں گہری سوچ میں کھو گئی جیسے عمر حیات کی جائیداد اور دولت کا حساب لگا رہی ہو جو نسیمہ کا کوئی بچّہ پیدا نہ ہونے کی صورت میں شوکت کو ورثے میں ملے گی۔

شوکت اپنے باپ کے پاس بیٹھا تھا۔ نسیمہ کی ماں اُسے بہت دیر گھُورتی رہی۔

ایک دن اور گزرا تو اگلے روز نسیمہ کی ماں مستانے نقشبندی کو نسیمہ کے گھر لے آئی۔ مستانہ ادھیڑ عمر آدمی تھا۔ اُس کے سَر کے بال اتنے لمبے تھے کہ اُس کے کندھوں سے بھی نیچے آجاتے تھے۔ اُس کی داڑھی دو انچ لمبی تھی اور سلیقے سے تراشی ہوئی۔ مونچھوں کو تاؤ دیا ہُوا تھا۔ اُس کے سر پہ پھُندنے والی لال ترکی ٹوپی تھی جس کے اِرد گرد اُس نے پگڑی لپیٹ رکھی تھی۔ اُس نے کُرتہ جو پہن رکھا تھا، وہ اُس کے گلے سے ٹخنوں تک گیا ہُوا تھا اور اُس کا رنگ گہرا سبز تھا۔

اس قصبے میں آئے اُسے سولہ سترہ سال گزر گئے تھے۔ قبرستان کے ساتھ ہی اُس کا کچّا مکان تھا جس کے اِرد گرد کوئی آبادی نہیں تھی۔ ایک طرف کھیت تھے، دوسری طرف بارشوں کے پانی کا قدرتی جوہڑ تھا جس میں ساری رات مینڈک ٹرّاتے رہتے تھے، تیسری طرف قبرستان اور چوتھی طرف کھڈنالوں والی ویران زمین تھی۔ رات کو اُس کے مکان کے قریب سے کوئی نہیں گزرتا تھا۔ کہتے تھے کہ رات کو مستانہ نقشبندی جنّات اور چڑیلوں کو حاضر کر کے ان سے رقص کرواتا ہے۔ رات کو کبھی کبھی اُس کے مکان سے "حق اللہ ہُو اور الا اللہ ہُو" کے دھماکے سنائی دیتے تھے۔

قبرستان کے تکیے کے ملنگ اور سائیں اُس کے مرید تھے۔ وہ جہاں بیٹھتے وہاں لوگوں کو مستانے کے جنّات کی کوئی نئی کہانی سُناتے تھے۔ اُس کے متعلق مشہور تھا کہ وہ انگریزوں کی فوج میں نائک ہُوا کرتا تھا۔ وہ رسالے میں تھا اور مانا ہُوا شہسوار تھا۔ اُس کا رسالہ صوبہ سرحد کے قبائلی

علاقے میں تھا جہاں انگریزوں اور قبائلی پٹھانوں کی لڑائیاں زوروں پر تھیں۔

ایک بار ایسے ہُوا کہ اُس کا رسالہ پہاڑیوں کے اندر سے گزر رہا تھا۔ علاقہ بہت خطرناک تھا۔ آگے جاکر رسالے کو تین حصّوں میں تقسیم کر کے مختلف وادیوں میں بھیج دیا گیا۔ مستانہ جس حصّے میں تھا، اُس پر پٹھانوں نے جو پہاڑیوں میں گھات لگائے بیٹھے تھے، فائر کھول دیا۔ پہلی باڑھ میں ہی چند ایک گھوڑے اور سوار زخمی ہو گئے اور یہ سکواڈرن بکھر گیا۔ پیچھے سے ایک پیادہ پلٹن بھی آگئی جس نے پہاڑیوں پر پوزیشنیں لے کر پٹھانوں پر فائرنگ شروع کر دی۔

لڑائی کے دوران مستانے کا گھوڑا بے لگام ہو کر ساتھ والی وادی میں نکل گیا۔ مستانے نے بڑی مشکل سے گھوڑے کو اپنے قابو میں کیا اور اُسے واپس لانے لگا۔ وہ اکیلا تھا اور گھوڑا اُسے دُور لے گیا تھا۔ اُس کا زندہ واپس آجانا مشکوک نظر آتا تھا۔ اُس نے ایک چٹان کے دامن میں ایک سفید ریش معمر پٹھان کو دیکھا وہ بُری طرح زخمی تھا اور بیٹھ گیا تھا

مستانے نے گھوڑا اُس کے قریب روک لیا۔ بوڑھے پٹھان کے پاس توڑے دار رائفل تھی۔ مستانے کو چاہیئے تھا کہ وہ اس پٹھان کو گولی مار دیتا اور اُس کی رائفل لے آتا یا اُسے زندہ ہی گھوڑے پر ڈال کر لے آتا اور اپنے کمانڈنگ آفیسر کے حوالے کر دیتا لیکن اُس نے گھوڑے سے اُتر کر پٹھان کو پانی پلایا اور اُسے گھوڑے پر بٹھا کر اُس سے پوچھا کہ وہ کہاں جانا چاہتا ہے۔ پٹھان نے جہاں کہا مستانہ اُسے وہیں چھوڑ آیا۔ وہاں پہاڑیوں کے اندر اکیلا ایک مکان تھا جہاں اُس کے گھر کی عورتیں اور بچے تھے۔

"جا، میں نے تجھے وہ طاقت دے دی ہے جو مجھے میرے پیر اُستاد نے دی تھی"۔۔۔ بوڑھے پٹھان نے اُسے چمڑے میں سِلا ہُوا ایک تعویذ

دے کر کہا ۔۔۔ "یہ جب بھی ہاتھ میں لے کر حضرت سلیمانؑ کو پکارو گے، دو جنّات تمہارے پاس آجائیں گے .... یاد رکھنا کہ انہیں کبھی بدی کا حکم نہ دینا ورنہ تمہارا انجام بہت بُرا ہوگا۔"

مستانہ فوج سے نکل آیا اور اُس نے اِن دو جنّات کے اشارے پر اس قصبے کے قبرستان کے قریب مکان بنا لیا۔ وہ لوگوں سے کم ہی ملتا جلتا تھا۔ الگ تھلگ رہتا اور اپنی دُنیا بسائے ہوتے تھا۔ اُس کی مقبولیت کا راز الگ تھلگ اور خاموش رہنے میں تھا۔ وہ عورتوں میں اس لئے زیادہ مقبول تھا کہ آدھے سر کا درد ایک پھونک سے رفع کر دیتا تھا۔ عورت کا ماتھا انگلیوں سے ملتا، اُس کے سر پہ ہاتھ پھیرتا، اُس کی ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ رکھ کر اُوپر اُٹھاتا اور اُس کی آنکھوں میں پھونک مارتا تھا۔

تسنیم کی ماں تو مستانے کی مریدنی تھی۔ اُس نے جب تسنیم کو عمر حیات کو دامِ محبت میں لینے کو کہا تھا تو خود مستانے نقشبندی کے پاس گئی اور اُسے کہا تھا کہ وہ یہ کرشمہ کر دکھائے کہ عمر حیات تسنیم کو قبول کر لے۔ مستانے نے ایسی بات نہیں کہی تھی کہ تسنیم کو اُس کے پاس بھیجا جاتے۔ اُس نے ایسی بات کسی عورت سے بھی کبھی نہیں کہی تھی۔

تسنیم کی ماں کو اُس نے سرکنڈے کا تین سوا تین انچ لمبا ایک ٹکڑا دے کر کہا تھا کہ یہ عمر حیات کے گھر کے اندر پھینک دے، عمر حیات بغیر جال کے ہاتھ آجائے گا ۔۔۔ اور وہ ماں بیٹی کے ہاتھ آگیا مگر سرکنڈے کے ٹکڑے نے اب کوئی اور ہی کرشمہ دکھانا شروع کر دیا تھا۔

◆◆◆

مستانہ نقشبندی تسنیم کی ماں کے ساتھ تسنیم کے گھر میں داخل ہُوا تو صحن میں چلتے چلتے رُک گیا اور اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ پھر مسکرایا۔

"تم ہو!" ۔۔۔ اُس نے اُسے کہا جو کسی اور کو نظر نہیں آتا تھا ۔۔۔

"جا بھائی میرے جا.... کیوں انہیں تنگ کرتے ہو" ۔۔۔ وہ وہیں کھڑا کبھی چپ ہو جاتا کبھی بولنے لگتا ۔۔۔ "نہیں جاؤ گے؟ .... مجھے جانتے ہونا!...."

ہاں ہاں بھائی! میں تمہاری بات سمجھ گیا ہوں۔ تم جو کہو گے، جو شرط بتاؤ گے پوری کروا دوں گا، بس اب ان کی جان چھوڑ.... میں کہتا ہوں شرط بعد میں پوری ہو گی، پہلے میری بات مانو۔ میں نے اُن دونوں کو تمہارے پیچھے ڈال دیا نا تو پھر دوڑے دوڑے میرے پاس آؤ گے۔"

اُس وقت گھر میں عمر حیات، اُس کے بچے شوکت اور نسیمہ کی ماں کے علاوہ محلّے کی دو عورتیں بھی موجود تھیں۔ مستانہ جس جنّ سے باتیں کر رہا تھا وہ تو شاید اُس کی بات نہیں مان رہا تھا لیکن اُسے دیکھنے والے بُری طرح متأثر اور مسحور ہوتے جا رہے تھے۔

مستانہ صحن سے برآمدے میں چلا گیا اور فرش پر بیٹھ گیا۔ اُس کے ہاتھ میں ایک تھیلا تھا۔ اس میں سے اُس نے مُردے کی دو ہڈیاں نکال کر فرش پر رکھیں۔ یہ انسانی بازوؤں کی ہڈیاں تھیں۔ وہ تھیلے میں سے کچھ اور نکال رہا تھا کہ اُسی سائز کا ایک پتھر جس سائز کے پہلے گرتے رہے تھے، مستانہ کے قریب گرا اور اُچھل کر دیوار سے ٹکرایا۔ مستانہ نقشبندی پتھر سے زیادہ اُچھلا اور اُس کا سانولا رنگ پیلا پڑ گیا۔ برآمدے میں کھڑی تمام عورتیں بھاگ کر کمرے میں چلی گئیں۔ کسی نے یہ بھی نہ دیکھا کہ شوکت گر پڑا ہے اور اُس پر دورے کی حالت طاری ہو گئی ہے۔

عمر حیات نے دیکھ لیا اور بچے کو اُٹھا کر کمرے میں پلنگ پر ڈالا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں مُڑ گئے تھے۔ دو تین پتھر ایک دوسرے کے پیچھے مستانے کے آگے پیچھے گرے۔ مستانہ بدک کر اُٹھ کھڑا ہُوا۔ وہ جُھک کر بازوؤں کی ہڈیاں اُٹھانے لگا تو ایک ہڈی اپنے آپ ہی اُڑی اور صحن میں جا پڑی۔ مستانہ پیچھے ہٹ گیا۔ وہ دوسری ہڈی کو اُٹھانے سے ڈرتا تھا۔

"سائیں مستانہ جی!" —— عمر حیات کمرے سے نکلا اور بولا —— "بچے کو دیکھیں۔ اس مکان پر پتھر اولوں کی طرح گرتے رہیں میں پرواہ نہیں کروں گا، میرے بچے کو بچا لیں۔"

"بچا لوں گا" —— مستانے نے اتنا ہی کہا تھا کہ ایک اور پتھر صحن میں

گرا اور لڑھکتا ہُوا برآمدے میں آ رُکا۔ مستانہ کچھ اور نہ کہہ سکا۔

دوسری ہڈی جو برآمدے میں پڑی تھی، وہ بھی اُڑی اور پہلی ہڈی کے قریب جا پڑی۔ کپڑے لٹکانے والی تار پر دو تولیے لٹک رہے تھے۔ دونوں کو آگ لگ گئی۔ سب مستانے کے مُنہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ انہیں پوری اُمید تھی کہ وہی اِس گھر کو اِس پُراسرار آفت سے بچائے گا لیکن اُس کی آنکھیں ٹھہر گئی تھیں اور اُس کے ہونٹ ہل رہے تھے۔ وہ بچے کو دیکھنے کے بہانے کمرے میں چلا گیا۔

بچے کے قریب پہنچتے ہی بچے نے جسم اور بازوؤں کو انگڑائی کے انداز سے اکڑایا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں سیدھے ہو گئے آنکھوں کی سُرخی تیزی سے کم ہونے لگی۔ تشنج ختم ہو گیا اور اُس کے مُنہ سے نکلا —— "ابّو!" —— اور وہ اُٹھ بیٹھا۔ عمر حیات اُس کے پاس بیٹھ گیا اور اُسے اپنی گود میں بٹھا کر اُس کے سَر اور گالوں کو چُومنے لگا۔ نسیمہ بچے کے قریب آئی تو بچہ اپنے باپ سے لپٹ گیا جیسے نسیمہ سے وہ ڈرتا ہو۔

"دیکھا نا!" —— نسیمہ کی ماں نے کہا —— "مستانہ جی شوکی کے قریب آتے تو شوکی اُٹھ بیٹھا۔"

"ذرا پہلے اندر آ جاتے تو بچے کو اتنی تکلیف نہ ہوتی" —— نسیمہ نے کہا۔

"ہر بات اور ہر کام کا وقت مقرر ہوتا ہے" —— مستانے نے کہا —— "اُنہوں نے آج تم لوگوں پر نہیں مجھ پر حملہ کیا ہے۔ وہ پتھر مجھے مارتے رہے ہیں لیکن پتھر جو سیدھے آتے تھے، وہ میرے قریب آ کر راستہ بدل لیتے تھے۔ تم لوگوں نے دیکھا نہیں؟ وہ تو میری ہڈیاں بھی لے اُڑے لیکن صحن سے آگے نہ لے جا سکے۔"

"کچھ کریں سائیں مستانہ جی!" —— عمر حیات نے بھکاریوں کے سے لہجے میں کہا —— "کچھ کریں۔ آپ جتنی رقم مانگیں گے، ابھی دوں گا۔"

"آپ کی رقم میری ولایت میں نہیں چل سکتی ملک صاحب!" —— مستانے نے کہا اور ذرا سوچ کر مستانی سی آواز میں بولا —— "چند ایک

چیزوں کی ضرورت ہے۔ بڑا سخت عمل کرنا پڑے گا، اس کے لئے پچاس روپے دے دیں۔"

عمر حیات نے اُسی وقت پچاس روپے اس کے حوالے کر دیئے۔

"کچھ ہمیں بھی سمجھائیں"۔۔۔ عمر حیات نے مستانے سے پوچھا ۔۔۔ "یہ کیا ہو رہا ہے؟ کیوں ہو رہا ہے؟"

"یہ ہر کسی کی سمجھ میں آنے والا راز نہیں ملک صاحب!"۔۔۔ مستانے نے جواب دیا ۔۔۔ "یہ تو جلتا ہُوا تنور ہے۔ اس میں ہر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا"۔۔۔ اُس نے نسیمہ کی ماں کی طرف دیکھا اور بولا ۔۔۔ "پرسوں میرے پاس آنا۔"

"آپ کی ضرورت پڑی تو آپ کو بلالیں گے"۔۔۔ عمر حیات نے کہا۔

"اب میرے آنے کی ضرورت نہیں"۔۔۔ مستانے نے کہا ۔۔۔ "میں نے دیکھ لیا ہے یہ کیا ہے اور کون ہے۔"

"لوگ کہتے ہیں کسی نے ہم پر کالا جادو کرایا ہے"۔۔۔ عمر حیات نے کہا۔

"لوگ کیا جانیں"۔۔۔ مستانے نے کہا ۔۔۔ "اگر یہ کالا جادو ہوتا تو میں یہاں کھڑے کھڑے تم پر یہ جادو کرانے والے کو اُلٹا کر دیتا، لیکن یہ کچھ اور ہے ملک صاحب!"

مستانہ چل پڑا۔ کمرے سے نکل کر صحن میں گیا۔ اُس کی دونوں ہڈیاں صحن میں پڑی تھیں۔ پہلے تو تین چار قدم دُور کھڑا انہیں دیکھتا رہا، پھر اُس نے ہڈیوں کی طرف ایک قدم اُٹھایا اور رُک گیا۔ اب وہ چلا تو ہڈیوں کے پاس جا رُکا اور جھکا پھر اُس نے یوں آہستہ آہستہ اور ڈرتے ڈرتے ہاتھ ہڈیوں کی طرف بڑھایا جیسے وہ دو زہریلے سانپ ہوں جو اُسے ڈس لیں گے۔ آخر اُس نے ہڈیاں اُٹھالیں اور تیزی سے انہیں تھیلے میں ڈال کر باہر نکل گیا۔

❖

وہ بہت تیز چلتا اپنے مکان تک پہنچا۔ اندر گیا تو دو آدمی بیٹھے تھے۔ ان میں ایک ملنگ تھا جو اسی قبرستان کے تکیے میں رہتا تھا۔

"سنا مستانے!"۔۔۔ ملنگ نے کہا ۔۔۔ "اچھا ہاتھ مار آئے ہو؟ کوئی موٹا مرغا پھنسا تھا؟"

"سُوٹا لگواؤ یار!"۔۔۔ مستانے نے تھیلا اکتاہٹ سے پھینکتے ہوئے کہا ۔۔۔ "آج تو مارے ہی گئے تھے۔"

"کیوں کیا ہُوا؟"

"وہ تم نے سُنا نہیں"۔۔۔ مستانے نے کہا ۔۔۔ "وہ ملک عمر حیات ہے نا.... کمیشن ایجنٹ...."

"اچھا اچھا"۔۔۔ دوسرے آدمی نے کہا ۔۔۔ "اُن کے گھر پتھر پڑتے ہیں اور کہتے ہیں کپڑے بھی جل جاتے ہیں۔"

"آج ان پتھروں سے معلوم نہیں میری کون سی نیکی نے مجھے بچا لیا ہے"۔۔۔ مستانے نے کہا ۔۔۔ "ملک کی ساس مجھے وہاں لے گئی تھی۔ میں اپنے اُستادی کرتب دکھانے کے لئے برآمدے میں ہی بیٹھ گیا اور پتھر پڑنے لگے۔ چار تو میرے قریب گرے اور یہ دونوں ہڈیاں جو میں نے تھیلے سے نکال کر فرش پر رکھ دی تھیں، اپنے آپ ہی اُڑ کر صحن میں جا گریں۔ اُدھر اُن کے لڑکے کو کوئی دورہ پڑ گیا۔ اُس کا باپ مجھے اندر بلاتا تھا اور میں ڈر کے مارے اندر جاتا نہیں تھا۔ جب ایک پتھر اور میرے پاؤں میں آپڑا تو میں بھاگ کر کمرے میں چلا گیا۔ خدا نے میری عزّت یوں رکھ لی کہ لڑکے کا دورہ ختم ہو گیا۔ سب کہنے لگے کہ مجھے دیکھ کر جن بھاگ گیا ہے۔"

"کچھ ہاتھ بھی لگا ہے یا نہیں؟"۔۔۔ ملنگ نے پوچھا۔

"تو کیا میں خالی ہاتھ آنے والا ہوں؟"۔۔۔ مستانے نے کہا ۔۔۔ "پچاس روپے نقد وصول کئے ہیں۔ ابھی اور کروں گا لیکن وہاں جاؤں گا نہیں۔"

"یہ تو بتا مستانے!" — ملنگ نے حقے کی ٹوپی میں چرس رکھتے ہوئے پوچھا — "یہ ہوتا کیا ہے؟ جن بھوت یا ...."

"جن بھوت ایسے نہیں کیا کرتے" — مستانے نے کہا — "یہ کالا علم ہے جسے تعویذ کرانا بھی کہتے ہیں۔ ہر عامل یہ عمل نہیں کر سکتا۔ کوئی کوئی کرتا ہے۔ پیسے لے کر گھر بیٹھے اپنا کالا جادو چلاتا ہے۔ یہ وہی جادو چل رہا ہے۔ یہ لوگ خواہ مخواہ ڈرتے ہیں۔ کچھ دنوں بعد یہ سلسلہ خود ہی رُک جائے گا۔ اس علم کے عامل جتنے دنوں کے لئے پیسے لیتے ہیں اتنے ہی دنوں کے لئے یہ کام کرتے ہیں۔"

"تم نے انہیں کیا بتایا ہے؟" — ملنگ نے چرس والے تمباکو کا کش لگا کر حقہ مستانے کے آگے کرتے ہوئے پوچھا — "تم نے بھی کہا ہوگا کہ اس گھر میں جن ہیں۔"

"یہ نہ کہوں تو کھاؤں کہاں سے" — مستانے نے جواب دیا — "میں نے انہیں کہا ہے کہ یہ بڑے زبردست جن ہیں جو ذرا مشکل سے ہی نکلیں گے .... ابھی تو مجھے اس گھر سے سینکڑوں روپے نکالنے ہیں۔ ملک کی ساس میری مٹھی میں ہے۔ وہ چاہتی تھی کہ اُس کی بیٹی کی شادی ملک کے ساتھ ہو۔ وہ یہاں آئی تھی۔ میں نے سرکنڈے کا ایک ٹکڑا ویسے ہی اُسے دے کر کہا کہ یہ ملک کے گھر پھینک دو۔ اُس کی بیٹی بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔ ملک کو اچھی لگی اور اُس نے اس سے شادی کر لی۔ اس لڑکی کی ماں ہر کسی سے ابھی تک کہتی پھرتی ہے کہ مستانے نقشبندی کے کانے نے اتنا امیر داماد دلا دیا ہے۔ لوگ اپنی خواہشوں اور مرادوں کے ہاتھوں اتنے مجبور ہو جاتے ہیں کہ اُن کی مرضی کے مطابق اوٹ پٹانگ اشارہ کر دو تو اُسے وہ معرفت کا اشارہ سمجھ لیتے ہیں۔"

"ایسی باتیں نہ کیا کر مستانے!" — دوسرے آدمی نے کہا — "لوگوں کی عقل نے کام کرنا شروع کر دیا تو تم جیسے اُستاد، ہم جیسے شاگرد اور یہ پیر، شاہ اور عامل وغیرہ، بھوکے مر جائیں گے۔"

❖

عمر حیات کے گھر کا اب یہ عالم تھا جیسے در و دیوار بھی خوفزدہ ہوں۔ رات ہلکا سا کھڑاک ہو تو عمر حیات اور نسیمہ ہڑبڑا کر جاگ اُٹھتے تھے۔ اس آفت سے پہلے شوکت رات کو الگ کمرے میں سوتا تھا لیکن اب عمر حیات اُسے اپنے ساتھ سلانے لگا تھا۔ اُن حالات میں وہ بچے کو تنہا نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ عمر حیات صرف یہ نہیں کہ اُسے اپنے کمرے میں سلاتا تھا بلکہ اپنے ساتھ سلاتا تھا۔

ایک دن کا اور وقفہ پڑا تو نسیمہ کا باپ اس علاقے کے ایک مشہور پیر کو گھر لے آیا۔ اس پیر کے ساتھ پانچ چھ خاص مُرید تھے جو پیر کے پیچھے پیچھے کلمۂ طیبہ کا ورد بلند آواز سے کرتے چلے آ رہے تھے۔ پیر کو دیکھ کر سارا محلّہ پیر کی قدم بوسی کے لئے اکٹھا ہو گیا۔

"اب دیکھتے ہیں وہ کون سا جن ہے جو پتھر پھینکے گا" — گلی میں کئی لوگوں کی زبان پر یہی الفاظ تھے — "ہمارے پیر صاحب نے تو چڑیلوں کی گردنیں مروڑ دی ہیں یہ جن کیا چیز ہیں .... پیر صاحب نے مُردے زندہ کئے ہیں۔"

پیر کو اندر گئے ابھی دس منٹ بھی نہیں گزرے ہوں گے کہ پیر کے دو تین مرید دوڑتے ہوئے باہر آئے۔ اُن کے پیچھے پیچھے وہ آدمی باہر نکلے جو پیر صاحب کے قدم چُھونے کے لئے اندر گئے تھے۔ گلی میں جو لوگ ہجوم کی صورت اکٹھے ہو گئے تھے اُن میں بھگدڑ مچ گئی۔

"پتھر پڑ رہے ہیں .... پتھر پڑ رہے ہیں" — ایک شور تھا — "کپڑوں کو آگ لگ گئی ہے۔"

اس شور و غل میں مُردوں کو زندہ کرنے والے پیر صاحب اس گھر سے نکلے اور جدھر سے آئے تھے اُدھر کو ہی چل پڑے۔ پیر صاحب کی موجودگی میں شوکت کو پھر دورہ پڑ گیا تھا اور پتھر پڑنے شروع ہو گئے تھے۔ تار پر لٹکا ہوا ایک کپڑا جل گیا۔ نسیمہ نے پرس میں جو نوٹ ڈالے تھے وہ بھی جل گئے۔ پیر نے یہ پُراسرار مظاہرے اپنی آنکھوں سے دیکھے

تو وہ یہ کہہ کر اس مکان سے نکل آیا کہ یہاں نہیں، میں اپنے گھر جا کر ان جنّات کو جلا ڈالوں گا۔

مستانہ نقشبندی نسیمہ کی ماں سے کہہ گیا تھا کہ وہ اُس کے پاس آئے۔

اتنا مقبول اور پہنچ والا پیر بھی ہار گیا تو نسیمہ کی ماں مستانے کے ہاں چلی گئی۔ مستانے نے تھوڑی ہی دیر پہلے چرس کا کش لگایا تھا جس سے اُس کی آنکھیں چڑھی ہوئی تھیں چرس کا خمار نسیمہ کی ماں کے لئے جلال تھا۔

"میں پکا بندوبست کر رہا ہوں" ــــ مستانے نے نشے سے لڑکھڑاتی ہوئی زبان میں کہا ــــ "یہ دو جنّات کا کام ہے۔ بڑے بدمعاش ہیں۔ آج رات قابو میں آجائیں گے۔"

مستانے نے ایک تعویذ سا لکھ کر اُسے دیا اور کہا کہ اسے کالے رنگ کے کورے کپڑے میں باندھ کر اُس کمرے کے دروازے کے ساتھ لٹکا دینا جس میں رات بچّہ سوتا ہے۔

"سائیں بادشاہ!" ــــ نسیمہ کی ماں نے آگے ہو کر ذرا دبی زبان میں کہا ــــ "مجھے کئی لوگ کہہ چکے ہیں کہ یہ لڑکا منحوس ہے .... آپ کو شاید معلوم نہ ہو، یہ میرے داماد کی پہلی بیوی سے ہے .... سیانے آدمی کہتے ہیں کہ اس لڑکے کی ماں کی بدرُوح آتی ہے۔ اگر یہ لڑکا اس گھر سے نکل جائے تو آپ کا کیا خیال ہے کہ یہ آفت ٹل جائے گی؟"

"تم جنّات کو گھر سے نکالنا چاہتی ہو یا اس لڑکے کو؟" ــــ مستانے نے کہا ــــ "جنّات کو نکالنا ایک کام ہے اور لڑکے کو وہاں سے نکالنا دوسرا کام ہے" ــــ مستانہ بڑا گھاگ آدمی تھا اور اُسے زندگی کا جو تجربہ تھا وہ عام ذہن کے انسانوں کو کم ہی ہو سکتا ہے۔ اُس نے کہا ــــ "لڑکے کو تم اُس گھر سے کس طرح نکال سکتی ہو؟ کیا اُس کا باپ اُسے گھر سے نکال دے گا؟ وہ تو کہتا ہے کہ اس مکان پر اولوں کی طرح پتھر پڑیں تو مجھے پرواہ نہیں، میرے بچّے کو بچا لیں" ــــ نسیمہ کی ماں کو خاموش دیکھ کر مستانے نے رازدارانہ لہجے میں کہا ــــ "لڑکے کو غائب کیا جا سکتا

ہے، پیسے لگیں گے۔"

"کیا ایسا نہیں ہو سکتا" ــــ نسیمہ کی ماں نے پوچھا ــــ "کہ آپ میرے داماد سے کہہ دیں کہ جب تک یہ لڑکا اس گھر میں موجود ہے یہ آفت گھٹے گی نہیں بڑھتی جائے گی؟"

"تمہارا دماغ میرے دماغ تک نہیں پہنچ سکتا" ــــ مستانے نے کہا ــــ "باپ اپنے بچّے کو گھر سے نہیں نکالے گا۔ اگر رقم دے سکتی ہو تو بچّے کو غائب کیا جا سکتا ہے۔"

"کیسے؟" ــــ نسیمہ کی ماں نے پوچھا ــــ "کیا آپ کوئی تعویذ دیں گے یا بچّے کو بھگانے کے لئے کوئی عمل کریں گے؟"

"یہ میرے سوچنے والی بات ہے کہ میں کیا کروں گا" ــــ مستانے نے کہا ــــ "تم یہ چاہتی ہو کہ بچّہ اس گھر میں نہ رہے" ــــ مستانے کی مجرم نگاہیں بہت دُور تک چلی گئیں۔ اُس نے کہا ــــ "اس بچّے کا غائب ہو جانا تمہارے لئے اس لئے بھی ضروری ہے کہ وہ رہا تو جائیداد کا وارث وہی ہوگا.... بات کرو۔ میں جو مانگوں وہ دو گی؟"

"آپ کیا لیں گے؟"

"پانچ سو روپیہ نقد" ــــ مستانے نے کہا ــــ "رقم پہلے۔"

"پانچ سو!" ــــ نسیمہ کی ماں کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔ اُس زمانے میں پانچ سو روپیہ کسی ساہوکار کے پاس ہی ہو سکتا تھا۔ نسیمہ کی ماں نے پوچھا ــــ "کچھ کمی بیشی؟ .... رقم بہت زیادہ ہے۔"

"اُس آفت کا حساب کرو جو تمہاری بیٹی پر آپڑی ہے" ــــ مستانے نے کہا ــــ "اور اُس جائیداد کا حساب کرو جو اس بچّے کے غائب ہونے کے بعد تمہاری بیٹی کو ملے گی۔ میں جانتا ہوں تمہاری بیٹی اس سے زیادہ رقم بھی دے سکتی ہے۔"

"مجھے بیٹی سے بات کر لینے دیں" ــــ نسیمہ کی ماں نے کہا اور پانچ روپے کا ایک نوٹ مستانے کے آگے رکھ کر چلی گئی۔

اُس کے جانے کے کچھ دیر بعد ایک آدمی مستانے کے گھر آیا۔

"مستانے!" — اُس نے کہا — "یہ تو بڑی موٹی مرغی ہے۔"

"اِدھر آؤ" — مستانے نے اُسے کہا — "میرے پاس بیٹھو.... ایک بچّہ غائب کرنا ہے.... گیارہ بارہ سال کا ہے۔"

"پھر اُس کا کیا کرو گے؟"

"غائب کر دینا ہے" — مستانے نے کہا — "خواہ زمین کے اندر غائب کر دو۔ کام مشکل نہیں۔ میں تمہارا راستہ صاف کر دوں گا۔"

"میں گنجے سے بات کر لوں" — اُس آدمی نے کہا — "لیکن مستانے، یہ سوچ لے۔ راستہ اچھی طرح صاف کرنا۔ ابھی چھ ہی مہینے ہوئے ہیں تین سال کاٹ کے آیا ہوں۔"

❖

اُصلا اس قصبے کی مشہور شخصیت تھی۔ اُس کی عمر چھبیس ستائیس برس تھی۔ اُس کے گھر والے اُسے اس لئے پسند نہیں کرتے تھے کہ وہ نکما اور نکھٹو تھا اور شہر کے لوگوں کو وہ اس لئے پسند نہیں تھا کہ فلسفیانہ باتیں اور بحث بہت کرتا تھا۔ میٹرک پاس ہونا بہت بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا۔ اُصلے کے پاس تو بی۔ اے کی ڈگری تھی۔ ماں باپ نے اُس کا نام شرف الدین رکھا تھا۔ کالج میں جا کر اُس نے اپنے نام کے ساتھ اصلاحی کا اضافہ کر لیا اور شرف الدین اصلاحی بن گیا۔ وہ لوگوں سے کہتا تھا کہ اُسے اصلاحی کے نام سے پکارا کریں۔ اُس کے دوستوں نے اُسے ازراہِ مذاق اصلاحی کہنا شروع کیا اور اُسے اُصلا بنا ڈالا۔ پھر اُس کا یہی نام پکا ہو گیا۔

وہ انگریزوں کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کی باتیں کرتا تھا۔ ملاؤں اور پیروں کو بُرا بھلا کہتا تھا اس لئے مسلمان اُسے دہریہ سمجھتے تھے۔ صوفی صاحب جو سب سے پہلے عمر حیات کے گھر گئے اور کہا تھا کہ گھر میں ختمِ قرآن ضروری ہے، اُصلا کو مُرتد قرار دے چکے تھے۔ اُنہوں نے یہ فتویٰ اُس روز دیا تھا جس روز اُنہوں نے اُصلے کو راستے میں روک کر کہا تھا کہ مسجد میں آیا کرے۔

"یعنی میں آپ کے پیچھے نماز پڑھا کروں؟" — اُصلے نے پوچھا تھا۔

"تو اور کیا؟" — صوفی صاحب نے کہا تھا — "میں ہی تو تمہارا امام ہوں۔"

"پھر مجھے وہ خدا بھی دکھا دیں جو آپ کے پیچھے پڑھی ہوئی نمازیں قبول کر لے گا۔"

صوفی صاحب کو غصّہ اس لئے زیادہ آیا تھا کہ چار پانچ آدمی پاس کھڑے سُن رہے تھے۔

اُصلا کو پتہ چلا کہ عمر حیات کا گھر ایک آفت کی زد میں آیا ہوا ہے تو وہ عمر حیات سے ملا اور پوچھا کہ اُس کے گھر میں کیا ہوتا ہے۔ عمر حیات نے اُسے ٹالنے کی خاطر بے دلی سے سنایا کہ کیا ہوتا ہے۔

"آپ کے گھر صوفی آیا اور کھا پی کر چلا گیا" — اُصلے نے کہا — "قبرستان کا ایک چرسی سائیں آیا اور وہ بھی پیسے لے کر چلا گیا۔ پھر وہ سانڈا آیا جسے لوگ خدا کے بعد کا درجہ دیتے ہیں، بلکہ مصیبت کے وقت خدا کی بجائے اس پیر کو پکارتے ہیں۔ اُس نے آپ کی کیا مدد کی؟"

"تینوں یہ تو بتا گئے ہیں ناکہ یہ جنّات ہیں" — عمر حیات نے کہا — "اب دیکھتے ہیں کہ ان تینوں میں سے جنّات پر کون قابو پاتا ہے۔"

"آپ کیسے مسلمان ہیں ملک صاحب!" — اُصلے نے کہا — "آپ کے ساتھ جنّات کی کیا دشمنی ہے؟ آپ نے یا آپ کے بچّے نے جنّات کا کیا بگاڑا ہے؟.... انسان کی انسان کے ساتھ دشمنی ہوتی ہے.... آپ کی کسی کے ساتھ دشمنی ہے؟"

"نہ یار!"

"آپ کی بیوی کا کوئی دشمن ہوگا۔"

"ایسا خطرناک دشمن تو اُس کا بھی کوئی نہیں ہوگا" — عمر حیات نے کہا — "میرا خیال ہے کہ یہ جو کچھ بھی ہے، یہ ہماری تمہاری سمجھ سے بالا ہے۔"

"میری بات کو ٹالنے کی کوشش نہ کریں" — اُصلے نے کہا —

"ایک جرم کا ارتکاب ہو رہا ہے۔"

"کیسا جرم؟"

"آپ کو کالے علم کے ذریعے پریشان کیا جا رہا ہے" — اصلے نے کہا — "کیا آپ نے افریقہ کے وِچ کرافٹ کے متعلق کبھی پڑھا یا سُنا نہیں؟ کیا آپ نے سِفلی عمل کبھی نہیں سُنا؟... کیا آپ نے وہ پتھر محفوظ رکھے ہوتے ہیں جو آپ کے گھر میں گرتے ہیں؟"

"رکھے ہوتے ہیں۔"

"پھر ابھی اُٹھیں" — اصلے نے کہا — "تین چار پتھر لے آئیں اور تھانے چلیں۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گا.... یہ پولیس کا کیس ہے ملک صاحب!"

◆◆◆

تھانیدار مسلمان تھا۔ ملک عمر حیات قصبے کا جانا پہچانا آدمی تھا۔ تھانیدار نے اس کی پوری بات سُنی۔

"پولیس آپ کی کیا مدد کر سکتی ہے ملک صاحب؟" — تھانیدار نے کہا — "پولیس جنات کو تو نہیں پکڑ سکتی۔"

"کسی کے گھر میں پتھر پھینکنا اور کسی کے کپڑے جلا دینا تو جرم ہے نا انسپکٹر صاحب!" — اصلے نے کہا — "خواہ کوئی گلی میں کھڑے ہو کر پتھر پھینکے خواہ کہیں دُور بیٹھ کر سِفلی عمل سے پھینکے۔"

"پھر مجھے بتائیں کہ فلاں آدمی جادو کے زور سے آپ کے گھر پتھر پھینک رہا ہے" — انسپکٹر نے کہا — "لیکن ثبوت کیا ہو گا؟"

"سراغرسانی آپ کا کام ہے انسپکٹر صاحب!" — اصلے نے کہا — "اگر مجرم کا سراغ ہم لگائیں اور مجرم کو ہم ہی پکڑ کر لائیں تو آپ کا کیا کام رہ جاتا ہے؟"

"میرا کام یہ رہ جاتا ہے کہ آپ سے کہوں کہ اس مجرم کے خلاف شہادت بھی لائیں" — انسپکٹر نے کہا — "ابھی تو آپ کو یہی پتہ نہیں چلا کہ یہ جنات کا جرم ہے یا کسی انسان کا.... اور میں آپ کو یہ بھی بتا دوں کہ سِفلی عمل سے کسی کو نقصان پہنچانے کے معاملے میں انگریز نے بڑا ڈھیلا سا قانون بنایا

ہے جو نہ ہونے کے برابر ہے۔ آپ کسی عامل سے بات کریں۔ میں اپنی سروس میں ایسے تین چار واقعات دیکھ چکا ہوں۔"

"جناب!" — عمر حیات نے کہا — "میرا ایک ہی بچہ ہے۔ اُس کی حالت بہت بُری ہو رہی ہے۔"

"اس عمل سے جسے کالا جادو کہتے ہیں، بچہ غائب بھی کرایا جا سکتا ہے" — اصلا نے کہا — "یہ ایسا جرم ہے جیسے سوتے ہوئے بچے کو کوئی اُٹھا کر لے جائے۔"

"جب بچہ غائب ہو گا تو میرے پاس آ جائیں" — تھانیدار نے کہا — "میں بچے کی گمشدگی کی رپورٹ لکھ لوں گا اور بڑی محنت سے تفتیش کروں گا، لیکن بچہ غائب نہیں ہو گا۔ اگر اُسے غائب ہونا ہوتا تو اب تک ہو چکا ہوتا۔"

اصلے نے تھانیدار کے ساتھ بہت بحث کی لیکن تھانیدار سمجھنے کی بجائے خفا ہو گیا اور اُس نے اِن دونوں کو چلتا کیا۔

اُس وقت مستانہ نقشبندی کے پاس وہ آدمی بیٹھا تھا جسے مستانے نے کہا تھا کہ گیارہ بارہ برس کی عمر کے ایک بچے کو اغوا کرنا ہے۔ یہ آدمی ایک ماہر جرائم پیشہ کو ساتھ لایا تھا جو گنجا کے نام سے مشہور تھا۔

"کہو مستانے!" — گنجے نے اُس سے پوچھا — "کس کا بچہ غائب کرانا ہے؟"

"کام کر دو گے؟" — مستانے نے پوچھا۔

"کر دوں گا" — گنجے نے کہا — "لیکن ملے گا کیا؟"

"جو مانگو گے" — مستانے نے کہا۔

عمر حیات اور اُصلا تھانے سے باہر آئے تو دونوں غصّے میں تھے۔
عمر حیات کو اُصلے پر اور اُصلے کو پولیس انسپکٹر پر غصّہ تھا۔

"دیکھ لیا اُصلے!" — عمر حیات نے کہا — "میں اسی لئے تھانے میں نہیں آتا تھا کہ یہ جنّات کا چکّر ہے۔ تم نے خواہ مخواہ میری بے عزّتی کرا دی۔"

"بے عزّتی کیسی ملک صاحب!" — اُصلے نے کہا — "پولیس انسپکٹر نے آپ کے ساتھ بڑے احترام سے بات کی تھی۔"

"تم نہیں سمجھے اُصلے!" — عمر حیات نے کہا — "یہ تھانیدار مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ میری حیثیت سے بھی واقف ہے لیکن اس نے میرے ساتھ اس طرح بات کی ہے جیسے یہ مجھے جانتا ہی نہیں۔"

"میں اپنی بات سے ہٹوں گا نہیں ملک صاحب!" — اصلے نے کہا — "میں اسی پر قائم رہوں گا کہ یہ بڑا سنگین جُرم ہو رہا ہے۔ کالا علم جسے افریقہ میں وِچ کرافٹ کہتے ہیں، ہمارے مذہب میں گناہ ہے اور قانون کی نگاہ میں سنگین جُرم.... آپ پولیس کپتان سے ملیں۔ وہ انگریز ہے۔ وہ یقیناً آپ کی مدد کرے گا۔ میں آپ کے ساتھ چلوں گا۔ آپ تعلیم یافتہ ہیں، عقل اور ہوش کی بات کریں۔"

"او بے مغز اُصلے!" — عمر حیات نے جھنجلا کر کہا — "تم تو خُدا کو بھی نہیں مانتے، جنّات کے وجود کو کیوں مانو گے۔"

"ملک صاحب! وہ خدا کوئی اور ہے جسے میں نہیں مانتا" — اُصلے نے کہا — "وہ ان مولویوں مُلّاؤں کا خدا ہے۔ تعویذ دینے والے پیروں کا بھی یہی خدا ہے۔ میں اس خُدا کا منکر ہوں۔ میں جس خدا کو مانتا ہوں اُس کے سامنے جانے کے لئے نہ مجھے ایک بالشت داڑھی کی ضرورت ہے نہ شلوار

ٹخنوں سے چند انچ اوپر کرنے کی ضرورت ہے اور وہ خدا یہ بھی نہیں دیکھتا کہ میرے ماتھے پر سجدے کا نشان ہے یا نہیں۔ وہ مجھ جیسے گناہگاروں کو بخش دینے والا خدا ہے۔ مجھے اس خدا کی ذاتِ باری پر مکمل یقین ہے کہ وہ جنّات کی مخلوق کو کبھی اجازت نہیں دیتا کہ وہ انسانوں کے گھروں میں پتھر پھینکیں اور اُن کے کپڑے جلائیں۔"

عمر حیات اُس کے ساتھ ساتھ خاموشی سے چلا جا رہا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ اُصلا جب وعظ یا بحث پر اُتر آتا ہے تو اُسے کوئی بھی خاموش نہیں کر سکتا۔

"ملک صاحب!" — اُصلا کہہ رہا تھا — "مجھے اس سے کوئی غرض نہیں کہ لوگ میرے متعلق کیا باتیں کرتے ہیں اور کیا رائے دیتے ہیں۔ وہ مجھے باتونی، بڑ بولا، بے مغز اور نہ جانے کیا کیا کہتے ہیں۔ میری بھابیاں مجھے اللہ کا دھتکارا ہُوا اور بد دُعایا ہُوا کہتی ہیں۔ ماں کہتی ہے، اتّو نے کتّے کی ہڈی کھائی ہوئی ہے.... لیکن ملک صاحب، میں نے کبھی پروا نہیں کی۔ میں قبروں کا پجاری نہیں۔ جھوٹے انسان سے نفرت کرتا ہوں۔ میں یہی کہتا رہوں گا کہ یہ جُرم ہو رہا ہے، سنگین جُرم.... آپ سوچ لیں۔ میں ہر وقت آپ کی مدد کے لئے حاضر ہوں" — اُصلا خاموش ہو کر کچھ سوچنے لگا۔ پھر بولا — "میں ایک آدمی کو جانتا ہوں۔ دریا کے پار دولت پُور گاؤں ہے نا! وہ وہاں رہتا ہے۔ جنّوں بھوتوں اور کالے علم سے اُسے بہت واقفیت ہے۔ اس علم میں وہ ڈوبا ہُوا ہے لیکن اس علم کو اُس نے کاروبار نہیں بنایا۔ ہو سکتا ہے وہ اس آفت کو روک دے جو آپ کے گھر پر آ پڑی ہے۔ اگر یہ نہ ہُوا تو وہ کم از کم یہ بتا دے گا کہ یہ ہے کیا۔"

"دیکھو اُصلے!" — عمر حیات نے رُک کر ہاتھ اُصلے کے کندھے پر رکھا اور کہا — "اگر میرے گھر کو اس آفت سے بچا لو تو جو مانگو گے دوں گا۔ تم نکمّے پھرتے رہتے ہو۔ ایسی نوکری لگوا دوں گا کہ عیش کرو گے۔"

"مجھے کچھ نہیں چاہئیے ملک صاحب!" — اُصلے نے کہا — "یہ بدمعاشی

جو کوئی ذلیل آدمی آپ کے ساتھ کر رہا ہے، یہ میرے لئے چیلنج ہے۔ آپ اگر مجھے کہہ دیں گے کہ میں اس معاملے میں دخل نہ دوں تو بھی میں خاموش نہیں رہوں گا۔ کچھ نہ کچھ کروں گا ضرور۔ مجھ سے اور کچھ نہ ہُوا تو میں اِن عاملوں اور پیروں سے جو دعویٰ کرتے ہیں کہ اُن کے قبضے میں جن ہیں یا جنات اُن کا حکم مانتے ہیں، کہوں گا کہ کسی جن کو میرے پیچھے ڈال دیں۔ آپ بھی دیکھ لینا کہ وہ کون سا جن ہو گا جو....."

"تم خود جنات کی اولاد میں سے ہو" — عمر حیات نے کہا — "میں تمہیں ایک بار پھر کہتا ہوں کہ کچھ کر کے دکھاؤ۔ پھر دیکھو کہ میں احسان کا بدلہ کس طرح چکاتا ہوں۔"

❖

دو روز بعد سورج ابھی نکلا ہی تھا کہ ایک پتھر عمر حیات کے گھر میں گرا۔ گھر والے ناشتہ کر رہے تھے۔ عمر حیات اپنے کام کو جانے کے لئے تیار تھا۔ اُس کا بچّہ شوکت بھی سکول جانے کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ ناشتہ کرتے کرتے شوکت ایک پہلو پر لڑھک گیا اور اس کے ساتھ ہی پہلا پتھر آیا۔ شوکت کی حالت ویسی ہی ہو گئی جیسی پہلے ہوتی تھی۔ عمر حیات نے اُسے اُٹھا کر پلنگ پر ڈالا۔ اتنے میں تین چار پتھر گر چکے تھے۔ نسیمہ نے کچھ پیسے ایک کٹورے میں رکھے تھے۔ ان میں پانچ پانچ کے دو نوٹ پڑے تھے۔ ان نوٹوں کو آگ لگ گئی۔ اس سے پہلے تو کپڑوں کو آگ لگتی تھی جو باہر تار پر لٹکے ہوتے تھے لیکن اب نسیمہ کے اُس دوپٹے کو آگ لگ گئی جو ایک کھونٹی پر ٹنگا ہُوا تھا۔

عمر حیات نے شکست خوردہ انداز میں سر اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔ اُس وقت وہ اپنے بچّے کے پاس پلنگ پر بیٹھا ہُوا تھا۔ نسیمہ کے چہرے پر خوف و ہراس تھا۔ اُس کی نظریں سارے کمرے میں گھوم رہی تھیں۔ ان نظروں میں بھی خوف و ہراس تھا۔ وہ شاید دیکھ رہی تھی کہ اب کون سے کپڑے کو آگ لگے گی۔ باہر صحن اور برآمدے میں تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد

پتھر گرتے تھے۔

عمر حیات اُٹھا اور آہستہ آہستہ چلتا باہر نکل گیا۔ اُس نے بے اختیار چاہا کہ زور زور سے چیخے اور لوگوں کو مدد کے لئے پکارے لیکن وہ مرد تھا۔ اُس نے برداشت سے کام لیا۔ گلی میں سے گزرتے دو آدمیوں کو اُس نے بتایا کہ اُس کے گھر میں آج پھر پتھر گر رہے ہیں۔ دو پڑوسیوں کو پتہ چلا تو آناً فاناً سارے محلّے کو پتہ چل گیا۔ لوگ اکٹھے ہونے لگے لیکن عمر حیات کے مکان کے قریب کوئی بھی نہ آیا۔ لوگوں پر سنّاٹا طاری تھا۔

عمر حیات اندر چلا گیا۔ دو تین منٹ بعد باہر آ کر اُس نے لوگوں کو بتایا کہ بچّہ اصلی حالت پر آ گیا ہے اور پتھر گرنے بند ہو گئے ہیں۔ دو معمّر آدمی عمر حیات کے پاس کھڑے تھے۔ باقی سب تماشائیوں کی طرح دُور دُور رُک گئے تھے۔ ان میں سے ایک ادھیڑ عمر آدمی آہستہ آہستہ چلتا عمر حیات کے پاس آیا۔ اس آدمی نے جوگیا رنگ کے کھدّر کے کپڑے پہن رکھے تھے اور اُس کے سر پر جوگیا رنگ کی پگڑی تھی۔

"میں آپ کے لئے اجنبی ہوں" — اُس نے قدرے نشیلی سی آواز میں کہا — "میں نے پہلے بھی سُنا تھا کہ اس محلّے میں کسی کے گھر پتھر پڑتے ہیں۔ میں آج ادھر سے گزرا تو ان لوگوں کو یہاں کھڑے دیکھا۔ پوچھا تو پتہ چلا کہ آج پھر پتھر پڑ رہے ہیں.... میں آپ کو ایک جوگی کے ڈیرے کا راستہ بتاتا ہوں۔ اُس کے پاس چلے جائیں۔ اگر وہ موج میں آ گیا تو آپ کی یہ مشکل حل کر دے گا۔ وہ کچھ بھی نہیں لیتا۔ اگر آپ نے اُس کے آگے پیسے رکھ دیئے تو وہ ناراض ہو جائے گا۔ یہ خیال بھی رکھیں کہ کوئی عورت اُس کے پاس جاتے تو اُس کی بات توجہ سے سُنتا ہے.... آپ لوگ کسی شک میں نہ پڑ جائیں۔ عورت جتنی بوڑھی ہو وہ اتنا ہی خوش ہوتا ہے۔ جوان عورت کو دس قدم دُور بٹھا کر اُس کی بات سُنتا ہے.... اُس نے دنیا کو تیاگ دیا ہے۔ آپ اپنی والدہ کو یا اپنی بیوی کی والدہ کو اُس کے پاس بھیج دیں۔"

عمر حیات تو تنکوں کے سہارے ڈھونڈ رہا تھا۔ اُس نے اس شخص سے جوگی کے ٹھکانے کا راستہ پوچھا۔ اُس آدمی نے عمر حیات کو راستہ سمجھا دیا۔ قصبے سے دو اڑھائی میل دُور ایک جنگل تھا جس میں ٹیکریاں بھی تھیں اور نشیب و فراز بھی۔ وہ ایک سرسبز ویرانہ تھا۔

◆◆

اُسی روز عمر حیات نے نسیمہ کی ماں کو ساتھ لیا اور جوگی کے ٹھکانے پر جا پہنچا۔ وہ خود آگے نہ گیا۔ کچھ دُور رُک گیا۔ نسیمہ کی ماں اکیلی آگے گئی۔ مٹی کا ایک ٹیلہ سا تھا جس میں ایک کشادہ گُف بنی ہوئی تھی۔ تین چار آدمی اِدھر اُدھر کچھ کر رہے تھے۔ گُف کے اندر عجیب سی بدبُو تھی جس میں چرس کی بدبُو زیادہ تھی۔ جوگی گُف کے اندر بیٹھا تھا۔

نسیمہ کی ماں گُف میں داخل تو ہوگئی لیکن جھجک کر رُک گئی۔ ایک آدمی نے اُسے اشارہ کیا کہ آگے ہو کر جوگی کے سامنے بیٹھ جاتے۔

"کہو، کیوں آئی ہو؟" — جوگی نے مخمور سی آواز میں پوچھا۔

نسیمہ کی ماں نے اُسے پوری تفصیل سے بتایا کہ اُس کی بیٹی کے گھر میں اس طرح پتھر گرتے ہیں اور اُس کے بچے کو کوئی دَورہ پڑ جاتا ہے۔ جوگی نے اُس سے کئی اور باتیں پوچھیں۔ پھر اُس سے پوچھا کہ اُس کی بیٹی اور اُس کے داماد کے نام کیا ہیں؟

"بیٹی کا نام نسیمہ ہے" — نسیمہ کی ماں نے جواب دیا — "اور داماد کا نام عمر حیات ہے اور بچے کا نام شوکت حیات ہے۔"

"ہمیں بچے کا نام نہیں چاہیے" — جوگی نے بارُعب سی آواز میں کہا — "یہ بچہ تمہاری بیٹی کا نہیں۔ یہ تمہارے داماد کا بچہ ہے۔"

"جوگی بابا!" — نسیمہ کی ماں نے حیران سی ہو کے پوچھا — "آپ کو کیسے پتہ چلا کہ یہ بچہ میری بیٹی کا نہیں؟"

"تمہاری آنکھوں میں ہمیں سب کچھ نظر آ رہا ہے" — جوگی نے جھومتی ہوئی آواز میں کہا — "یہ بچہ تمہاری بیٹی کا نہیں نہ ہی تمہاری بیٹی کا

کبھی بچہ پیدا ہوگا۔ اُس کی قسمت میں پتھر لکھے ہیں یا آگ" — جوگی نے ہاتھ سے اشارہ کر کے نسیمہ کی ماں سے کہا — "تین چار قدم پیچھے ہٹ جاؤ"

نسیمہ کی ماں پیچھے ہٹ گئی۔ جوگی نے انگلی سے زمین پر گول دائرہ بنایا اور اس میں چھوٹے بڑے کئی خانے بنائے۔ پھر ہر خانے میں اوٹ پٹانگ سی شکلیں بنائیں۔ اُس نے ایک پانسہ اُٹھایا اور دائرے میں پھینکا۔ پھر اُس نے پانسے کو بڑی غور سے دیکھا۔ پھر آنکھیں بند کر کے مُنہ آسمان کی طرف کر لیا اور انگلی اس طرح حرکت دینے لگا جیسے ہوا میں کچھ لکھ رہا ہو۔ اچانک اُس نے نسیمہ کی ماں کی طرف دیکھا۔

"یہ تو معاملہ ہی کچھ اور ہے" — اُس نے نسیمہ کی ماں سے کہا — "کوئی جن نہیں، کوئی چڑیل نہیں اور کوئی آسیب نہیں۔ یہ ستاروں کی دشمنی ہے۔ تمہارے داماد کا ستارہ تمہاری بیٹی کے ستارے سے نہیں ملتا بلکہ ان کی آپس میں بنتی ہی نہیں۔ یہ دونوں ستارے ایک برج میں اکٹھے ہو گئے ہیں۔ یہ برج ایسا ہے کہ اس میں جو ستارے آجاتے ہیں وہ اگر ایک دوسرے کو دوست بنانا چاہیں تو بھی ان کے درمیان دشمنی موجود رہتی ہے۔ وہ ایک دوسرے کو نقصان نہیں پہنچاتے بلکہ یہ برج دونوں کو نقصان پہنچاتا ہے.... تمہاری بیٹی جب تک اس خاوند کے پاس رہے گی اُس پر کوئی نہ کوئی آفت گرتی ہی رہے گی۔ تمہارے داماد کی پہلی بیوی بہت خوبصورت تھی لیکن موت نے اُسے اس دنیا سے اُٹھا لیا۔"

نسیمہ کی ماں کا رنگ پیلا پڑ چکا تھا اور وہ خوفزدہ سی نظروں سے جوگی کو دیکھے جا رہی تھی۔ وہ حیران تو اس بات پر ہو رہی تھی کہ جوگی کو یہ بھی معلوم تھا کہ عمر حیات کی پہلے بھی ایک بیوی تھی۔ وہ جوگی سے اس قدر مرعوب ہو گئی تھی کہ اُس سے کچھ پوچھنے سے بھی ڈرتی تھی۔

"جوگی بابا!" — اُس نے ڈرتے ڈرتے کہا — "کسی نے بتایا تھا کہ یہ میرے داماد کے بیٹے کی نحوست ہے۔ میں اس لئے سچ مانتی ہوں کہ پہلے

اس بچے کو کچھ ہوتا ہے پھر یہ پھر گرنے لگتے ہیں۔"

"تم اُن لوگوں کی باتوں کو سچ مانتی ہو جو غیب کے پردوں کے پیچھے نہیں دیکھ سکتے" — جوگی نے کہا — "بچے کا اس میں کوئی عمل دخل نہیں۔ جو کچھ بھی ہو رہا ہے وہ غیب کے ہاتھ سے ہو رہا ہے۔ میں تمہیں موٹی سی ایک بات سمجھاتا ہوں۔ عمر حیات کا ع، عبرت والا ہے۔ یہ اشارہ ہے کہ اس نام سے عبرت حاصل کرو۔ پہلی بیوی آئی اور وہ جوانی میں مر گئی۔ وہ جو بچہ چھوڑ گئی اُسے دَورے پڑنے لگے اور کپڑے جلنے لگے .... حیات کی ت، وہی ہے جو لعنت، مصیبت اور آفت کے آخر میں آتی ہے اور یہ ت عبرت کے آخر میں بھی آتی ہے۔ تمہاری بیٹی کے نام میں ن اور م بہت اہم ہیں۔ اس کی شادی کسی ایسے آدمی کے ساتھ ہونی چاہیئے تھی جس کے نام میں یہی دو حروف ہوتے۔ بہتر یہ تھا کہ اس کے خاوند کا نام 'م' سے شروع ہوتا اور درمیان میں کہیں ن آتا .... تم نہیں سمجھ سکو گی مائی! یہ حرفوں کا گورکھ دھندا ہے۔ ہم دُنیا تیاگ کر اس علم میں ڈوب گئے ہیں۔ جو ہم دیکھ سکتے ہیں وہ تمہیں نظر نہیں آسکتا۔"

"جوگی بابا!" — نسیمہ کی ماں نے غمزدہ سی آواز میں کہا — "مجھے اس علم میں ڈوبنے کی ضرورت نہیں نہ میں اس گورکھ دھندے کو سمجھنا چاہتی ہوں۔ میری غرض اور مراد تو یہ ہے کہ میری بیٹی کے گھر سے یہ آفت ٹل جائے۔"

"پھر اپنی بیٹی کو اپنے گھر لے جاؤ" — جوگی نے کہا — "اور اُسے کسی اور گھر میں بساؤ۔"

"کیا آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں اپنی بیٹی کو طلاق دلواؤں؟" — نسیمہ کی ماں نے کہا — "یہ تو بڑی مشکل بات ہے جوگی بابا!"

"طلاق کے سوا اس کا کوئی علاج نہیں" — جوگی نے کہا۔

"جوگی بابا!" — نسیمہ کی ماں نے التجا کی — "میں تو چاہتی تھی کہ اس بچے کو اِدھر اُدھر کر دیا جائے۔"

"بچے کو اِدھر اُدھر کرا کے دیکھ لو" — جوگی نے طنزیہ سے لہجے میں کہا — "تمہاری بیٹی کا حال پہلے سے زیادہ بُرا ہو گا۔ اس وقت اس گھر پر جو پھٹکار پڑتی ہے وہ اس بچے کے سر پر آ جاتی ہے۔ اس سے تمہاری بیٹی محفوظ رہتی ہے۔ بچہ چلا گیا تو یہ دَورے تمہاری بیٹی کو پڑا کریں گے۔"

"طلاق تو بہت مشکل ہے جوگی بابا!" — نسیمہ کی ماں نے کہا — "اگر میں نے خود بیٹی کو طلاق دلوائی تو اسے کوئی بھی قبول نہیں کرے گا۔ لوگ کہیں گے کہ اس لڑکی پر اللہ کی لعنت ہے یا اس پر کوئی آسیبی اثر ہے اس لئے اس کے خاوند نے اسے طلاق دے دی۔"

"یہ بات نہیں" — جوگی نے کہا — "تمہاری اصل مشکل یہ ہے کہ بیٹی کو طلاق ہوتی تو تمہارے داماد کی جائیداد تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گی۔"

نسیمہ کی ماں یوں بدکی جیسے کسی نے اُسے خنجر گھونپ دیا ہو۔ وہ پھٹی پھٹی سی نظروں سے جوگی کے مُنہ کی طرف دیکھنے لگی، لیکن عورت ہوشیار تھی، سنبھل گئی۔

"مجھے جائیداد کی ضرورت نہیں جوگی بابا!" — نسیمہ کی ماں نے کہا — "جائیداد کی بات یہاں تک صحیح ہے کہ میں نے اپنی بیٹی اس آدمی کو اس لئے دی تھی کہ امیر کبیر آدمی ہے، بیٹی سکھی رہے گی۔"

"تم نے جو کچھ بھی سوچ کر بیٹی اس آدمی کو دی تھی، اس سے ہمیں کوئی غرض نہیں" — جوگی نے کہا — "تم نے بیٹی کا بھلا سوچا لیکن بُرا ہوا۔ اب بیٹی کو سُکھی دیکھنا چاہتی ہو تو اُسے طلاق دلواؤ۔ اگر اُس کے لئے دوسرا رشتہ نہ ملا تو ہمارے پاس آ جانا۔ ہم تمہارا کام کر دیں گے .... ہم کچھ نہیں لیں گے۔ ہم دنیا سے تعلق توڑ چکے ہیں۔"

"کوئی اور صورت پیدا نہیں ہو سکتی جوگی بابا؟"

"نہیں، نہیں" — جوگی نے جھنجھلا کر جواب دیا اور زمین پر اپنی انگلی سے بنائے ہوئے دائرے کی طرف اشارہ کر کے بولا — "اس میں ہم کوئی تبدیلی نہیں کر سکتے۔ ہم ستاروں کے راستے نہیں روک سکتے۔ لکھے کو ہم مٹا نہیں

سکتے ۔۔۔جا، چلی جا۔ جب کبھی ہماری ضرورت پڑے آجانا۔"

نسیمہ کی ماں اس طرح ہارے ہوئے انداز سے اُٹھی جیسے وہ اپنا بوجھ اٹھانے سے معذور ہوگئی ہو۔ وہ گُفا سے نکل گئی۔ عمر حیات دُور اُس کے انتظار میں کھڑا تھا۔

❖

"کیا کہتا ہے؟" ــــ عمر حیات نے نسیمہ کی ماں سے پوچھا۔

نسیمہ کی ماں تو جیسے اپنے آپ میں نہیں تھی۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔

"خالہ!" ــــ عمر حیات نے کہا ــــ "معلوم ہوتا ہے جوگی نے آپ کو کوئی اچھی بات نہیں بتائی۔ اُس نے جو کچھ بھی کہا ہے مجھے بتادیں۔"

"میں سائیں مستانے کے پاس جاؤں گی" ــــ نسیمہ کی ماں نے کہا ــــ "مستانہ کچھ اور کہتا ہے، جوگی نے بالکل ہی اُلٹی باتیں بتائی ہیں۔ مستانہ کہتا ہے یہ جن ہیں اور جوگی کہتا ہے یہ تمہارے اور نسیمہ کے ستاروں کا فتور ہے۔"

"خالہ!" ــــ عمر حیات نے کہا ــــ "میں یہ معلوم نہیں کرنا چاہتا کہ یہ کیا ہے۔ جن ہیں یا ستارے، میں پوچھتا ہوں کہ اِس مصیبت سے چھٹکارا کس طرح حاصل ہوسکتا ہے۔"

"مستانے سے بات کرلینے دو" ــــ نسیمہ کی ماں نے کہا ــــ "اس جوگی پر مجھے اعتبار نہیں۔"

یہ عورت عمر حیات کو نہیں بتانا چاہتی تھی کہ جوگی نے کیا کہا ہے۔ جوگی کی بات مان لینے سے اتنا موٹا مرغا ہاتھ سے جاتا تھا۔ وہ بہت پریشان تھی۔ عمر حیات اُس سے بار بار پوچھتا تھا کہ جوگی نے کیا کہا ہے۔

"میں کہتی ہوں میں اس مردُود جوگی کی بات نہیں مان سکتی" ــــ نسیمہ کی ماں نے کہا ــــ "کہتا ہے اپنی بیٹی کے سوتیلے بچّے کو گھر سے نکال دو۔ اتنے خوبصورت اور پیارے بچّے کو یہ جوگی منحوس کہتا ہے۔ میں بھلا یہ بات مان سکتی ہوں؟"

عمر حیات چُپ ہوگیا۔

❖

جس وقت نسیمہ کی ماں جوگی کے پاس بیٹھی ہوئی تھی اُس وقت اُملا وہاں سے ڈیڑھ دو میل دُور ایک گاؤں دولت پور میں ایک آدمی کے پاس بیٹھا تھا۔ دولت پُور خاصا بڑا گاؤں تھا۔ مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کی آبادی اس گاؤں میں تقریباً برابر برابر تھی۔ اُس آدمی کا نام حسنین کاظمی تھا۔ وہ ہر قوم کے افراد میں مقبول تھا۔ اُس کی عمر چالیس سال سے اُوپر ہوگئی تھی۔ اُس کے گھر میں اُس کی صرف بیوی تھی۔ اللہ نے انہیں اولاد دی ہی نہیں تھی۔ کہتے ہیں کہ بے اولاد آدمی نفسیاتی مریض ہوجاتا ہے یا سارے زمانے کا دُرد اُس کے جگر میں سمٹ آتا ہے یا وہ تارکُ الدّنیا ہوکر علم وعرفان میں ڈوب جاتا ہے۔ وہ کسی بھی راستے پر چل نکلے اُس کا انداز ابنارمل ہوتا ہے۔ حسنین کاظمی اپنی بیوی کی محبت میں دیوانگی کی حد تک پہنچ گیا تھا۔ یہی کیفیّت اُس کی بیوی پر طاری رہتی تھی۔ وہ بچّوں کے پیار سے تو محروم رہے لیکن اُنھوں نے اس پیار کی کمی ایک دوسرے کے پیار میں ڈوب کر پوری کرلی۔

حسنین کاظمی کو جب یقین ہوگیا تھا کہ وہ اولاد سے محروم رہے گا تو اُس نے پیروں، فقیروں، عاملوں اور شاہ صاحبوں کے گھروں کے چکر لگانے شروع کردیئے تھے۔ اُسے جو بھی ملا وہ سراپا فریب نکلا۔ دو عامل ایسے ملے جنہوں نے اُسے صاف کہا کہ وہ بہت کچھ کرسکتے ہیں۔ چلتے پھرتے آدمی کو بے ہوش کرکے گرا سکتے ہیں۔ اس علم کے ذریعے کسی روگی کے روگ پر قابو پا سکتے ہیں لیکن موت وحیات اُن کے اختیار میں نہیں۔

"ادراک نہیں بھائی!" ــــ ایک بزرگ سے عامل نے اُسے کہا ــــ "زندگی عطا کرنے والا اور عطا کی ہوئی زندگی واپس لینے والا صرف اللہ

ہے۔ ابھی تک کسی ایسے علم یا عمل کا کھوج نہیں ملا جو اُس عورت کی کوکھ ہری کر دے جسے خدا نے بانجھ کیا ہے .... اور کاظمی بھائی! میں تم میں ایک خاص قسم کی ذہانت اور فہم و فراست دیکھ رہا ہوں مجھے امید ہے کہ تم میری بات سمجھ جاؤ گے .... سہارے مت ڈھونڈو۔ دل میں امید کی شمع جلائے رکھو لیکن جو کام اللہ کے کرنے کے ہیں ان کی توقع اللہ کے بندوں سے نہ رکھو۔"

"مجھے اتنا ہی بتا دیں" ۔۔۔ حسنین کاظمی نے کہا ۔۔۔ "کہ اس بیوی سے اولاد نہ ہو تو میں دوسری شادی کر لوں؟"

"ہاں" ۔۔۔ بزرگ عامل نے جواب دیا ۔۔۔ "میں اس سوال کا جواب تمہیں دے سکتا ہوں۔"

اس نے حسنین کاظمی سے کچھ کوائف پوچھ کر لکھ لئے اور اُسے اگلے روز آنے کو کہا۔ کاظمی اگلے روز گیا تو اس بزرگ نے اُسے بتایا کہ وہ ایک چھوڑ دس شادیاں کر لے، اُس کی قسمت میں خدا نے اولاد لکھی ہی نہیں۔ اُس نے کاظمی کو یہ بھی بتایا کہ جو محبت اُسے اس بیوی سے مل رہی ہے اور ساری عمر ملتی رہے گی وہ اُسے کسی اور عورت سے نہیں مل سکے گی۔

"کیا تم نے اپنے اللہ کو بھی کبھی یاد کیا ہے؟" ۔۔۔ بزرگ عامل نے پوچھا ۔۔۔ "یا خانقاہوں اور مزاروں پر ہی سجدے کرتے پھر رہے ہو؟"

"اللہ سے تو میں نے بہت دعائیں مانگی ہیں" ۔۔۔ حسنین کاظمی نے جواب دیا۔

"میں پوچھتا ہوں کبھی بے غرض عبادت بھی کی ہے؟" ۔۔۔ بزرگ عامل نے پوچھا۔

حسنین کاظمی کھسیانی سی مسکراہٹ کے سوا کوئی جواب نہ دے سکا۔

"عبادت کرو اپنی رُوح کی تقویت کے لئے" ۔۔۔ بزرگ عامل نے کہا ۔۔۔ "اپنی روحانی قوتوں کو بیدار کرو۔"

"محترم!" ۔۔۔ حسنین کاظمی نے بزرگ کے گھٹنوں پہ ہاتھ رکھ کر بے ساختہ

التجا کی ۔۔۔ "کیا آپ مجھے اپنی شاگردی میں بٹھا سکتے ہیں؟"

"کیا حاصل ہوگا تجھے میری شاگردی سے؟"

"فیض" ۔۔۔ حسنین کاظمی نے جواب دیا ۔۔۔ "فیض حاصل ہو جائے تو اور کیا چاہیئے۔"

بزرگ عامل نے اُسے اجازت دے دی کہ وہ جب چاہے اُس کے پاس آ سکتا ہے۔

حسنین کاظمی نے اس بزرگ عامل کی شاگردی میں پندرہ سال گزار دیئے۔ یہ بزرگ روحانی علوم کے علاوہ کالے علم کا بھی ماہر تھا۔ اُس عامل نے عمر کے پچاس برس اس علم میں ڈوب کر گزار دیئے تھے۔ اب وہی کیفیت حسنین کاظمی پر طاری تھی۔ اُس نے اس علم کو کاروبار کا ذریعہ نہیں بنایا تھا۔ اُس کا زیادہ تر وقت روحانی اور سفلی علوم کی گہرائیوں میں اُترتے گزرتا تھا۔ اُصلا اُسے جانتا تھا اور کئی بار وہ حسنین کاظمی کے پاس آ کر بیٹھا بھی تھا۔ حسنین کاظمی واحد آدمی تھا جو اُصلے کو پسند کرتا تھا۔

◆

"کاظمی صاحب!" ۔۔۔ اُصلے نے کہا ۔۔۔ "پہلے میں آپ کے پاس جب بھی آیا ہوں وہ عقیدت مندی تھی۔ آج میں آپ کو ایک امتحان میں ڈالنے آیا ہوں۔ ہمارے شہر میں ایک گھر میں دوسرے تیسرے روز پتھر گرتے ہیں، ایک دو کپڑے اپنے آپ ہی جل جاتے ہیں اور دو تین لوٹوں کو بھی آگ لگ جاتی ہے۔"

"یہ تو بڑی پرانی کہانی ہے" ۔۔۔ حسنین کاظمی نے کہا ۔۔۔ "یہ کہانی ایک سو ایک مرتبہ دہرائی جا چکی ہے۔"

"یہ کیا ہے کاظمی صاحب؟"

"سفلی عمل" ۔۔۔ حسنین کاظمی نے جواب دیا ۔۔۔ "کالا علم .... دُور بیٹھ کر کسی کو نقصان پہنچانے والا جادو .... مجھے یہ بتاؤ کہ اُس گھر میں

کوئی ایسا فرد ہے جسے پتھر گرنے اور آگ لگنے سے پہلے تشنج یا بے ہوشی کا دورہ پڑتا ہے؟"

"جی ہاں" — اصلے نے جواب دیا — "دس گیارہ سال کی عمر کا ایک بچہ ہے جسے مرگی کی قسم کا دورہ پڑ جاتا ہے۔"

"بڑی صاف بات ہے" — حسنین کاظمی نے جواب دیا — "اس بچے کو نہ مرگی کا دورہ پڑتا ہے نہ اس پر کسی جن یا آسیب کا اثر ہے، اس بچے کو سفلی عمل کرنے کے لئے ذریعہ بنایا گیا ہے۔ میں نے اس علم کی انگریزی کتابوں کا بھی بہت مطالعہ کیا ہے۔ اس بچے کو سفلی عمل کا جو ذریعہ بنایا گیا ہے اسے انگریزی میں میڈیم کہتے ہیں۔ اگر اس بچے کو اس گھر سے نکال کر کہیں اور لے جاؤ تو اس گھر میں نہ پتھر پڑیں گے نہ کہیں آگ لگے گی۔ میں تمہیں یہ بھی بتا دیتا ہوں کہ بچہ اس گھر میں رہے اور اس گھر کے کپڑے اور لوٹ کسی اور گھر میں لے جا کر رکھ دو تو انہیں وہاں بھی آگ لگے گی .... لوگ کہتے ہوں گے کہ یہ پتھر جنات پھینکتے ہیں"

"لوگ تو جاہل ہیں، وہ یہی کہتے ہیں" — اصلے نے کہا — "بچے کا باپ تعلیم یافتہ آدمی ہے۔ وہ بھی لوگوں کی باتوں میں آگیا ہے میں نے اسے چیلنج کیا ہے کہ جن پیروں اور عاملوں کے پاس وہ اس خیال سے جاتا ہے کہ جنات ان کا حکم مانتے ہیں، وہ جنات سے کہیں کہ میرے خلاف کوئی کارروائی کریں۔ میری ایسی ہی باتوں کی وجہ سے لوگ مجھے اصلا ہی نہیں بلکہ پگلا بھی کہتے ہیں .... میں آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ اب آپ میری مدد کریں۔ میں بچے کے باپ کو تھانے لے گیا تھا لیکن تھانیدار نے صاف ٹرخا دیا۔ کوئی بھی نہیں مانتا کہ کوئی آدمی دور بیٹھا اس گھر کے افراد کو پریشان کر رہا ہے۔"

"گھر میں کتنے افراد ہیں؟" — حسنین کاظمی نے پوچھا۔

"صرف تین" — اصلے نے بتایا — "باپ جس کی عمر پینتیس سال کے لگ بھگ ہے۔ یہ بچہ اس کی پہلی بیوی سے ہے اور اس کی دوسری

بیوی ہے جس کی عمر بائیس تیئیس سال ہے۔ اس کی پہلی بیوی مر گئی تھی۔"

"یہ جو کچھ ہو رہا ہے اس لڑکی کی خاطر ہو رہا ہے" — حسنین کاظمی نے کہا — "اگر اس بچے کی ماں زندہ ہوتی اور اسے بچے کے باپ نے طلاق دے کر دوسری شادی کی ہوتی اور بچے کو اپنے پاس رکھا ہوتا تو کہا جا سکتا تھا کہ یہ عمل پہلی بیوی کرا رہی ہے لیکن وہ اس دنیا میں نہیں۔ میں اپنے علم اور تجربے کی بنا پر یہی کہہ سکتا ہوں کہ اس دوسری بیوی کا کوئی امیدوار یا چاہنے والا ہوگا جس نے مایوس ہو کر کسی عامل سے مل کر یہ کارروائی شروع کرا دی ہے۔"

"ایسا ہو سکتا ہے" — اصلے نے کہا — "لڑکی کی شادی ہوئے ابھی دو اڑھائی مہینے ہی ہوتے ہیں، لیکن کاظمی صاحب! یہ تفتیش کرے گا کون؟ وہاں تو یہ عالم ہے کہ پیر گھر سے نکلتا ہے تو ایک عامل آجاتا ہے۔ وہ جاتا ہے تو کوئی شاہ صاحب آجاتے ہیں۔ اس کے جاتے ہی مسجد کے مولوی صاحب آ پہنچیں گے۔ مولوی صاحب اپنے شاگردوں کی فوج ساتھ لا کر ختم قرآن کر کے دولت اڑا گئے ہیں بچے کے باپ کی ساس ایک مجذوب سے ملنگ کی دہلیز پر بیٹھی رہتی ہے۔ وہ شخص سائیں مستانہ کہلاتا ہے۔"

"کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں وہاں بن بلایا چلا جاؤں؟" — حسنین کاظمی نے پوچھا۔

"آپ کو اس گھر سے نکالے گا تو کوئی نہیں" — اصلے نے کہا — "وہ تو کہتے ہیں کہ کوئی آئے اور انہیں اس مصیبت سے بچائے .... آپ میرے ساتھ چلیں"

"بہتر یوں ہوگا کہ تم بچے کے باپ سے بات کر لو" — کاظمی نے کہا — "وہ کہے تو میں آجاؤں گا۔"

"ایسے ہی سہی" — اصلے نے کہا — "میں کسی بھی دن آپ کے پاس آ سکتا ہوں۔ آپ کو اسی وقت میرے ساتھ چلنا ہوگا .... کاظمی صاحب! یہ عمل

کس طرح ہوتا ہے؟ گھر بیٹھے دوسروں پر کس طرح پتھر پھینکے جا سکتے ہیں؟ آگ کس طرح لگائی جا سکتی ہے؟ انسان اپنے آپ میں جادو کی یہ طاقت کس طرح پیدا کر لیتا ہے؟"

حسنین کاظمی کی نظریں اُصلے کے چہرے پر جم گئیں جیسے وہ اس چہرے پر کچھ پڑھنے کی کوشش کر رہا ہو یا کسی گہری سوچ میں کھو گیا ہو۔ اصلا اُسے دیکھتا رہا۔ اُس کی نظریں اپنے آپ حسنین کاظمی کی نظروں سے ٹکرائیں، پھر اُصلے نے یوں محسوس کیا جیسے اُسے اپنے آپ پر قابو اور اختیار نہیں رہا۔

حسنین کاظمی نے اپنے دونوں ہاتھ اُصلے کے چہرے کے دائیں اور بائیں اس طرح رکھے کہ انگلیاں اُصلے کی کنپٹیوں پر اور انگوٹھے اُس کی پیشانی پر تھے۔ وہ اپنے انگوٹھے آہستہ آہستہ اُصلے کی پیشانی پر ملنے لگا۔

اُصلا اپنے آپ میں کھو گیا تھا۔ حسنین کاظمی کے ہونٹ ہلنے لگے۔ وہ زیرِ لب کچھ کہہ رہا تھا۔ اُس نے اپنے ہاتھ اُصلے کے چہرے سے ہٹا لیے تھے۔ اُصلے نے اپنی قمیض اُتار کر پرے پھینک دی۔ اس کے نیچے بنیان تھی۔ اُس نے یہ بھی اُتار پھینکی۔ حسنین کاظمی نے ایک بار پھر اپنے ہاتھ اُصلے کی کنپٹیوں پر رکھ دیئے اور انگوٹھوں سے اُس کی پیشانی کو مل کر ہاتھ ہٹا لیے۔

اُصلے نے چونک کر اِدھر اُدھر دیکھا، پھر اپنے آپ کو دیکھا اور پھر حیرت زدہ نگاہوں سے حسنین کاظمی کی طرف دیکھنے لگا۔

"میری قمیض!" — اُس نے دبی دبی آواز میں پوچھا — "میری قمیض کس نے اُتاری ہے؟ .... اور بنیان ...."

"اپنی قمیض تم نے خود اُتاری ہے" — حسنین کاظمی نے کہا — "اور بنیان بھی تم نے خود ہی اُتاری ہے۔"

"اوہ!" — اُصلے نے کھسیانی سی مسکراہٹ سے کہا — "آپ نے مجھے ہپناٹائز کر لیا تھا۔ مجھ سے میرے کپڑے آپ نے اُتروائے ہیں۔"

"اب اپنی مرضی سے کپڑے پہن لو" — حسنین کاظمی نے کہا — "میں تمہارے سوالوں کا جواب دیتا ہوں۔"

"میں نے کوئی جادو نہیں چلایا" — حسنین کاظمی نے کہا — "ایک ایسی قوت استعمال کی ہے جو تم میں بھی ہے۔ اتنا تو تم سمجھ ہی گئے ہو کہ میں نے تمہیں ہپناٹائز کیا تھا، لیکن تمہیں یہ معلوم نہیں کہ ہپناٹزم کے پیچھے جو قوت کارفرما ہوتی ہے وہ ہر انسان میں موجود ہے۔ اسے ہر انسان استعمال نہیں کر سکتا۔ استعمال کرنا مشکل بھی نہیں۔ میں تمہیں ہپناٹائز کرنے کا طریقہ مختصر الفاظ میں نہیں سمجھا سکتا۔ تم اتنا سمجھ لو کہ میں نے اپنی قوتوں کو ایک نکتے پر مرکوز کر دیا تھا جس کا اثر تم پر یہ ہُوا کہ میں نے تمہارے ذہن پر قابو پا لیا۔ تم اپنے کپڑے نہیں اُتارنا چاہتے تھے۔ یہ میرا ارادہ تھا کہ تمہاری قمیض اُتروا دوں۔ میں نے اپنا ارادہ تمہارے ذہن میں منتقل کر کے تمہاری قمیض اُتروا دی۔"

"میں آپ کا مطلب کسی حد تک سمجھ گیا ہوں" — اُصلے نے کہا — "میں نے ایک کتاب میں قوتیں مرکوز کرنے کی بڑی خوبصورت مثال پڑھی تھی۔ وہ غالباً کوئی ماہرِ نفسیات تھا۔ وہ لکھتا ہے کہ سورج کی کرنیں کسی چیز کو آگ نہیں لگا سکتیں لیکن آتشیں شیشے کے ذریعے انہی کرنوں کو کسی کاغذ یا کپڑے پر مرکوز کر دو تو یہ آگ لگا دیں گی۔"

"بہت خوبصورت مثال ہے" — حسنین کاظمی نے مسکراتے ہوئے کہا — "معلوم نہیں لوگ تمہیں بیوقوف کیوں سمجھتے ہیں.... انسانی قوتوں کی مثال سورج کی کرنوں جیسی ہے۔ کمزور انسان اُسے کہتے ہیں جس کی خداداد قوتیں بکھری رہیں۔ اگر مشق کر کے کوئی بھی انسان اپنی ان قوتوں کو یکجا کر لے اور پھر انہیں ایک ہدف پر مرکوز کر دے تو یہ وہی نتیجہ پیدا کر سکتی ہیں جو انسان پیدا کرنا چاہتا ہے۔ روحانیت کی بنیاد بھی یہی ہے اور کالے علم کی بنیاد بھی یہی۔ کالے علم میں کچھ اور چکّر بازی بھی ہے جو سیکھنے کے لیے کئی سال درکار ہیں۔"

"کاظمی صاحب!" — اُصلے نے کہا — "میں یہ علم سیکھنا نہیں چاہتا۔ میں کہتا ہوں کہ یہ ایک جرم ہے۔"

"تم جرم کہتے ہو" — حسنین کاظمی نے کہا — "یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ اسلام میں تو کالے جادو کو کفر کہا گیا ہے، لیکن انسان شیطان سے جلدی متأثر ہوتا ہے۔ شیطان کہتا ہے خدا تو مرنے کے بعد جنت دکھائے گا بشرطیکہ تمہارے اعمال تمہیں جنت میں لے جانے کے قابل ہوئے لیکن شیطان کہتا ہے کہ وہ انسان کو اسی دنیا میں جنت دکھا سکتا ہے۔ شیطان کی جنت میں داخل ہونے کے لئے انسانوں نے کئی راستے اختیار کئے۔ یہ تمام راستے گناہوں کی وادی میں سے گزرتے ہیں۔ کالا علم بھی ایک راستہ ہے۔ انسان نے یہ بھی اختیار کیا۔ اس سے انسانوں نے ایک دوسرے کو بہت نقصان پہنچائے ہیں۔"

"ایک طرف آپ کہتے ہیں کہ یہ انسان کی قوتوں کے مرکوز ہونے کا کرشمہ ہے" — اصلے نے کہا — "اور آپ یہ بھی کہتے ہیں کہ یہ جادو ہے۔"

"میں اس علم کی باریکیاں بیان نہیں کر رہا" — حسنین کاظمی نے کہا — "میں نے عمر کے پندرہ سال اس علم کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش میں گزارے ہیں۔ تم صرف اتنا ذہن میں رکھ لو کہ کالا عمل کرنے والوں نے مشق کر کر کے اپنی قوتوں کو مرکوز کرنے کی صلاحیت پیدا کر رکھی ہوتی ہے لیکن اس صلاحیت کو استعمال کرنے کے لئے ایک خاص فطرت کے انسان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسے تم شیطان کی فطرت کہہ سکتے ہو۔ کالے علم کے عاملوں کے چہرے بے رونق بلکہ مکروہ سے ہوتے ہیں۔"

"کاظمی صاحب!" — اصلے نے کہا — "میں باریکیوں میں تو نہیں جانا چاہتا لیکن مجھے ابھی تک آپ کی بات کا کوئی سر پیر نہیں ملا۔"

"بھائی میرے!" — حسنین کاظمی نے کہا — "یہ علم کچھ ٹیڑھا سا ہے۔ اس علم کا عامل ایک تو اپنی قوتوں کو ایک نکتے پر مرکوز کر لیتا ہے دوسرے یہ کہ اس کے کچھ جنتر منتر بھی ہوتے ہیں۔ میں روحانیت اور کالے علم کی تہہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ میں اپنے بزرگ استاد کی

اس بات کو صحیح تسلیم کرتا ہوں کہ انسان اپنے آپ کو کتنا ہی آزاد اور ترقی یافتہ کیوں نہ بنا لے لیکن کچھ غیبی عناصر ہیں جن کے ساتھ انسان کا رشتہ اتنا گہرا ہے کہ وہ ان سے آزاد نہیں ہو سکتا۔ انسان کا تعلق غیب کے ساتھ بھی ہے۔ کائنات میں کچھ عناصر ایسے ہیں جو نظر نہیں آتے لیکن انسان اُن کا تابع رہتا ہے۔ ان عناصر کو کوئی جنات کہتا ہے۔ کوئی موکل اور کوئی بیر کہتا ہے۔ عامل ان عناصر کے ساتھ ظاہری رشتہ قائم کر لیتا ہے۔ پھر انہیں وہ اپنے عزائم کے مطابق استعمال کرتا ہے۔"

"کیا آپ نے ان عناصر کے ساتھ رشتہ قائم کرنے میں کامیابی حاصل کر لی ہے؟" — اصلے نے پوچھا۔

"ہاں" — حسنین کاظمی نے جواب دیا — "میں نے خاصی کامیابی حاصل کر لی ہے لیکن میں انہیں ذریعۂ معاش نہیں بنا رہا بلکہ انہیں سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر مجھے کبھی ان عناصر کو استعمال کرنے کا خیال آیا تو میں انہیں انسان کی بھلائی کے لئے استعمال کروں گا .... لیکن اصلے! میں تمہیں راز کی ایک بات بتانا چاہتا ہوں اور میں یہ بھی چاہتا ہوں کہ تم یہ راز اپنے دوستوں کو بھی بتاؤ۔ دنیا تیاگ دینا تارک الدنیا ہو جانا کچھ اور معنی رکھتا ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ تم دنیا سے تعلق توڑ کر جنگلوں میں جا بیٹھو۔ میں تمہیں اس حد تک تارک الدنیا ہونے کا مشورہ دیتا ہوں کہ دنیا کی لذتوں اور عیش پرستی کے خیال سے اپنے ذہن کو پاک رکھو۔ میں نے عالم فاضل بھی دیکھے ہیں جو عورت کے پُر لطف تصورات سے دل بہلاتے ہیں۔ دنیا کے لالچ سے بچو، سچ بولو اور حلال کی کھاؤ خواہ وہ کتنی ہی تھوڑی کیوں نہ ہو۔ حیوانی خیالات سے بچو۔ اپنے اندر غصے اور حسد کو ذرا سی بھی جگہ نہ دو۔ مختصر یہ کہ اپنے ضمیر کو غلاظت سے پاک رکھو پھر تم دیکھو گے کہ انسانوں کا ایک ہجوم تمہارے خلاف اُٹھ کھڑا ہوگا تو تم بڑی دلیری سے سب کے سامنے کھڑے ہو سکو گے۔ ہجوم میں کوئی ایک بھی آدمی ایسا نہیں ہوگا جو تمہاری نظروں کا سامنا کر سکے۔ اس طرح تمہاری تمام قوتیں تمہارے ذرا سے

اشارے پر ایک نکتے پر مرکوز ہو جایا کریں گی۔ یہ راستہ روحانیت کی طرف جاتا ہے۔ کالا علم کرنے والے اپنا من مار کر اپنی قوتوں کو یکجا کر لیتے ہیں اور ان کے ساتھ کچھ جنتر منتر سے شامل کر لئے جاتے ہیں۔ پھر دُور بیٹھ کر کسی کو اس سفلی عمل کا نشانہ بنا لیا جاتا ہے۔"

"اس کا کوئی علاج ؟"

"ہاں" ــــ حسنین کاظمی نے جواب دیا ــــ "میں اُس گھر میں جا کر بیٹھ جاتا ہوں جس گھر میں پتھر پڑتے ہیں۔ میری موجودگی میں نہ پتھر پڑیں گے نہ آگ لگے گی .... اُن سے کہو کہ بچے کو اِس گھر سے دور کہیں رکھیں۔ اُنہیں یہ بھی کہو کہ گھبرائیں نہیں، سنگباری زیادہ عرصہ نہیں چلے گی۔ چند دنوں بعد ختم ہو جائے گی۔ انہیں یقین دلاؤ کہ یہ کوئی جن یا آسیب نہیں۔ کوئی دشمن اُنہیں پریشان کر رہا ہے۔ اس دشمن کا کھوج لگانے کی کوشش کریں۔"

❖

نسیمہ کی ماں نے عمر حیات کو تو نہیں بتایا تھا کہ جوگی نے اُسے کیا بتایا ہے لیکن نسیمہ کو اُس نے جوگی کی ہر ایک بات بتا دی۔ وہ پریشان ہو گئی۔ طلاق کے نام سے ہی وہ ڈرنے لگی۔

"نہیں امی!" ــــ نسیمہ نے کہا ــــ "تم مستانے کے پاس جاؤ یا کسی عامل یا پیر کا سراغ لگاؤ۔"

"یہی تو میں کہہ رہی ہوں" ــــ نسیمہ کی ماں نے کہا ــــ "طلاق کوئی معمولی بات تو نہیں ہوتی۔ ایسا اچھا رشتہ کہاں ملے گا! وہ تو یہ بھی کہتا تھا کہ نسیمہ کے بچے پیدا ہی نہیں ہوگا" ــــ ماں نے نسیمہ کے کان میں کہا ــــ "میں تو سوچتی ہوں بیٹی! اگر خدا نے تمہاری قسمت میں بچہ لکھا ہی نہیں تو اتنی جائیداد تو ہاتھ سے نہ جائے نا! .... لیکن .... لیکن" ــــ وہ سوچ میں پڑ گئی، پھر مایوس سے لہجے میں بولی ــــ "لیکن جائیداد کا وارث موجود ہے۔"

"ایک بات کہوں امی!" ــــ نسیمہ نے کہا ــــ "جائیداد تو اپنی جگہ ہے ہی، تم نے اسی لئے میرا رشتہ عمر حیات کو دیا تھا لیکن یہ آدمی مجھے بہت اچھا لگ رہا ہے۔ پہلے پہل تو میرے دل نے اسے اس لئے قبول نہیں کیا تھا کہ یہ عمر میں مجھ سے تیرہ چودہ سال بڑا ہے اور اس کا گیارہ بارہ سال کا ایک بچہ بھی ہے لیکن یہ آدمی میرے دل میں اُترتا جا رہا ہے اور میں صاف طور پر محسوس کرنے لگی ہوں کہ میری شادی عمر حیات کے ساتھ ہی ہونی چاہیئے تھی .... اور اس کا بچہ شوکی بھی مجھے اچھا لگنے لگا ہے۔"

"چلو اچھا ہے نا!" ــــ ماں نے کہا ــــ "یہی تو میں کہہ رہی ہوں۔ اس باپ بیٹے سے دل لگاتے رکھو اور انہیں اپنی محبت میں گرفتار کئے رکھو۔ تھوڑا عرصہ گزر جاتے تو عمر حیات سے کہنا کہ یہ مکان تمہارے نام کر دے .... اور دیکھو .... پیسے اپنے قبضے میں لیتی رہو۔ رقم زیادہ ہو جائے تو میرے پاس رکھ دیا کرنا .... تم دیکھ رہی ہو تمہارے ابا کی پنشن پر کیسے گزارا ہوتا ہے۔"

"وہ تو میں ایسے ہی کروں گی" ــــ نسیمہ نے کہا ــــ "لیکن امی! ابھی تو اس مصیبت کی سوچو جس نے ہمارے دم خشک کر رکھے ہیں۔"

"دو بار جا چکی ہوں" ــــ ماں نے کہا ــــ "مستانہ نہیں ملا۔ کل پھر جاؤں گی۔"

ماں اپنے گھر چلی گئی۔

❖

رات کو عمر حیات اور اُس کا بچہ شوکت گہری نیند سوئے تھے، نسیمہ جاگ رہی تھی۔ سوچ سوچ کر اُس کا دماغ تھک گیا تھا۔ ذہن میں خیالوں اور وسوسوں کا ہجوم تھا۔ وہ جوگی کی باتوں کو اُلٹ پلٹ رہی تھی۔ اُس کے ذہن میں بار بار دو حروف ــــ میم اور نُون ــــ آتے تھے۔ جوگی نے اُس کی ماں سے کہا تھا کہ اُس کی بیٹی کی شادی ایسے آدمی کے ساتھ ہونی چاہیئے تھی جس کا نام میم سے شروع ہوتا ہے اور اگر اس نام میں نُون

بھی آجاتے تو اور زیادہ اچھا ہوگا۔

نسیمہ طلاق کے لئے تیار نہیں تھی، پھر بھی وہ اپنے محلّے اور برادری کے غیر شادی شدہ جوان آدمیوں کو باری باری ذہن میں لاکر دیکھ رہی تھی کہ کس کس کا نام میم سے شروع ہوتا ہے۔ ایک محمد علی تھا، ایک ممتاز اور ایک مجیب تھا۔ ان میں سے کسی کو بھی وہ اپنے قابل نہیں سمجھتی تھی۔

سوچتے سوچتے اُس کے ذہن میں ایک اور نام آگیا — منیر — وہ اُٹھ بیٹھی جیسے اِس نام نے اُس کا رُواں رُواں بیدار کر دیا ہو۔ یہ نام میم سے شروع ہوتا تھا اور اس میں ن بھی آتا تھا۔ نسیمہ کی نظریں کمرے کے تاریک خلا میں بھٹکنے لگیں جیسے اس نام کے آدمی کو ڈھونڈ رہی ہوں۔

منیر اسی قصبے کا رہنے والا جوان آدمی تھا۔ اُس کی عمر ستائیس اٹھائیس سال ہوگئی تھی۔ ابھی اُس نے شادی نہیں کی تھی۔ اُسے کسی شریف گھرانے سے رشتہ مل بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ وہ اچھے چال چلن کا آدمی نہیں تھا۔ وہ خوشحال خاندان کا اکلوتہ بیٹا تھا۔

اُس کے باپ کی لوگ عزّت کرتے تھے۔ وہ قابلِ عزّت حیثیت کا آدمی تھا لیکن بیٹا نکمّا اور آوارہ نکلا۔ اس کے باوجود باپ اُسے شہزادہ بنا کر رکھتا تھا۔ وہ قیمتی کپڑے پہنتا تھا اور خوبرو جوان تھا۔ وہ کسی اور ہی راستے پر چل نکلا تھا۔ اُس کی دوستی کے حلقے میں دو تین امیر ماں باپ کے لڑکے تھے اور سائیں اور ملنگ قسم کے آدمی بھی۔ ہندوؤں کے سادھوؤں جوگیوں اور سنیاسیوں کے ساتھ بھی اُس کا اُٹھنا بیٹھنا تھا۔

ایک سال پہلے کا واقعہ ہے کہ نسیمہ کی منیر سے ملاقات ہوگئی۔ یہ پہلی ملاقات جو اتفاقیہ تھی، والہانہ محبّت کی صورت اختیار کر گئی۔ اِن کی چوری چھپے کی ملاقاتیں شروع ہوگئیں اور کبھی جُدا نہ ہونے کے وعدے بھی ہوگئے۔ یہ سلسلہ چند مہینے چلا تو نسیمہ نے اپنی ماں سے کہا کہ وہ منیر کے ساتھ شادی کرے گی۔ ماں بیٹی کی آپس میں سہیلیوں جیسی بے تکلفی تھی۔ ماں نے نسیمہ سے یہ نہ کہا کہ وہ بُرے چال چلن کے آدمی سے ملتی ملاتی ہے۔ ماں کا انداز کاروباری سا تھا۔

”وہ ہے تو اچھے خاندان کا لڑکا“ — ماں نے کہا — ”اور وہاں روپے پیسے کی بھی کمی نہیں لیکن لڑکا نیک نام نہیں۔ سنا ہے چرس اور شراب بھی پیتا ہے۔ کوئی کام بھی نہیں کرتا۔ آج تو باپ اُس کے سر پہ ہے۔ وہ دُنیا سے اُٹھ گیا تو یہ کیا کرے گا؟ تمہارے زیورات اور باپ کی جائیداد بیچ ڈالے گا.... اسے دل سے اُتار دو بیٹی!“

بیٹی پر جذبات اور نوجوانی کا غلبہ تھا، ماں کی بات کو اُس نے اہمیّت نہ دی۔ وہ منیر کی ہی طرح خودسر تھی۔ اُس نے منیر کے ساتھ ملاقاتیں جاری رکھیں۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ اُس کی ماں شکاری عورت ہے اور وہ کوئی موٹا شکار ڈھونڈ رہی ہے۔

چند ہی دنوں بعد ماں کی نظر عمر حیات پر پڑی۔ عمر حیات کو تو وہ پہلے ہی جانتی تھی لیکن اُسے خیال تھا کہ عمر حیات دوسری شادی نہیں کرے گا۔ اب اُس نے اپنی بیٹی کو بے دام ہاتھ سے جاتے دیکھا تو اُس کی نظریں عمر حیات پر جم گئیں۔ اِس عورت نے زمانے کو اپنی نظروں کے زاویے سے دیکھا تھا۔ مردوں کی کمزوریوں سے وہ واقف تھی۔ اُس نے عمر حیات سے اس طرح راہ و رسم پیدا کر لی کہ اپنے گھر کے دو مسئلے اُس کے آگے جا رکھے اور اُس کی تعریفوں کے پُل باندھ کر کہا کہ اُس کے یہ کام وہی کر سکتا ہے۔ اُس نے باتوں باتوں میں عمر حیات کو انگریز ڈپٹی کمشنر اور پولیس کپتان جیسا حاکم بنا دیا۔ عمر حیات نے اُس کے دونوں کام کر دیئے۔

خوشامد اور تعریف انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ نسیمہ کی ماں نے عمر حیات کی یہ رگ اپنے ہاتھ میں لے کر اُسے اپنا مرید بنا لیا۔ کبھی کبھی وہ عمر حیات کے بچّے کو اپنے گھر لے جاتی اور اُس کے ساتھ وہ اور نسیمہ اتنا پیار کرتیں کہ بچّہ کبھی کبھی پورا دن وہیں گزار آتا۔

”یہ آدمی ہے جس کی بیوی بن کر تم عزّت کی نگاہ سے دیکھی جاؤ گی“ — ماں نے نسیمہ سے کہا تھا — ”تمہارے لئے ہی میں اس آدمی کو پھانس رہی ہوں نسیمہ! اُس کے بچے کو تمہارے لئے چاٹ رہی ہوں۔ عمر حیات

کا نام ہر کوئی عزّت سے لیتا ہے۔ میں نے اُس کی جائیداد اور اُس کی آمدنی کا حساب کر لیا ہے .... اُس کی عمر چاہے کتنی ہی کیوں نہ ہو گئی ہو، یہ تمہارے منیر سے زیادہ جوان لگتا ہے۔ بے فکری کی زندگی بسر کر رہا ہے نا! دولت کا چشمہ اپنے صحن میں ہو تو فکر کیا اور غم کیسا؟"

نسیمہ چُپ چاپ سن رہی تھی۔ اُس کی ماں کے بولنے کا انداز ایسا طلسماتی سا تھا کہ نسیمہ مسحور سی ہوتی جا رہی تھی۔

"صرف محبّت سے زندگی نہیں بنا کرتی بیٹی!"— ماں کہہ رہی تھی —"محبت کا کیا ہے! .... جس سے دل لگ گیا وہ دل کا دردی بن گیا۔ عمر حیات کے ساتھ دل لگا کے دیکھو۔ یہ تو بے چارہ محبت کو ترس گیا ہے۔ منیر کا کیا بھروسہ؟ دس جگہوں سے مجھے پتہ چلا ہے کہ شہر کی رنڈیوں کے پاس جاتا ہے۔ یہاں دو ہندوانیوں کے ساتھ اُس کا یارانہ ہے۔ آج تمہارے ساتھ ہیر رانجھے کا کھیل کھیل رہا ہے، کل تمہاری محبت کو ناپاک کر کے تم جیسی کسی اور کے ساتھ یہی ناٹک کھیلے گا۔"

"نہیں امی!"— نسیمہ نے ماں کو ٹوک دیا —"اُس نے میرے ساتھ کبھی ایسی ویسی بات نہیں کی۔"

"تُو بہت دیر بعد پیدا ہوئی تھی نسیمہ!"— ماں نے کہا —"میں تجھ سے بائیس سال پہلے اِس دُنیا میں آئی تھی۔ میں تجھ سے زیادہ خوبصورت تھی۔ مجھے بھی اسی نسل کے منیر ملے تھے۔ میں نے بھی تیری طرح اپنے سینے میں محبت اور عشق کے دیئے جلائے تھے، مگر نسیمہ! اِن دِیئوں نے میرا سینہ جلا دیا۔ دل بھی جل کر راکھ ہو گیا .... اور سُن! اب اپنے دل کا بھید کھول دوں گی تو میرا کیا بگڑ جائے گا۔ اپنی عمر کھا چکی ہوں"— وہ نسیمہ کی طرف جُھکی اور رازدارانہ لہجے میں بولی —"میں جب تیرے ابا کی دُلہن بن کے آئی تھی تو میں کنواری نہیں تھی۔"

نسیمہ نے یوں بدک کر اپنی ماں کے منہ کی طرف دیکھا جیسے اُس کے دل کی دھڑکن رُک گئی ہو۔

"میں تجھے کنواری رخصت کرنا چاہتی ہوں"— ماں نے کہا —"میرے سینے میں نین رانجھے بند تھے۔ سب سلاخیں توڑ کر بھاگ گئے تھے۔ آخر وفا اس سیدھے سادے بُدھو نے کی جو تیرا باپ ہے۔ اسے تو یہ بھی یقین نہیں آتا تھا کہ اتنی حسین لڑکی اس کی دُلہن ہے۔ آج تک میرے آگے بچھا رہا .... بچ میری بچّی، بچ .... صاف بچ کر نکل آ۔"

"لیکن تم یہ کس طرح کہہ سکتی ہو کہ عمر حیات میرے ساتھ شادی کر لے گا؟"— نسیمہ نے پوچھا —"سُنا ہے وہ تو شادی کرنا ہی نہیں چاہتا۔"

"اپنے بچّے کی خاطر"— ماں نے کہا —"وہ شادی کرنا چاہتا ہے لیکن اپنے بچّے کی خاطر اپنی جوانی جلا رہا ہے۔ وہ اپنے بچّے کو سوتیلی ماں کے حوالے نہیں کرنا چاہتا۔ تم ذرا اُس کے قریب ہو کے بیٹھو۔ اپنی محبت کی تپش اُس تک پہنچنے دو۔ پھر دیکھنا وہ کیسے خود ہی تمہیں کہتا ہے کہ نسیمہ، میرے گھر آ جاؤ، میرا آنگن سُونا پڑا ہے۔ تم جیسی خوبصورت لڑکی کے جسم کی تپش پتھر کو پگھلا دیتی ہے۔"

نسیمہ کی بے ساختہ ہنسی نکل گئی۔ پھر وہ قہقہے لگانے لگی۔

"آج تیرے دانت نکل رہے ہیں"— ماں نے پیار بھرے غصّے سے کہا —"کل کوئی ٹھوکر پڑی تو ساری عمر روتی رہے گی .... لعنت بھیج اُس بدمعاش چرسی پر۔ میں نے تیرے لئے وہ آدمی ڈھونڈ لیا ہے جس کے پاس عزت بھی ہے، اچھی شہرت بھی ہے اور دولت بھی۔"

نسیمہ کے چہرے پر ایسا تأثر آ گیا جس سے صاف پتہ چلتا تھا کہ ماں کی باتیں اُس کے دل میں اُتر گئی ہیں۔

❖

نسیمہ کمرے کی تاریکی میں چند ہی مہینے پہلے کے واقعات یوں دیکھ رہی تھی جیسے فلم دیکھ رہی ہو۔ وہ ماں کی باتوں سے متأثر ہو گئی تھی لیکن اپنی پہلی محبت کو دل سے اُتارنا پہاڑ جیسا مشکل نظر آتا تھا اور عمر حیات کو ٹھکرانا بھی اُس کے لئے آسان نہ تھا۔ انسان کوئی اُلٹی سیدھی حرکت کرنا

چاہے تو وہ جواز پیدا کر ہی لیا کرتا ہے۔ نسیمہ کو یاد آ رہا تھا کہ اُس نے بھی منیر کے خلاف جواز تلاش کرنے کی سر توڑ کوشش کی تھی۔ وہ ماں کی باتوں سے متاثر ہو کر یہ سوچنے بیٹھ گئی تھی کہ منیر نے کبھی اُس کے ساتھ کوئی ایسی حرکت کی تھی جس سے پتہ چلتا کہ اُس کی نیت پاک نہیں۔ یاد کرتے کرتے اُسے منیر کی چند حرکتیں یاد آ ہی گئیں۔ انہیں وہ محبت کی دیوانگی سمجھتی رہی لیکن اب اُسے شک ہونے لگا کہ منیر اُسے اُسی جگہ تک پہنچانا چاہتا ہے جہاں اُس کی ماں کو اُس کے کسی چاہنے والے نے پہنچایا تھا۔

آج جب اُس کا خاوند عمر حیات اور سوتیلا بیٹا شوکت ساتھ والے کمرے میں سوئے ہوئے تھے، وہ کمرے کی تنہائی میں یاد کر رہی تھی کہ اُس نے عمر حیات کو تصوروں میں لا کر اُسے ہر پہلو سے دیکھا تھا۔ اُس میں اُسے کوئی نقص اور کوئی عیب نظر نہیں آیا تھا۔ وہ تو سگریٹ بھی نہیں پیتا تھا، اُدھر منیر چرس پیتا اور بدکاری کے لئے شہر جاتا تھا۔ اُس نے اپنے آپ کو عمر حیات کے حق میں قائل کر لیا تھا۔ اگلے ہی روز ماں اُسے اس طرح اپنے ساتھ عمر حیات کے گھر لے گئی تھی جیسے وہ اِدھر سے گزر رہی تھیں اور انہیں عمر حیات کے بچے کو دیکھنے کا خیال آ گیا۔ نسیمہ نے بچے سے بہت پیار کیا تھا۔ پھر اُس نے عمر حیات کی طرف دیکھا تھا۔ عمر حیات کی نگاہیں نسیمہ پر اس طرح جمی ہوئی تھیں جیسے اُس کے وجود میں اُتر رہی ہوں۔ نسیمہ ناتجربہ کار ضرور تھی، بچی نہیں تھی۔ اُس کی سہیلیوں نے اُسے عشق و محبت کی کئی کہانیاں سناتی تھیں۔ وہ عمر حیات کی نظروں کو بھانپ گئی

"امّی!" — نسیمہ نے عمر حیات کے گھر سے نکل کر اپنے گھر کی طرف جاتے ہوئے ماں سے کہا — "معلوم ہوتا ہے عمر مجھے چاہتا ہے۔ میں نے اُس کے ہونٹوں پر بڑی پیاری سی مسکراہٹ دیکھی تھی۔"

نسیمہ کو وہ پہلا ریشمی سوٹ یاد آیا جو عمر حیات نے اُسے اس طرح

دیا تھا کہ جب نسیمہ اُس کے ہاتھ سے سوٹ لے رہی تھی تو اُس نے نسیمہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا تھا۔ اس ملاقات کے وقت عمر حیات نے نسیمہ کو ترسے ہوئے لہجے میں کہا تھا — "پھر آؤ گی نا! .... آجانا۔"

نسیمہ نہ چاہتے ہوئے بھی عمر حیات سے ملتی رہی۔ عمر حیات کا رویّہ ایسا تھا جیسے وہ اپنا گھر نسیمہ پر لٹا دینا چاہتا ہو۔ اُس نے نسیمہ کو پیسے بھی دیئے، کپڑے بھی دیئے اور ایک بار اُسے سونے کی بالیاں بھی بنوا دیں۔ نسیمہ کے ذہن سے منیر کی محبت کا جادو بڑی تیزی سے اترنے لگا مگر ایک روز منیر نے نسیمہ کی ماں کو اس مشکل میں ڈال دیا۔ کہ اُس نے نسیمہ کا رشتہ مانگا۔ اُس نے یہ بھی کہا کہ وہ اپنی ماں کو بھیجے گا۔ نسیمہ کی ماں نے اس معاملے کو وہیں ختم کر دیا۔

"منیر بیٹا!" — نسیمہ کی ماں نے اُسے کہا تھا — "ہم شریف لوگ ہیں۔ تم جانتے ہو تمہاری شہرت کیسی ہے۔ کیا ہندو کیا سکھ کیا مسلمان، سب تمہیں چرسی اور بدمعاش کہتے ہیں۔"

منیر کوئی سیدھا سادا بھلا مانس نہیں تھا۔ وہ اتنی بڑی چوٹ برداشت نہیں کر سکتا تھا۔ اُس نے نسیمہ کی ماں کو صرف ایک بار اور شرافت سے قائل کرنے کی کوشش کی لیکن نسیمہ کی ماں نے یہ سوچ لیا تھا کہ یہ مسئلہ جیسے بھی ہوا ابھی حل ہو جائے۔ اُس نے ایک بار پھر کہا کہ اُس نے اپنی بیٹی کسی چرسی اور جواری کے لئے نہیں پالی۔

"پھر اپنی بیٹی سے کہو کہ اُس نے میرا جو مال کھایا ہے وہ واپس کر دے" — منیر نے بدمعاشوں کے لہجے میں کہا — "میں ایک ایک پائی واپس لوں گا۔"

"کیا وہ رنڈی تھی جس کے کوٹھے پر جاتے رہے ہو؟" — نسیمہ کی ماں نے کہا — "میں جانتی ہوں تجھ جیسے مشٹنڈوں کو۔ مجھے تو یقین ہی نہیں کہ میری بیٹی تمہیں کبھی ملی بھی تھی یا نہیں .... کان کھول کر سُن لے منیرے! وہ کوئی اور ہیں جو تیرے رُعب کے نیچے آجاتے ہیں۔"

نسیمہ کی ماں واہی تباہی بکتی رہی۔ اُسے غالباً معلوم تھا کہ لوگ اکٹھے ہوگئے تو وہ اُسی کا ساتھ دیں گے کیوں کہ وہ عورت ہے۔ منیر کی غلطی تھی کہ اُس نے اس عورت کو گلی میں روک لیا تھا۔

"میرے ساتھ تین پانچ کی تو میں سیدھی تھانے چلی جاؤں گی" — نسیمہ کی ماں نے کہا — "پولیس تجھے جانتی ہے کہ تُو کیا ہے۔"

"لیکن تُو نہیں جانتی کہ میں کیا ہوں" — منیر نے کہا — "میں اپنا کھلایا ہوا مال پورا کر لوں گا۔"

نسیمہ کی ماں منیر کو وہیں کھڑا چھوڑ کر اپنے گھر آگئی۔ اُس نے ہر وہ بات جو اُسے منیر نے اور منیر کو اُس نے کہی تھی وہ نسیمہ کو سُنا ڈالی تھی۔ عورت اُستاد تھی۔ وہ نسیمہ کے دل میں منیر کی نفرت پیدا کرنا چاہتی تھی اس لئے اُس نے کچھ باتیں اپنے پاس سے گھڑ کر نسیمہ کے کان میں ڈال دیں۔

◆◆

آج جب نسیمہ کو عمر حیات کی بیوی بنے تین مہینے سے کچھ دن اوپر ہوگئے تھے اُسے شادی سے پہلے کی یہ باتیں یاد آ رہی تھیں۔ وہ ان باتوں کو یاد نہیں کرنا چاہتی تھی۔ جوگی کے یہ کہنے پر وہ ان باتوں کا تجزیہ کر رہی تھی کہ اُس کی شادی کسی ایسے آدمی کے ساتھ ہونی چاہئے جس کا نام میم سے شروع ہو اور اُس میں نون آئے تو زیادہ اچھا ہو گا۔ جوگی کے اس میم اور نون نے منیر کو اُس کے ذہن میں لا کھڑا کیا تھا۔ یہ کوئی بہت پُرانی بات نہیں تھی۔ چار پانچ مہینے ہی تو ہوتے تھے جس روز منیر اور اُس کی ماں کی یہ ملاقات اور تلخ کلامی ہوتی تھی اُس سے اگلے روز وہ عورت نسیمہ کے پاس آئی جسے منیر پیغام رسانی کے لئے استعمال کیا کرتا تھا۔ اس عورت نے نسیمہ سے کہا کہ منیر اُسے بلاتا ہے۔ نسیمہ نے پہلے تو سوچا کہ ملنے سے انکار کر دے لیکن اُسے یہ خیال بھی آگیا کہ وہ بدمعاش قسم کا آدمی ہے، کچھ اور نہ کر بیٹھے یا اُسے بدنام ہی نہ کر دے۔ اُس نے اس عورت کو جگہ اور وقت بتا کر بھیج دیا۔ پھر ماں سے کوئی

بہانہ کر کے چلی گئی۔ اُس کے دل پر یہ خوف طاری تھا کہ وہ منیر کا سامنا نہیں کر سکے گی۔ وہ اندر سے کانپ رہی تھی، لیکن منیر کے سامنے جاتے ہی منیر نے ایسی بات کہہ دی جس نے نسیمہ کے خون کو گرما دیا۔ آج اُسے منیر کے ساتھ یہ آخری ملاقات یاد آ رہی تھی اور وہ منیر کے ایک ایک لفظ کو یاد کر کے سوچوں میں ڈوبی چلی جا رہی تھی۔

"ماں نے تمہیں کچھ بتایا ہے؟" — منیر نے بڑے رعب سے نسیمہ سے کہا تھا — "وہ تمہاری ماں نہ ہوتی تو گلی میں اُس کی لاش پڑی ہوتی۔ اُس نے میری بہت بے عزتی کی ہے .... اب تم بتاؤ تمہاری کیا مرضی ہے۔"

"میں ماں کے حکم کو نہیں ٹال سکتی" — نسیمہ نے ڈرے ہوتے لہجے میں جواب دیا۔

"کیا شادی کے وہ وعدے جھوٹے تھے؟" — منیر نے پوچھا — "کیا وہ محبت ایک دھوکہ تھی؟"

"تم تو میری ماں کو محبت کی قیمت کا حساب بتاتے رہے ہو" — نسیمہ نے کہا — "تمہارے دل میں میری محبت ہوتی تو یہ نہ کہتے کہ تم نے مجھے مال کھلایا ہے۔"

"اگر تم بھی مجھے اپنی ماں جیسا جواب دو گی تو میں اُس مال کا حساب ضرور کروں گا جو میں نے تم پر لٹایا ہے" — منیر نے کہا۔

"پھر تم کیا کر لوگے؟" — نسیمہ نے پوچھا — "میں گھر سے بھاگ تو نہیں سکتی نہ میں تمہیں وہ مال واپس کر سکتی ہوں جو تم نے مجھ پر لٹایا ہے۔"

"چلو نسیمہ، نہ سہی" — منیر نے صلح صفائی کے لہجے میں کہا — "میں

تمہاری بات مان لیتا ہوں۔ میں تمہارا رشتہ نہیں مانگوں گا۔ تم ایسے کرو
جہاں جی چاہے شادی کر لو۔ کبھی کبھی میرے پاس بھی آجایا کرو۔ میری
محبت کا کچھ تو پاس کرو۔"

"تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ میں تمہاری بے نکاحی بیوی بن جاؤں؟"

"اس میں حرج ہی کیا ہے نسیمہ!" ___ منیر نے دوستانہ لہجے میں کہا
___ "میری تمہاری پہلی ملاقات تو نہیں۔"

یہ تھی وہ بات جس نے نسیمہ کے خون کو ایسا گرمایا کہ اُس کا سر چکرا
گیا۔ اُس کے دانت پسنے لگے۔ اُس کا چہرہ لال سُرخ ہو گیا۔

"میں تجھ پر لعنت بھیجتی ہوں" ___ نسیمہ نے دانت پیس کر دبی
ہوئی مگر تھر سے کانپتی ہوئی آواز میں کہا ___ "لعنت ہے تیری جوانی
پر" ___ وہ اُٹھی اور تیزی سے چل پڑی۔

وہ جب دروازے سے نکل رہی تھی تو اُسے منیر کی آواز سُنائی
دی ___ "پچھتاؤ گی نسیمہ! میں بہت بُرا انتقام لوں گا۔"

آج چار یا پانچ ماہ بعد عمر حیات کے گھر میں نسیمہ کو منیر کی آخری
دھمکی یاد آرہی تھی۔ وہ تو یہ سوچنے کے لئے بیٹھی تھی کہ وہ کون سا آدمی
ہوسکتا ہے جس کا نام میم سے شروع ہوتا ہے اور وہ اُس کے لئے بہتر
خاوند ثابت ہوسکتا ہے۔ اسی سلسلے میں منیر اُس کے ذہن میں آگیا تھا
لیکن اب اُسے منیر کی یہ آخری دھمکی یاد آئی تو اُڑتا ہوا سا ایک خیال
اُس کے ذہن میں آیا کہ بعض لوگ کہتے ہیں کہ اُس کے گھر میں جو پتھر گر
رہے ہیں یہ کالے جادو کے ذریعے بھی گرائے جاتے ہیں، کہیں ایسا تو نہیں
کہ یہ جادو یا تعویذ منیر نے ہی کرا رکھا ہو اور شاید اسی کو وہ بُرا انتقام کہتا
تھا، لیکن یہ خیال جس طرح اُڑتا ہوا اُس کے ذہن میں آیا تھا اسی طرح
اُڑتا ہوا نکل گیا۔ نسیمہ کو یہ خیال بھی آیا کہ وہ منیر سے ملے اور اُس سے
پوچھے لیکن یہ سوچ کر کہ منیر اپنا مطالبہ دوہرائے گا، اُس نے اُس کے

پاس جانے کا ارادہ ذہن سے نکال دیا۔ اُسے یہ خیال بھی آیا کہ اُس
جوگی کے ساتھ منیر کا کیا تعلق ہوسکتا ہے جس نے کہا تھا کہ اُسے موجودہ
خاوند سے طلاق لے لینی چاہیئے۔

یہ سب کچھ سوچنے کے باوجود نسیمہ کے ذہن میں یہ وہم سا موجود رہا
کہ یہ اگر کالا علم ہے تو یہ منیر نے ہی کرایا ہوگا۔

رات گزرتی جا رہی تھی۔ نسیمہ کا دماغ سوچ سوچ کر شل ہو چکا تھا۔
اُس کے کمرے کا دروازہ آہستہ آہستہ کھلا۔ پھر ہلکے ہلکے قدموں کی آہٹ
سنائی دینے لگی۔ نسیمہ ان آہٹوں سے واقف تھی۔ اُس نے سکون کی آہ
بھری۔ خیالوں اور سوچوں کے علاوہ تنہائی بھی اُسے پریشان کر رہی تھی۔
اب وہ تنہا نہیں تھی۔ عمر حیات آرہا تھا۔ نسیمہ لیٹے لیٹے اُٹھ بیٹھی جب
عمر حیات اُس کے پاس بیٹھا تو روکنے کے باوجود نسیمہ کی سسکیاں
نکلنے لگیں۔

"میں موجود ہوں نسیمہ!" ___ عمر حیات نے اُسے اپنے بازوؤں کی
پناہ میں لیتے ہوئے کہا ___ "تمہیں سو بار کہہ چکا ہوں کہ اتنا نہ ڈرو۔
میں بچے کی مجبوری کی وجہ سے دوسرے کمرے میں سوتا ہوں .... اگر
تم تنہائی میں اتنا زیادہ ڈرتی ہو تو کل سے ہم تینوں ایک ہی کمرے میں
سویا کریں گے۔"

"آخر ہوگا کیا؟" ___ نسیمہ نے روتے ہوئے کہا ___ "معلوم نہیں
ہمارا انجام کیا ہوگا۔ آپ نے کوئی اور انتظام تو کیا ہی نہیں۔"

"ایک اور انتظام کر رہا ہوں" ___ عمر حیات نے کہا ___ "تم اُس
آدمی کو جانتی ہو نا! سب اُسے اصلا اصلا کہتے ہیں۔ آج ہی اُس نے
مجھے بتایا ہے کہ وہ ایک آدمی کے پاس گیا تھا جو یہ بتانے کے علاوہ کہ
یہ کیا ہو رہا ہے، اس کا علاج بھی جانتا ہے۔ میں نے اصلے سے کہا ہے
کہ وہ اُس آدمی کو یہاں لے آئے۔ اس آدمی کو بھی آزما لیتے ہیں۔"

نسیمہ کی ماں دو بار مستانے کے ہاں جا چکی تھی لیکن وہ اُسے نہیں ملا تھا۔ اب تیسری بار گئی تو وہ اُسے مل گیا۔ نسیمہ کی ماں نے اُسے بتایا کہ اس طرح وہ کسی کے کہنے پر ایک جوگی کے پاس گئی تھی۔ جوگی نے اُسے جو کچھ بتایا تھا وہ اُس نے مستانے کو سنا ڈالا۔

"پھر میرے پاس کیا لینے آئی ہو؟" — مستانے نے غصے اور بے رُخی سے کہا — "جاؤ اپنی بیٹی کو طلاق دلواؤ، وہ تمہارے گھر میں رہے گی تو وہاں بھی پتھر پڑیں گے۔ جب تک لڑکا غائب نہیں ہو جاتا تمہاری بیٹی اسی مصیبت میں پڑی رہے گی۔ میں تمہیں یہ بتا دیتا ہوں کہ اب جو دورہ لڑکے کو پڑتا ہے وہ تمہاری بیٹی کو پڑنے لگے گا۔ میں نے حساب جوڑ کر دیکھ لیا ہے۔ لڑکا تو دورے میں گر پڑتا ہے لیکن تمہاری بیٹی پر جو دورہ پڑے گا اس میں وہ اپنے کپڑے پھاڑ کر باہر نکل جایا کرے گی اور بے لباس گلیوں میں دوڑتی پھرے گی .... میں تمہیں پھر خبردار کرتا ہوں کہ لڑکے کو غائب کروا دو۔ میں نے اس کے لئے آدھا عمل کر لیا ہے۔ باقی عمل شروع کرنے سے پہلے میں تمہارے ساتھ معاملہ طے کرنا چاہتا تھا۔ تم ہاں کہو اور لڑکا غائب ہو جائے گا۔"

"میں تو ہاں کہہ چکی ہوں۔"

"لیکن یہ کام تھوڑے سے پیسوں میں نہیں ہوگا" — مستانے نے کہا — "کوئی اور ہوتا تو میں دو ہزار روپیہ لیتا لیکن تم میری مریدنی ہو، میں تم سے صرف ایک ہزار روپیہ لوں گا۔"

"ایک ہزار روپیہ!" — نسیمہ کی ماں کا مُنہ کُھل گیا اور اُس کی آنکھوں کے ڈھیلے باہر آنے لگے۔ اُس کے مُنہ سے سسکی سی نکلی — "ایک ہزار روپیہ تو شاید کسی ساہوکار کی تجوری میں ہوگا۔ میں تو شاید ایک سو روپیہ بھی نہ دے سکوں .... سائیں جی! کچھ رحم کریں۔ یہ آپ کے ہاتھ کا کھیل ہے۔"

"یہ میرے ہاتھ کا کھیل ہوتا تو خدا کی قسم، ایک پیسہ نہ لیتا" — مستانے نے کہا — "اس کام کے لئے ایک کنواری لڑکی کی کھوپڑی کی ہڈی کی

ضرورت ہوتی ہے۔ میں نے دو آدمیوں کو پانچ سو روپیہ نقد دیا ہے کہ وہ اِدھر اُدھر نکل جائیں اور جہاں کہیں کوئی کنواری ہندوانی مرے اور اُس کی لاش جلائی جائے تو اُس کی کھوپڑی کی ہڈی لے آئیں۔ یہ کام آسان نہیں۔ تمہیں شاید معلوم نہیں کہ ہندو جب اپنے کسی مُردے کو جلاتے ہیں تو رات بھر دو تین چار اسی قسم کے آدمی وہاں بیٹھے رہتے ہیں۔ وہ منہ مانگے پیسے لے کر ہڈی دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی مجھے کچھ اور چیزوں کی ضرورت ہے۔ وہ چیزیں بازار سے نہیں ملتیں۔ زندہ بچھو کون مُفت پکڑ کر لا سکتا ہے۔ میرے لئے تو اس ایک ہزار میں سے دو چار روپے ہی بچیں گے۔ وہ کہتی ہو تو وہ میں تمہیں چھوڑ دیتا ہوں۔"

نسیمہ کی ماں سر جُھکا کر یوں بیٹھ گئی جیسے وہ ہمت ہار بیٹھی ہو۔ ایک ہزار روپیہ معمولی رقم نہیں تھی۔ ایک ہزار روپے میں دو منزلہ مکان تعمیر ہو جایا کرتا تھا۔ مستانے نے اُس کا سر اُوپر اُٹھایا تو دیکھا کہ نسیمہ کی ماں کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے" — مستانے نے تسلی آمیز لہجے میں کہا — "تمہارا داماد ایک ہزار روپیہ دے سکتا ہے۔ اپنی بیٹی کا زیور گروی رکھ کر قرض لے سکتی ہو، میں تمہیں ایسی چیز دوں گا جسے تم اپنے گھر میں رکھو گی تو تمہیں پتہ ہی نہیں چلے گا کہ قرض کس نے ادا کر دیا ہے۔"

"لیکن سائیں جی!" — نسیمہ کی ماں نے رندھی ہوئی آواز میں کہا — "باپ اس کام کے لئے تو ایک ہزار روپیہ نہیں دے گا کہ اُس کے بیٹے کو غائب کر دیا جائے۔"

"اُسے ہم یہ تھوڑا ہی بتائیں گے کہ اُس کے بیٹے کو غائب کرنا ہے" — مستانے نے کہا۔

"نہیں سائیں مستانہ جی، نہیں" — نسیمہ کی ماں نے اپنے سر کو زور زور سے ہلاتے ہوئے کہا — "ایک ہزار روپیہ لانا میرے بس کی بات نہیں۔"

مستانہ گہری سوچ میں کھو گیا۔ نسیمہ کی ماں چپ چاپ اُسے دیکھتی رہی۔

"پھر ایک کام کرو" — مستانے نے اُسے رازدارانہ لہجے میں کہا — "اپنی بیٹی کو میرے پاس بھیج دو۔ ایک پیسہ نہیں لوں گا۔"

نسیمہ کی ماں پہلے سے زیادہ حیرت زدہ نظروں سے مستانے کو دیکھنے لگی۔

"سوچتی کیا ہو؟" — مستانے نے کہا — "وہ شادی شدہ لڑکی ہے۔"

"سائیں جی!" — نسیمہ کی ماں نے کہا — "آپ کے متعلق تو یہ مشہور ہے کہ عورت ذات کے ساتھ آپ دلچسپی نہیں رکھتے۔"

"ہم تو کھانے پینے میں بھی دلچسپی نہیں رکھتے" — مستانے نے مستانہ سی آواز میں کہا — "تم ہر بات کو اپنی دنیا کے رنگ میں دیکھتی ہو، ہماری دُنیا کے رنگ کچھ اور ہیں۔ تم اپنی بیٹی کی مصیبت کی سوچو، ہم سے اُلٹی سیدھی باتیں نہ پوچھو۔ ہم جو کہتے ہیں وہ کرو، تمہارا کام ہو جائے گا۔ جاؤ اپنی بیٹی کو یہاں بھیج دو۔"

◆

ماں نے جب نسیمہ کو مستانے کی باتیں سُنا کر اُس کا مطالبہ بتایا تو نسیمہ پر خاموشی طاری ہو گئی۔

"کوئی بات نہیں بیٹی!" — ماں نے اُسے کہا — "اگر تم اُس کے پاس نہیں جانا چاہتیں تو ایک ہزار روپے کا انتظام کر دو۔"

"میں اتنی زیادہ رقم خاوند سے نہیں لے سکتی" — نسیمہ نے کہا — "خاوند کو بتائے بغیر میں اپنا زیور بھی نہیں دے سکتی۔ رہا سوال میرے وہاں جانے کا تو شاید میں نہ جا سکوں۔"

"نسیمہ!" — ماں نے کہا — "تیرا کیا جاتا ہے۔ ایک درویش کا من راضی ہو گیا تو نہ جانے ہمیں کیا کچھ دے دے۔ وہ سنا نہیں تم نے، وہ ہندوؤں سکھوں کے محلے میں ایک آدمی رہتا ہے۔ کبھی چھابڑی لگاتا تھا۔ اب وہ کپڑے کا تھوک بیوپاری ہے۔ کہتے ہیں غربت کے زمانے میں اُس نے ...."

"امی!" — نسیمہ نے اُس کی بات پوری نہ ہونے دی۔ بولی — "اس بچے کو غائب کراتا ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ بچہ غائب ہو جائے پھر بھی ہم پر پتھر پڑتے رہیں اور آگ لگتی رہے .... مجھے تو یہی ایک بات سمجھ نہیں آ رہی کہ جوگی کہتا ہے کہ ہماری مصیبت کے ساتھ بچے کا کوئی تعلق نہیں اور مستانہ کہتا ہے کہ سارا قصور بچے کا ہے۔ کون یقین سے کہہ سکتا ہے کہ دونوں میں کون سچا ہے۔"

نسیمہ کی ماں کی دلچسپی ایک تو یہ تھی کہ اُس کی بیٹی مصیبت میں پھنسی ہوئی تھی اور دوسری دلچسپی عمر حیات کے مال و دولت اور اُس کی جائیداد کے ساتھ تھی۔ اُس کی نگاہ میں عزت اور عصمت کی کوئی اہمیت نہیں تھی۔ نسیمہ کا کردار اتنا بلند تو نہیں تھا لیکن وہ ماں کی باتوں میں آ کر مستانے کا مطالبہ پورا کرنے پر آمادہ نہیں ہو رہی تھی۔ ماں بُری طرح اُس کے پیچھے پڑی ہوئی تھی۔

"مجھے ذرا سوچنے دو امی!" — نسیمہ نے کہا — "اگر میں نے اپنی عصمت یوں راستے میں رکھی ہوئی ہوتی تو منیر کے ساتھ میرے تعلقات کچھ اور ہوتے۔ دو تین دن دیکھنے دو کیا ہوتا ہے۔"

◆

اُصلا حسنین کاظمی کو لے آیا۔ حسنین کاظمی نے تھانیداروں کی طرح پہلے عمر حیات کو الگ بٹھا کر تفتیش شروع کر دی۔ وہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ عمر حیات کی کسی کے ساتھ دشمنی تو نہیں۔ عمر حیات اُکتا گیا۔

"کاظمی صاحب!" — عمر حیات نے جھنجھلا کر کہا — "اس معاملے میں میری دشمنی اور دوستی کا کوئی عمل دخل نہیں۔ یہ جنات کی کارروائی ہے۔"

"ملک صاحب!" — حسنین کاظمی نے کہا — "جنات کو ذہن سے نکال دیں اور ہر کسی کی باتوں میں آنا چھوڑ دیں۔ اگر آپ میری ان باتوں کو تسلیم کر لیں تو میں آگے بڑھتا ہوں۔ میں پیروں اور عاملوں وغیرہ کی طرح کاروباری آدمی نہیں ہوں" — اُس نے عمر حیات کے ساتھ وہی باتیں کیں جو اُس نے اُصلے کے ساتھ کی تھیں۔

"کاظمی صاحب!" — عمر حیات نے کہا — "میں ہر کسی سے ایک ہی بات کہتا ہوں کہ میرا یہ مکان جل جائے، میرے بچے کے یہ دَورے ختم ہو جائیں۔"

"بچے کے دَورے ختم ہو گئے تو نہ پتھر پڑیں گے نہ کہیں آگ لگے گی" — حسنین کاظمی نے کہا — "یہ بڑا گہرا اور بہت وسیع علم ہے۔ آپ صرف یہ سمجھ لیں کہ سنگباری اور آتش زنی کے لئے بچے کو ذریعہ یا آلۂ کار بنایا گیا ہے۔ اگر بچے پر اس سفلی عمل کا اثر نہ ہو تو اس گھر میں نہ پتھر گریں نہ کہیں آگ لگے۔"

"کیا آپ معلوم کر سکتے ہیں کہ یہ کون کر رہا ہے؟" — عمر حیات نے پوچھا۔

"آپ کا یا آپ کی بیگم کا کوئی دشمن" — حسنین کاظمی نے جواب دیا — "میں آپ سے یہی معلوم کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں اِن سے پوچھوں گا۔ اس کے سوا یہ معلوم کرنے کا کہ یہ کون کر رہا ہے کوئی ذریعہ نہیں۔"

وہ نسیمہ کو کمرے میں لے گیا اور پوچھنا شروع کر دیا۔ ہر سوال کا جواب نسیمہ سوچ سمجھ کر دیتی تھی۔ وہ کوئی ایسا اشارہ نہ دے سکی جس سے پتہ چلتا کہ اُس کی کسی کے ساتھ دشمنی ہے۔

"نسیمہ بی بی!" — حسنین کاظمی نے کہا — "اگر اس جہنم سے نجات چاہتی ہو تو مجھ سے کچھ نہ چھپاؤ.... ملک صاحب سے پہلے تمہارا رشتہ کسی اور نے مانگا ہوگا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ تمہارے ماں باپ کی بجائے تم نے جواب دیا ہو کہ تمہیں وہ آدمی پسند نہیں۔"

"میں آپ کی بات سمجھ گئی ہوں" — نسیمہ نے کہا — "لیکن میں کیسے مان لوں کہ آپ میرا راز چھپا کر رکھیں گے؟"

"مجھے تمہارا راز فاش کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟" — حسنین کاظمی نے کہا — "مجھے تم سے کیا لینا ہے!

میں اُن لوگوں کو جو کہتے ہیں کہ جن بھوت پتھر پھینکتے ہیں، جھوٹا ثابت کرنا چاہتا ہوں .... مجھے کوئی راز دو۔ اسے میں اپنے ذہن سے نکال دوں گا۔"

نسیمہ نے اُسے منیر کے ساتھ اپنی محبت، اُس کی آخری ملاقات اور دھمکی کی تفصیل سنا دی۔

"وہ کس قسم کا آدمی ہے؟"

"اچھے اخلاق کا آدمی نہیں" — نسیمہ نے اُسے بتایا — "اُس کا دوستانہ ہر قسم کے لوگوں کے ساتھ ہے۔"

"ملک صاحب!" — حسنین کاظمی نے عمر حیات اور نسیمہ سے کہا — "بچے کو اس گھر سے ہٹا دیں۔ اسے کہیں اور رکھیں۔"

"میرا ایسا کوئی رشتہ دار نہیں جس کے ہاں میں اپنے بچے کو رکھوں" — عمر حیات نے کہا — "میرے قریبی رشتہ دار موجود ہیں لیکن ان سب کے تعلقات میرے ساتھ کشیدہ ہیں۔ یہ ہو سکتا ہے کہ میں بیوی اور بچے کو کہیں اور لے جاؤں۔"

"نہیں" — حسنین کاظمی نے کہا — "میں چاہتا ہوں کہ آپ دونوں یہیں رہیں، بچہ خواہ پڑوس میں چلا جائے، پھر دیکھیں کہ پتھر آتے ہیں یا نہیں۔"

پڑوسیوں کے ہاں بچے کو رکھا جا سکتا تھا لیکن پہلے ہی پڑوسی سے بات ہوئی تو اُس نے صاف جواب دے دیا۔ محلے میں کوئی بھی بچے کو تھوڑی سی دیر کے لئے بھی اپنے گھر رکھنے کے لئے تیار نہ ہُوا۔ سب جنوں کے قہر سے ڈرتے تھے۔

"اسے میرے حوالے کر دیں" — حسنین کاظمی نے کہا — "آپ دن میں ایک دو مرتبہ اس کے پاس آجایا کریں۔ میں اسے دس بارہ دن اپنے پاس رکھوں گا۔ اس کی غیر حاضری میں آپ کا گھر پتھروں اور آگ سے محفوظ رہے گا۔"

"یہ جب واپس آئے گا تو میرے گھر میں پھر وہ آفت آجائے گی"
— عمر حیات نے کہا۔

"اس پر کوئی سفلی عمل اثر نہیں کر سکے گا" — حسنین کاظمی نے کہا — "اگر آپ چاہیں تو ابھی بچے کو میرے ساتھ بھیج دیں۔"

"ایک دو دنوں بعد میں خود ہی اسے لے آؤں گا" — عمر حیات نے کہا — "بچے کو ذہنی طور پر تیار کرنا پڑے گا۔ ان دَوروں نے اِسے اتنا خوفزدہ کر رکھا ہے کہ یہ مجھے کام پر بھی نہیں جانے دیتا۔"

"یہ آپ کے سوچنے کا مسئلہ ہے" — حسنین کاظمی نے کہا — "میں آپ کو یہ یقین دلاتا ہوں کہ یہ سفلی عمل ہے۔ جنّ پتھر نہیں مارا کرتے۔ وہ صرف ایک دو کپڑوں کو آگ نہیں لگایا کرتے .... بہرحال آپ کے گھر کے ساتھ جنّوں کی کوئی دلچسپی نہیں۔ میں جو بات آج کہہ رہا ہوں، کل بھی یہی کہوں گا، سال بعد بھی یہی کہوں گا۔ یہ میرا ذریعہ معاش نہیں، ایک جنون ہے جو مجھے اس علم کی گہرائیوں میں لے جا رہا ہے۔ میں کسی کے گھر نہیں جایا کرتا نہ میں اس قسم کے کیس ہاتھ میں لیتا ہوں۔ یہ لڑکا شرف الدین جسے سب اُصلا کہتے ہیں، میرے پاس نہ آتا تو میں آپ کے ہاں نہ آتا۔ اُصلے کو میں جانتا ہوں۔ اسے لوگ پگلا کہتے ہیں لیکن اس میں وہ ذہانت ہے جو عام لوگوں میں نہیں ہوتی۔ لوگ اپنے بنائے ہوئے توہمات اور بے بنیاد عقیدوں سے دستبردار نہیں ہونا چاہتے۔ انہیں جو کوئی حقیقت سے آگاہ کرے گا، اُسے وہ پگلا کہیں گے۔ مجھے یہ دیکھ کر بہت دُکھ ہوتا ہے کہ مسلمانوں نے ہندوؤں کی توہم پرستی کو قبول کر لیا ہے۔ آپ کبھی اللہ کے کلام کا کرشمہ آزما کر دیکھیں۔"

"آپ کچھ بتائیں" — نسیمہ نے کہا — "ہماری راہنمائی کریں۔ اس وقت تو ہماری یہ حالت ہے کہ خوف سے ہمارے دماغ ماؤف ہو چکے ہیں۔ ذرا سی آہٹ ہوتی ہے تو ہم کانپ اُٹھتے ہیں کہ آئے پتھر۔ ہر طرف ہمیں جنّ اور چڑیلیں نظر آتی ہیں اور ...."

"اور آپ کو اللہ نظر نہیں آتا" — حسنین کاظمی نے کہا — "اللہ کو یاد کریں، صبح سویرے تلاوتِ قرآن کیا کریں۔ یہ سوچنے کی بجائے کہ آپ کے گھر میں جنّات ہیں، دل میں یہ یقین پیدا کریں کہ گھر میں اللہ کی ذات بھی ہے۔ آپ لوگوں کی باتیں سُننے کی بجائے اللہ کی باتیں کیوں نہیں سُنتے؟ .... میری ان باتوں کو وعظ نہ سمجھنا۔ اتنے خوفزدہ نہ ہوں۔ یہ سلسلہ چند دنوں بعد رُک جائے گا۔ اگر لڑکا اس گھر سے کچھ دن غیر حاضر رہے تو آپ کو جلدی نجات مل جائے گی .... میں آپ کی خدمت کے لئے ہر وقت موجود ہوں۔ جب چاہیں میرے پاس آجائیں۔ مجھے آپ سے کچھ لینا دینا نہیں۔"

حسنین کاظمی اُصلے کے ساتھ چلا گیا۔

"کچھ سمجھ آتی ہے کاظمی صاحب؟" — اُصلے نے پوچھا۔

"کچھ کچھ پلّے پڑا ہے" — حسنین کاظمی نے کہا — "بچہ بہت خوبصورت ہے۔ اگر لوگ یہ کہتے ہیں کہ کوئی جنّ اس بچے پر عاشق ہو گیا ہے تو ماننے کو جی چاہتا ہے لیکن ایسا نہیں ہوتا۔ لوگ بے سمجھ ہیں، اس قسم کی باتیں مان لیتے ہیں۔ میرا شک یہ ہے کہ جو کچھ ہو رہا ہے اس لڑکی کی خاطر ہو رہا ہے۔"

"کیا آپ اس گھر کو اپنے عمل کے ذریعے محفوظ نہیں کر سکتے؟"
— اُصلے نے پوچھا۔

"مجھے تجربہ نہیں" — حسنین کاظمی نے کہا — "میرے پاس علم ہے، عمل نہیں۔ اپنے ایک اُستاد کے پاس جاؤں گا بہت دُور رہتا ہے۔ ریل گاڑی کا چار گھنٹے کا سفر ہے۔"

"آپ وہاں جائیں" — اُصلے نے کہا — "میں ملک عمر حیات سے کہوں گا۔ وہ آپ کے ساتھ چلا جائے گا .... کاظمی صاحب! مجھے ان لوگوں کے ساتھ دلچسپی ہے یا نہیں، یہ الگ بات ہے، میری اصل دلچسپی یہ ہے کہ میں لوگوں کو دکھانا چاہتا ہوں کہ یہ کسی کی بدمعاشی ہے اور یہ جنّات کی کارستانی نہیں۔ میں مسجد کے امام صوفی کو شرمندہ کرنا

چاہتا ہوں جس نے ان لوگوں سے کہا کہ یہ جنّات کا قہر ہے۔ کاظمی صاحب! اس صوفی نے عمر حیات کی مجبوری اور مظلومیت سے یہ فائدہ اُٹھایا ہے کہ اپنے شاگردوں کا پورا گروہ ساتھ لے آیا اور ختمِ قرآن کے بہانے کھا پی گیا۔ پھر ایک پیر آیا اور اس کے بعد ایک سائیں مستانہ آیا اور لوگ جو باتیں کر رہے ہیں، وہ ایک سے ایک بڑھ کر نرالی ہیں۔"

"انہیں قائل کرو کہ بچّے کو میرے پاس چھوڑ جائیں" ـــ حسنین کاظمی نے کہا ـــ "اس کا فوری علاج تو یہی ہے، باقی بندوبست میں خود کر لوں گا" ـــ وہ چپ ہو گیا اور چلتے چلتے رُک کر ایک ہاتھ اصلے کے کندھے پر رکھ دیا۔ جذباتی سے لہجے میں بولا ـــ "اصلے بھائی! ملک عمر حیات کا بچّہ بہت پیارا ہے" ـــ اُس کی آہ نکل گئی۔ کہنے لگا ـــ "میں نے اسی پر صبر کر لیا تھا کہ خدا مجھے ایک بھی بچّہ نہیں دے گا لیکن آج اس بچّے کو دیکھ کر میرے اندر اولاد کی محرومی کا احساس بڑی شدّت سے پیدا ہُوا ہے بلکہ میں اس محرومی کی تلخی سی محسوس کرنے لگا ہوں۔ ایک اَن ہونی سی بات دل میں آتی ہے کہ ملک سے کہوں کہ اپنا بچہ مجھے دے دے، جوان ہو جاتے گا تو واپس کر دوں گا۔"

"نہ جی!" ـــ اصلے نے کہا ـــ "باپ اپنا بچّہ نہیں دے گا۔"

"میں تمہیں ایک اور بات بتاؤں؟" ـــ حسنین کاظمی نے کہا ـــ "ملک عمر حیات کہتا ہے کہ بچّہ اُس کے بغیر نہیں رہے گا۔ میں بچّے کو ہپناٹائز کر کے اپنے ساتھ لے جا سکتا ہوں لیکن اتنے پیارے بچّے کو ہپناٹائز نہیں کرنا چاہتا۔ مزہ تو جب ہے کہ بچہ میری محرومی اور میری محبت کو سمجھے اور پیار کا جواب پیار سے دے" ـــ وہ یکلخت جذباتی کیفیت سے نکل آیا اور بولا ـــ "تم میرے پاس آتے رہنا۔"

❖

وہ جوگی جس نے نسیمہ کی ماں کو بتایا تھا کہ نسیمہ کو عمر حیات سے طلاق لے لینی چاہیئے اور اُس کی شادی ایسے آدمی کے ساتھ ہونی

چاہیئے جس کا نام میم سے شروع ہو، اپنی گُف میں بیٹھا تھا۔ دو آدمی آئے اور اُس کے سامنے بیٹھ گئے۔ لباس سے یہ دونوں دیہاتی لگتے تھے۔ اُن کے سروں پر پگڑیاں اس طرح بندھی ہوتی تھیں کہ گردنیں اور چہرے بھی پگڑیوں میں لپٹے ہوتے تھے۔ اُن کی صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ ایک کے ہاتھ میں کلہاڑی تھی جو اُس نے اپنے اور جوگی کے درمیان رکھ دی۔ دوسرے نے اپنے کپڑوں کے اندر ہاتھ ڈالا اور نصف گز لمبی نیام نکال کر اپنے سامنے رکھ لی۔ ڈیڑھ فٹ لمبی خنجر نما تلوار کا دستہ نیام سے باہر نظر آ رہا تھا۔

دونوں آدمیوں کی آنکھیں جوگی کے چہرے پر جم گئی تھیں۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ وہ اچھے ارادے سے نہیں آئے۔ اُن کا انداز دیکھ کر جوگی پر بھی خاموشی طاری رہی۔

"کچھ مُنہ سے بولو" ـــ جوگی نے کہا ـــ "کیوں آئے ہو؟"

"یہ بتانے آئے ہیں کہ یہ ولایت سائیں مستانے کی ہے" ـــ ایک آدمی نے کہا۔

"سائیں مستانے کو جانتے ہو؟" ـــ دوسرے آدمی نے پوچھا۔

جوگی نے باری باری دونوں کی آنکھوں میں جھانکا۔ اُس کی اپنی آنکھوں میں اب حیرت تھی۔

"میں نے کسی سائیں کی ولایت میں دخل نہیں دیا" ـــ جوگی نے کہا۔

"تمہارے ہاتھ میں کچھ ہے؟" ـــ ایک آدمی نے پوچھا۔

"کچھ طاقت ہے ہاتھ میں؟" ـــ دوسرے نے پوچھا۔

"بات ذرا صاف کرو" ـــ جوگی نے دھیمی آواز میں کہا۔

"صاف بات یہ ہے" ـــ ایک آدمی نے جوگی کی طرف جھک کر آہستہ سے کہا ـــ "تمہارے پاس شہر کی ایک عورت آتی تھی۔ اُس کی بیٹی کے گھر پتھر پڑتے ہیں ...."

"اور کپڑوں کو آگ لگتی ہے" ——— جوگی نے اُس کی بات پوری کرتے ہُوئے کہا ——— "میں نے اُس سے کچھ بھی نہیں لیا"

"تم نے کچھ لیا ہے یا نہیں" ——— دوسرے آدمی نے کہا ——— "سائیں مستانہ پوچھتا ہے کہ تم نے کب سے یہ کاروبار شروع کیا ہے؟ اور وہ کہتا ہے کہ یہی کام کرنا ہے تو یہاں سے چلے جاؤ .... اگر یہ عورت پھر کبھی آجائے تو اسے کہہ دو کہ تم کچھ نہیں جانتے"

جوگی کے چہرے پر خوف اور مرعوبیت کے آثار نظر آنے لگے۔

"مستانہ سائیں سے کہنا کہ مجھے یہاں سے چلے جانے کی ضرورت نہیں" ——— جوگی نے کہا ——— "میں ایسا کاروبار نہیں کرتا۔ اس عورت کو کسی کے کہنے پر یہ باتیں کہی تھیں"

"کس کے کہنے پر؟"

"میں تمہیں اپنا ہر ایک راز تو نہیں بتا سکتا" ——— جوگی نے کہا۔

"تمہیں بتانا پڑے گا" ——— ان دو میں سے ایک آدمی نے کہا ——— "اس عورت کے ساتھ سائیں مستانے کا خاص تعلق ہے .... تمہارے لئے بہتر یہی ہے کہ ہم جو پوچھتے ہیں وہ بتا دو۔ اگر نہیں بتاؤ گے تو ...." اُس نے خنجر نما تلوار کی نیام پر ہاتھ رکھا اور جوگی کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

"ہم کوئی دھمکی دینے نہیں آئے" ——— دوسرے نے کہا ——— "ہم بغیر دھمکی کے اپنا راستہ صاف کرنا جانتے ہیں"

جوگی نے یوں سر کو جنبش دی جیسے اُس نے شکست تسلیم کر لی ہو۔ دونوں آدمی اُٹھے اور اُسے گھورتے ہُوئے گُف سے نکلے اور چلے گئے۔ جوگی کے تین بالکے اُس کے پاس آ بیٹھے اور پوچھنے لگے کہ یہ آدمی کون تھے اور کیا کہتے تھے۔

"میں جوابی وار کرنا تو نہیں چاہتا تھا" ——— جوگی نے کہا ——— "لیکن اس مستانے کا کوئی بندوبست کرنا پڑے گا"

"تو یہ آدمی مستانے نے بھیجے تھے؟" ——— ایک بالکے نے طنزیہ کہا ——— "نہیں بتاؤ تو، کیا کہا ہے اُس نے؟"

جوگی نے انہیں بتا دیا۔ بالکوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک نے کہا ——— "فکر نہ کرو استاد! اگر ٹکر لینی ہے تو لینی ہی ہے۔ مستانہ ہمارا کیا بگاڑ سکتا ہے"

اُدھر نسیمہ کی ماں نسیمہ کے گھر آئی بیٹھی تھی۔ نسیمہ اُسے سُنا چکی تھی کہ حسنین کاظمی نام کا ایک دانشمند عامل آیا تھا۔ نسیمہ نے ماں کو وہ ساری باتیں سُنائیں جو حسنین کاظمی اُنہیں بتا گیا تھا۔

"پھر بات بچے پر ہی آئی نا!" ——— نسیمہ کی ماں نے کہا ——— "یہ تو سائیں مستانے نے پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ ہوگا وہی جو سائیں مستانے نے کہا ہے"

"تم میری بات نہیں سمجھیں امّی!" ——— نسیمہ نے کہا ——— "مستانہ کہتا ہے کہ بچے کو بالکل ہی غائب کر دو لیکن اس بزرگ عامل نے کہا ہے کہ بچے کو چند دنوں کے لئے کسی اور جگہ رکھو"

"تُو بھی بچی ہے نسیمہ!" ——— نسیمہ کی ماں نے کہا ——— "میں تیرے پاس کسی اور کام کے لئے آئی ہوں۔ سائیں مستانے نے مجھے بُلایا تھا۔ میں اُسے مل کر آرہی ہوں۔ اُس نے کہا ہے کہ وہ آدھا عمل کر چکا ہے۔ اگر اس عمل کو اُدھورا چھوڑا گیا تو تمہارے لئے بہت نقصان دہ ہوگا۔ وہ کہتا ہے کہ اپنی بیٹی کو میرے پاس بھیجو۔ وہ سَودا بازی تمہارے ساتھ کرے گا۔"

نسیمہ نے ماں کو ٹیڑھی سی آنکھوں سے دیکھا اور آہ بھر کر نظریں پھیر لیں۔

ماں تو نسیمہ سے یہ کہہ کر چلی گئی کہ وہ سائیں مستانے کے پاس چلی جاتے ورنہ اُسے بہت نقصان پہنچے گا لیکن نسیمہ کو یوں دھچکہ لگا جیسے اُس کی ذات میں اُسی طرح پتھر گرنے لگے ہوں جس طرح اُس کے گھر میں گرتے تھے۔ اُس نے اپنے وجود کے اندر سے اُٹھتی ہوئی بدبُو محسوس کی جیسے کچھ جل رہا ہو۔

اندر کی آگ باہر آگئی اور وہ سرتاپا جلنے لگی۔ اُسے یوں لگا جیسے اُس کی ماں اُسے شعلوں میں پھینک گئی ہو۔ ایک ہی بار اُس کے ذہن میں کئی سوال آگئے۔

"کیا ماں کو میرے خاوند کی جائیداد کے ساتھ ہی دلچسپی ہے؟"

"کیا وہ میرے خاوند کے بیٹے کو اس لئے غائب کرانا چاہتی ہے کہ وہ جائیداد کا وارث ہے یا اس لئے کہ میں اس سنگ باری اور آگ سے محفوظ ہو جاؤں؟"

"ان میں سچّا کون ہے؟ .... سائیں مستانہ؟ .... جوگی؟ .... جسنین کاظمی؟"

"کس کی مانوں؟"

"اپنی عصمت کی قربانی دے دوں؟ .... پھر کیا ہوگا؟"

سوال آپس میں اُلجھ کر گُچھا بنتے چلے گئے اور وہ سوالوں اور خیالوں کے شور و غل سے گھبرا گئی۔ اُسے ایسے لگا جیسے اُس کی ذات میں قتل و غارت ہو رہی ہو، خون خرابہ ہو رہا ہو، کربناک چیخیں اُٹھ رہی ہوں۔

نسیمہ پر خوف طاری ہونے لگا، پھر خوف کی گرفت مضبوط ہونے لگی۔ یہ گرفت بڑی ہی بے رحم تھی۔ خوف تیزی سے بڑھنے لگا اور بڑا ہی ڈراؤنا واہمہ بن گیا۔ اُسے اپنے اردگرد جنّ اور چڑیلیں ناچتی دکھائی دینے لگیں۔ اُس کے گھر میں پتھر گرتے تھے، کپڑوں اور لوٹوں کو اپنے

آپ آگ لگ جاتی تھی۔ اس دوران اتنے خوبصورت بچّے کو جب دَورہ پڑتا تھا تو بچّے کا چہرہ تشنّج سے کسی جنّ کے چہرے جیسا ہو جاتا تھا۔

نسیمہ یوں محسوس کرنے لگی جیسے اُسے کسی نے اندھیرے غار میں دھکیل دیا ہو اور اس تاریکی میں اُسے بہت سی آنکھیں چمکتی اور اپنے اِردگرد پھرتی نظر آتی ہوں۔

اُس نے مسجد کے امام سے پناہ مانگی تھی، ایک پیر سے پناہ مانگی تھی، سائیں مستانے سے پناہ مانگی تھی، کئی اور آئے تھے۔ نسیمہ نے ہر ایک کو رحم طلب نگاہوں سے دیکھا تھا اور وہ رو بھی پڑی تھی مگر سب دھوکہ اور فریب تھا۔ اُسے مولوی اور مستانہ ایک ہی صف میں، ایک ہی سطح پر کھڑے نظر آئے۔ ایک نے قرآن کی آیت پڑھ کر دھوکہ دیا، دوسرا چرس کے کش لگا کر آیا۔ پیر کا آستانہ اور جوگی کی گُف مِل کر ایک تاریک غار بن گئے ــــ اور آج نسیمہ کا دل کبھی ڈوب جاتا، کبھی اتنی تیزی سے دھڑکنے لگتا کہ اچھل کر حلق میں آجاتا۔

بیٹی کی مُونس و غمخوار ماں ہُوا کرتی ہے۔ نسیمہ کی تو اپنی ماں کے ساتھ ہمراز سہیلیوں جیسی بے تکلفی اور محبت تھی۔ ماں نے تو اُسے اپنا یہ راز بھی دے دیا تھا کہ اُس کی جب شادی ہوئی تو وہ کنواری نہیں تھی۔ نسیمہ کے لئے ماں ہی ماں تھی۔ باپ تو نام کا باپ تھا۔ نسیمہ کی ماں کی نظر میں نسیمہ کے باپ کی وقعت اتنی سی ہی تھی کہ وہ اُس کا خاوند تھا اور یہ بھی کہ کنبے میں ایک خاوند کا ہونا لازمی ہوتا ہے۔ خواہ وہ مٹّی کا مادھو ہی ہو۔ نسیمہ کے باپ نے اُس کی ماں کے خاوند کا خانہ پُر کر رکھا تھا۔

نسیمہ کو ماں کے گھر ہی پناہ ملا کرتی تھی۔ وہی اُس کے دُکھ سُکھ کی ساتھی تھی مگر ماں اُسے کہہ رہی تھی کہ سائیں مستانے کے پاس چلی جاؤ۔ ماں نے کہا تھا ــــ "وہ تمہارے ساتھ سودا کرے گا۔"

"کیسا سودا؟"

"عمر حیات کے بچّے کو غائب کرنے کا سودا؟"

نسیمہ بچی نہیں تھی۔ جانتی تھی یہ سَودا کیسا ہوگا۔ ہیبت اور خوف
سے وہ کانپ رہی تھی۔ وہ سائیں مستانے کو تصوّر میں لاتی ــ یہ ایک
جن کا چہرہ تھا ــ کسی اچھے بھلے انسان کا بگڑا ہُوا، مسخ کیا ہُوا چہرہ
ــ اس چہرے پر جو آنکھیں تھیں، وہ گوشت کی طرح سرخ تھیں اور
نتھنے پھنکار رہے تھے۔ اس پھنکار میں تعفّن تھا۔ اس چہرے کے ہونٹوں سے
رال ٹپک رہی تھی۔

سائیں مستانہ بھُوت بن گیا۔ نسیمہ نے کبھی جن نہیں دیکھا تھا، کبھی
بھُوت نہیں دیکھا تھا، کبھی چڑیل نہیں دیکھی تھی لیکن اُس کی ذات سے جیسے
آواز اُٹھی ہو ــ "سائیں مستانہ جن ہے، بھُوت ہے چڑیل ہے۔"

سائیں مستانہ خوف کی علامت بن گیا ــ اور خوف اس قدر بڑھا کہ
نسیمہ کے آنسو بہنے لگے۔ اُس کے جسم کا لرزہ تیز ہوگیا۔ اُس پر ڈوبنے کی
کیفیت طاری ہوگئی جیسے وہ سیاہ کالے پانی میں ڈوب رہی ہو اور وہ
ہاتھ پاؤں مار رہی ہو۔ اس کیفیت میں ایک تنکا بھی اُس کے ہاتھ آ
جاتا تو وہ اُسے دیوتا سمجھ لیتی، اُسے اللہ کا ہاتھ سمجھ لیتی مگر وہاں کوئی
نہ تھا۔

"نسیمہ!" ــ اُس نے سرگوشی سی سُنی اور اپنے سر پر کسی کا ہاتھ
محسوس کیا۔

تصوّر.... اُس کا تصوّر اُسے ٹھوس شے کی طرح محسوس
ہونے لگا تھا۔

یہ ہاتھ اُس کے سَر سے سرکتا اُس کے کندھے پر چلا گیا۔ وہ اور
زیادہ ڈرنے لگی جیسے کوئی جن یا شریر شرار اُسے اپنی گرفت میں لے رہا
ہو۔ وہ دیکھنے سے بھی ڈرتی تھی کہ یہ کون ہے، کیا ہے!

"اتنا نہ ڈرو نسیمہ!" ــ اُسے ایسی آواز سنائی دی جس میں پیار
تھا، شفقت تھی۔

جب بازو اُس کی کمر کے گرد لپٹ گیا اور اِس بازو نے اُسے
سمیٹ لیا تو اُس نے دیکھا۔ وہ اُس کا خاوند تھا، عمر حیات۔ وہ گھُوم کر
اُس کے ساتھ لپٹ گئی اور ماں سے بچھڑے ہُوتے بچّے کی طرح
بلک بلک کر رونے لگی۔ عمر حیات نے اُسے اپنے ساتھ چپکا لیا اور
اُس کے سَر اور مُنہ پر ہاتھ پھیرنے لگا۔ اُس کی ہچکی بندھ گئی۔

"نسیمہ!" ــ عمر حیات نے کہا ــ "حوصلہ کرو۔ میں موجود ہوں۔
مت ڈرو!"

نسیمہ کی حالت بگڑتی گئی۔ ہچکیاں بڑھتی گئیں۔ جسم کا لرزہ پہلے
سے زیادہ ہوگیا۔

"میں تم پر اپنے بچے کو قربان کر دوں گا" ــ عمر حیات نے کہا
ــ "خدا اور بچہ دے دے گا۔"

نسیمہ تڑپ کر اپنے خاوند کے بازوؤں سے نکل گئی اور اُس کی
نظریں خاوند کے چہرے پر جم گئیں جیسے اُسے پہچاننے کی کوشش کر
رہی ہو۔ عمر حیات نے ایسی بات پہلے کبھی نہیں کہی تھی۔ اپنے بچے
شوکت کے متعلق وہ اتنا حساس تھا کہ اُس کی ماں کے مرنے کے بعد
عمر حیات نے صرف اس لئے شادی نہ کرنے کا عہد کر لیا تھا کہ وہ بچے
کو سوتیلی ماں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ اب اُس کے
بچے کو دَورے پڑنے لگے تو اُس نے ہر کسی سے کہا تھا کہ اُس کا سارا
مکان جل کر راکھ ہوجائے، اُس کا بچہ ٹھیک ہونا چاہیئے۔

نسیمہ نے اپنی ماں سے اور اپنی ملنے والیوں سے کئی بار کہا تھا
کہ اُس کے خاوند کو اُس کے ساتھ نہیں، اپنے بچے کے ساتھ پیار ہے۔

"میں تو اس کی صرف بیوی ہوں" ــ نسیمہ اکثر کہا کرتی تھی ــ
"نکاح نہ پڑھا گیا ہوتا تو میں داشتہ ہوتی اور باورچن بھی۔"

اس کیفیت میں جب خوف انتہا کو پہنچ کر ڈراؤنا واہمہ یا نظر
آنے والے جن بھوت بن چکا تھا اور نسیمہ تنکوں کے سہارے ڈھونڈ

رہی تھی، عمر حیات نے اُسے اپنے ساتھ لگا کر ایسی بات کہہ دی کہ نسیمہ سُن ہو کے رہ گئی۔ اُسے اپنے کانوں پر یقین نہ آیا۔ عمر حیات نے ایک بار پھر اُسے اپنے ساتھ لگا لیا۔

"تمہاری حالت تو زیادہ ہی بگڑ گئی ہے"۔۔۔ عمر حیات نے نسیمہ سے کہا۔۔۔ "کیا تم اپنے آپ کو تنہا سمجھ رہی ہو؟"

"شوکی پہ تو میں قربان ہو جاؤں گی"۔۔۔ نسیمہ نے روتی ہوئی سی آواز میں کہا۔۔۔ "آپ ایسی بات زبان پہ لے کس طرح آئے ہیں؟"

عمر حیات کا بچّہ شوکی نسیمہ کو اتنا اچھا کبھی نہیں لگا تھا جتنا اب لگا۔ اُسے سکون اور اطمینان سا محسوس ہونے لگا۔ شادی کے ان چند مہینوں میں اُسے پہلی بار محسوس ہُوا کہ وہ عمر حیات کی منکوحہ داشتہ نہیں، اُس کی بیوی ہے اور وہ اُسے اپنی زندگی کی رفیقہ سمجھتا ہے اور اُس کے دل میں اُس کی محبت ہے۔

"ایک دو دِنوں کی بات ہوتی تو برداشت ہو سکتی تھی"۔۔۔ نسیمہ نے عمر حیات سے کہا۔۔۔ "یہ تو روزمرّہ کا معمول بن گیا ہے۔ خوف سے میرا دل ...." باہر کی دھمک نے اُسے خاموش کر دیا اور وہ عمر حیات کے ساتھ جا لگی۔

یہ ایک پتھر تھا جو باہر سے آیا اور برآمدے میں گرا تھا پھر ایک اور پتھر گرا۔

"شوکی کہاں ہے؟"۔۔۔ نسیمہ نے ہڑبڑا کر کہا اور وہ باہر کو دوڑ پڑی۔ اس سے پہلے اُس نے ایسی جرأت کا مظاہرہ کبھی نہیں کیا تھا۔ شوکی کو دَورہ پڑتا تھا تو وہ اُس کی طرف دیکھتی بھی نہیں تھی۔ شوکی دوسرے برآمدے میں دو بچّوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ کھیلتے کھیلتے وہ گر پڑا اور اُسے دَورہ شروع ہو چکا تھا۔ بچّے جو اُس کے پاس کھیل رہے تھے وہ ڈر کر بھاگ گئے تھے۔ نسیمہ دوڑتی گئی، اُس کے پاس جا بیٹھی اور اُسے اُٹھا کر اپنی گود میں لٹا لیا۔ صحن اور ایک برآمدے میں تھوڑے

تھوڑے وقفے بعد ایک پتھر گرتا تھا۔ کپڑے لٹکانے والی تار سے پلنگوں کی دو چادریں لٹک رہی تھیں۔ دونوں کو آگ لگ گئی۔

نسیمہ نے جلتی ہُوئی چادروں کو دیکھا اور اُس نے بچّے کو یُوں اپنے ساتھ لگا لیا جیسے مُرغی نے اپنے بچّوں کو چیل کے جھپٹے سے بچانے کے لئے اپنے پروں تلے چھُپا لیا ہو۔ عمر حیات بھی اُس کے پاس آ کر بیٹھ گیا۔

دس پندرہ منٹ بعد پتھر گرنے بند ہو گئے۔ پھیلی ہوئی دونوں چادریں جل چکی تھیں اور اُن کی راکھ صحن میں پڑی تھی۔

"میں آج ہی حسنین کاظمی کے ہاں جاتا ہوں"۔۔۔ عمر حیات نے کہا۔

"لیکن شوکی وہاں اکیلا کیسے رہ سکے گا؟"۔۔۔ نسیمہ نے پوچھا۔

"ایک صورت ہے"۔۔۔ عمر حیات نے کہا۔۔۔ "میں شوکی کے ساتھ حسنین کاظمی کے پاس رہوں گا۔ اس صورت میں تم اپنی امّی کو یہاں بلا لینا۔ میں دو آدمیوں کی ڈیوٹی لگاؤں گا۔ وہ ہر وقت یہاں رہیں گے۔"

"میں اپنی امّی کو ساتھ نہیں رکھوں گی"۔۔۔ نسیمہ نے کہا۔۔۔ "اگر آپ کے دونوں آدمی اعتماد کے قابل ہوں تو میں یہاں اکیلی رہوں گی۔"

"کیوں؟"۔۔۔ عمر حیات نے قدرے حیرت سے پوچھا۔۔۔ "تمہاری امّی کیوں نہ رہے تمہارے پاس؟"

"ویسے ہی"۔۔۔ نسیمہ نے جواب دیا اور چپ ہو گئی جیسے اُسے معلوم ہی نہ ہو کہ اس سوال کا کیا جواب دینا چاہیئے۔ اُس نے ایک بار پھر کہا۔۔۔ "ویسے ہی .... معلوم نہیں میں نے کیوں محسوس کیا ہے کہ امّی کو یہاں نہیں رہنا چاہیئے۔"

"میرے آدمی ہر طرح قابلِ اعتماد ہیں"۔۔۔ عمر حیات نے کہا۔۔۔ "نسیمہ! میں نے تمہیں ابھی تک نہیں بتایا کہ میں نے اپنے ہاتھ میں کچھ غنڈے بھی رکھے ہُوئے ہیں۔ یہ جو کچھ ہمارے ساتھ ہو رہا ہے اسے روکنے کے لئے میرے یہ آدمی کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر پتہ چل جاتے کہ یہ کون کرا رہا ہے تو کسی کو پتہ ہی نہ چلے کہ وہ آدمی کہاں غائب ہو گیا

ہے۔ میرا کام ایسا ہے کہ مجھے اس قسم کے آدمیوں کے ساتھ دوستانہ تعلق رکھنا پڑتا ہے۔ میں یہاں جن دو آدمیوں کو رکھوں گا اُن سے تو جن بھوت بھی ڈرتے ہیں۔"

"پھر یہ انتظام آج ہی کریں" — نسیمہ نے کہا۔

عمر حیات کو کچھ نہ کچھ کرنا ہی تھا۔ پہلے دو دنوں کے وقفے سے پتھر آتے تھے۔ چار پانچ دنوں سے ہر روز پتھر پڑتے اور ایک دو کپڑے جل جاتے تھے۔ کوئی وقت مقرر نہیں تھا۔

❖

عمر حیات اُسی وقت حسنین کاظمی کے گاؤں دولت پور چلا گیا اور اُسے بتایا کہ وہ اپنے بچے کو اُس کے گھر لانا چاہتا ہے اور خود بچے کے ساتھ رہے گا۔

"ابھی آؤ، فوراً آؤ" — حسنین کاظمی نے کہا — "میں حیران تھا کہ آپ ابھی تک میرے پاس آئے کیوں نہیں .... میں ایک بات ایک بار پھر واضح کر دیتا ہوں کہ یہ میرا پیشہ نہیں۔ یہ میرا شوق ہے۔ اسے آپ جنون کہہ سکتے ہیں۔ میں آپ کو کچھ دے سکا تو دوں گا، لوں گا کچھ نہیں .... ملک صاحب!" — حسنین کاظمی نے آہ بھری اور چند لمحے چپ رہا۔ پھر بولا — "خدا نے مجھے ان پھولوں سے محروم رکھا ہے جنہیں اولاد کہتے ہیں۔ آپ کا بچہ تو ادھ کھلی کلی ہے۔ میں تو جس بچے کو دیکھتا ہوں، جی چاہتا ہے کہ اسے اُٹھا لوں اور اتنا پیار کروں کہ میری پیاس بجھ جائے، لیکن میں نے آپ کے بچے میں معلوم نہیں کیا دیکھا ہے کہ اسے تو میں ہمیشہ کے لئے اپنے ساتھ رکھنا چاہتا ہوں جو ممکن نہیں۔ کبھی ایسے لگتا ہے جیسے اس بچے کو میرے گھر پیدا ہونا چاہئے تھا لیکن یہ آپ کے گھر پیدا ہوا۔ اس کی نجات کے لئے تو مجھے افق سے دُور پرے بھی جانا پڑا تو چلا جاؤں گا .... میں بچے کے لئے ایک عمل کر چکا ہوں۔ شاید یہ عمل آپ کے گھر میں جا کر بے اثر ہو جائے، میرے گھر

میں یہ پورا اثر کرے گا۔ نہ بھی کرے تو کوئی حرج نہیں۔ بچے پر جو اثر پیدا کیا جا رہا ہے وہ صرف آپ کے گھر تک محدود ہے .... آپ بچے کے ساتھ آئیں۔ ہم گھر کے دو ہی آدمی ہیں۔ کچھ دنوں کے لئے یہاں بھی رونق آجائے گی .... ہاں، ایک احتیاط لازمی ہے۔ آپ رات کو آئیں تاکہ کسی کو پتہ نہ چلے کہ بچہ میرے گھر میں آگیا ہے۔"

عمر حیات اُسی رات بچے کو حسنین کاظمی کے گاؤں لے گیا۔ گاؤں چند میل دُور تھا۔ وہ بچے کو سائیکل پر لے گیا تھا۔ گھر کے لئے اُس نے وہی انتظام کیا تھا جو اُس نے نسیمہ کو بتایا تھا۔ اُس کے دو آدمی اُسی شام عمر حیات کی روانگی سے پہلے اُس کے گھر پہنچ گئے تھے۔

❖

عمر حیات اپنے بچے کے ساتھ پانچ چھ دن حسنین کاظمی کے گھر میں رہا۔ وہ ہر روز شہر میں آتا، اپنے کاروبار کو دیکھتا اور اپنے گھر بھی جاتا۔

ہر روز اُسے توقع ہوتی تھی کہ نسیمہ اُسے خوفزدگی کی حالت میں ملے گی اور اُسے یہی ایک خبر سنائے گی کہ پتھر گرے تھے اور کپڑوں یا لوٹوں کو آگ لگ گئی تھی لیکن اُسے نسیمہ ہشاش بشاش ملتی اور یہ خبر سناتی کہ نہ پتھر گرے ہیں نہ آگ لگی ہے۔ اُس کے دونوں آدمی دن رات چوکنے رہتے تھے۔

اس دوران نسیمہ کی ماں تین بار نسیمہ کے پاس آئی اور عمر حیات اور شوکت کے متعلق پوچھا کہ وہ کہاں ہیں۔ نسیمہ نے جھوٹ بولا کہ عمر حیات بچے کو بہت دُور کسی پہنچے والے عامل کے پاس لے گیا ہے۔

"نسیمہ بیٹی!" — ایک روز ماں نے اُسے کہا — "میں سائیں مستانے کے پاس گئی تھی۔ وہ کہتا ہے کہ تین دنوں کے اندر اندر نسیمہ نہ آئی تو ساری عمر پچھتائے گی۔ وہ آدھا عمل کر چکا ہے جو واپس نہیں ہو سکتا۔"

"اُسے کہو ذرا صبر کرے" — نسیمہ نے کہا — "ہم اس نئے عامل

کو آزمالیں۔ دیکھ لو امّی! جس روز سے شوکی اور اُس کا ابّا گئے ہیں، ہمیرا گھر اس آفت سے محفوظ ہے۔"

"جس روز شوکی یہاں آیا، اُس روز سے آفت پھر شروع ہو جائے گی" ——ماں نے کہا ——"بات اس بچّے پر ہی ختم ہوتی ہے۔ اس بچّے کو ہمیشہ کے لئے غائب کرنا ضروری ہے۔"

نسیمہ نے اُسے ٹال دیا۔ کہنے کو تو اُس کے پاس بہت کچھ تھا لیکن اُس نے ٹال دینا ہی بہتر سمجھا۔

"ملک صاحب!" —— ایک روز حسنین کاظمی نے عمر حیات سے کہا —— "آپ نے دیکھ لیا ہے کہ بچّے کو وہاں سے ہٹانے سے کیا فرق پڑا ہے۔ آپ بچّے کو گھر لے جائیں۔ میں نے بچّے پر ایک عمل کیا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ اس پر اب وہ سفلی عمل اثر نہیں کرے گا، پھر بھی میں اس کا پکّا انتظام کرنا چاہتا ہوں۔ میں آج ہی اپنے اُستاد کے پاس جا رہا ہوں .... وہ جالندھر شہر میں رہتا ہے۔"

"بہت دُور ہے کاظمی صاحب!" —— عمر حیات نے کہا —— "آپ کا جو خرچ ہوگا وہ میں دوں گا۔ آپ کے اُستاد کی بھی خدمت کروں گا۔"

"میں کہہ چکا ہوں کہ یہ میرا پیشہ نہیں" —— حسنین کاظمی نے کہا —— "مجھے کچھ نہیں چاہیئے نہ میرا اُستاد مجھ سے کچھ لے گا۔ آپ اپنے گھر چلے جائیں۔ میرا خیال یہ بھی ہے کہ آپ کے گھر پر جو سفلی عمل کیا گیا تھا، اُس کی معیاد پُوری ہو چکی ہے۔"

ملک عمر حیات اپنے بچّے کو اپنے گھر لے آیا۔ اُسی روز حسنین کاظمی جالندھر چلا گیا۔

◆◆◆

حسنین کاظمی کے اُستاد کی عمر ساٹھ سال سے کچھ اُوپر ہو گئی تھی۔ روحانیت اور کالے علم میں اُسے خاصی دسترس تھی اور یہی اُس کا ذریعہ معاش تھا۔ حسنین کاظمی کبھی کبھی اُسے ملنے

اُستاد کے پاس کوئی سائل بیٹھا تھا۔ اُستاد کو اطلاع ملی تو اُس نے حسنین کاظمی کو سائل کی موجودگی میں ہی بلا لیا، حالانکہ وہ ایسے نہیں کیا کرتا تھا۔ سائل کی رازداری کا وہ بہت خیال رکھتا تھا۔ حسنین کاظمی تو اپنے استاد سے گھٹنے چھُو کر ملا لیکن اُستاد نے اُسے گلے لگا لیا۔

"منیر بھائی!" —— اُستاد نے اپنے سائل سے کہا —— "یہ حسنین کاظمی ہیں۔ میرے بڑے عزیز دوست ہیں۔ تمہارے قریب ہی کے رہنے والے ہیں .... دولت پُور ان کا گاؤں ہے۔"

"اچھا، دولت پُور!" —— سائل نے کہا —— "ہم سے پانچ چھ میل دُور ہے" —— اُس نے حسنین کاظمی سے کہا —— "میں نندہ کا رہنے والا ہوں۔"

"نندہ گورو!" —— حسنین کاظمی نے کہا —— "اچھا خاصا قصبہ ہے۔"

کچھ دیر استاد اور حسنین کاظمی اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے رہے۔ استاد نے باتوں کا رُخ منیر کی طرف پھیر دیا۔

"سرکار!" —— منیر نے اُستاد سے التجا کی —— "کرم کریں۔ آپ کے ہاتھ میں اللہ نے بڑی طاقت دی ہے۔"

"تم خود مجھ سے اُلٹے کام کراتے ہو" —— استاد نے کہا —— "تم نے جو کہا وہ میں نے کر دیا۔ پرسوں اس کی معیاد پوری ہو گئی تھی۔ اب تمہیں اس سے کچھ حاصل ہُوا یا نہیں ہُوا، یہ میرے سوچنے والی بات نہیں۔"

"سرکار!" —— سائل نے کہا —— "حاصل تو کچھ بھی نہیں ہُوا۔"

"ہونا یوں چاہیئے تھا کہ تم مجھے اپنا مقصد بتا دیتے" —— استاد نے کہا —— "آگے میرا کام تھا کہ تمہارا مقصد کس طرح پورا کرتا ہوں۔ تم نے ضد کی کہ اُسے پریشان کرنا ہے .... اب تم کہتے ہو کہ وہ اپنے خاوند سے طلاق لے لے یا خاوند کسی وجہ سے اُسے طلاق دے دے۔"

"سرکار! آپ جو حکم کریں گے پیش کروں گا" —— سائل نے کہا —— "پہلے بھی میں نے کوئی کسر نہیں رہنے دی .... ایسا انتظام کریں کہ اُس کا خاوند مر جائے یا وہ جسمانی لحاظ سے ایسا بیکار ہو جائے کہ بیوی اُس

سے طلاق لے لے۔"

"میں یہ کام ایک دن میں کر سکتا ہوں" ___ اُستاد نے کہا ___ "لیکن کروں گا نہیں۔ میرے آگے دولت کا ڈھیر لگا دو، ایسا کام نہیں کروں گا.... تم نے کہا تھا اُس کے گھر میں پتھر پڑیں اور کپڑوں اور نوٹوں کو آگ لگے۔ میں نے پورے ایک مہینے کا یہ بندوبست کر دیا لیکن اُس گھر میں جا کر پوچھو کہ اتنے پتھر گرتے رہے، کبھی پتھر کسی کو لگا ہے؟ کوئی زخمی ہُوا ہے؟.... نہیں ہُوا.... آگ صرف اُن کپڑوں کو لگتی رہی جو صحن میں تار پر لٹکتے ہوتے تھے۔ نوٹ وہ جلے جو پرس میں ہوتے تھے۔ میں کسی کے گھر کو آگ نہیں لگاؤں گا.... باقی رہے پیسے!.... وہ تو میں جو کام کروں گا اُس کے پیسے ضرور لُوں گا۔ میں پیر اور مُرشد نہیں ہُوں کہ سوا روپیہ شیرینی لے کر تعویذ لکھ دُوں گا، نہ میں کسی کو اپنا مُرید بناتا ہُوں۔"

حسنین کاظمی یہ سُن کر ہی چونک اُٹھا تھا کہ کسی گھر میں پتھر گرتے اور کپڑوں اور نوٹوں کو آگ لگتی ہے اور یہ گھر نندہ میں ہے۔ نندہ میں ملک عمر حیات کا ہی گھر تھا جہاں یہ واقعہ ہو رہا تھا۔ اُسے پتہ چل گیا کہ یہ ہے وہ آدمی جو عمر حیات کو پریشان کر رہا ہے اور اس کا مقصد یہ ہے کہ عمر حیات اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ حسنین کاظمی انجان بنا رہا جیسے اُسے اس قصّے سے کوئی دلچسپی نہ ہو، لیکن اُس کے اُستاد نے اُسے اس قصّے میں گھسیٹ لیا۔

"دیکھو بھائی!" ___ اُستاد نے سائل سے کہا ___ "حسنین کاظمی اس علم کو اچھی طرح جانتے ہیں۔ میں ان کے ساتھ بات کرتا ہوں یہ راز کو راز ہی رکھیں گے.... کاظمی بھائی! منیر کے قصبے میں ملک عمر حیات نام کا ایک آدمی ہے۔ نسیمہ نام کی ایک لڑکی نے اُس کے ساتھ شادی کر لی ہے۔ اِس لڑکی نے اِس (منیر) کے ساتھ شادی کا وعدہ کر رکھا تھا۔ لڑکی کی ماں لڑکی اسی کو دینا چاہتی تھی لیکن عمر حیات کو دے

دی۔ منیر کو کسی دوست نے میرا پتہ دیا اور یہ میرے پاس آگیا۔ اس نے سُن رکھا تھا کہ کسی کو پریشان کرنا ہو تو اُس کے گھر پتھر پڑوائے جا سکتے ہیں.... اس نے مجھ سے یہ کام کروایا۔ عمر حیات کی پہلی بیوی سے ایک لڑکا دس گیارہ سال کی عمر کا ہے۔ میں نے اُسے استعمال کیا اور منیر کا کام کر دیا....

"میں نے جو میعاد مقرر کی تھی اُس سے تین چار روز پہلے ہی میرے کام میں رکاوٹ پیدا ہو گئی، یعنی اُس گھر میں پتھر گرنے بند ہو گئے۔ وجہ یہی ہو سکتی ہے کہ بچّہ اُس گھر سے کہیں چلا گیا ہو گا یا عمر حیات نے کسی ہم جیسے عامل سے بندش کروالی ہو گی۔ یہ علم صرف ہماری میراث ہی تو نہیں۔ بڑے بڑے اُستاد پڑے ہیں۔ اب منیر کہتا ہے کہ لڑکی اُدھر سے طلاق لے لے اور اس کے ساتھ شادی کر لے۔ یہ بار بار اتنی دُور سے میرے پاس آتا ہے.... کاظمی بھائی! اسے اپنے ساتھ لے جائیں اور اِن کا کام کر دیں۔"

"اُستاد کی موجودگی میں شاگرد کی کیا مجال ہے!" ___ حسنین کاظمی نے کہا ___ "اور میں...."

"کاظمی!" ___ اُستاد نے اُسے آگے نہ بولنے دیا اور کہا ___ "اسے ساتھ لے جاؤ۔ تم سب کچھ کر سکتے ہو.... تم ایسے کرو منیر! واپس چلے جاؤ۔ کاظمی صاحب سے پوچھ لو کہ یہ تمہیں کب ملیں گے۔ آج رات تو میں انہیں پاس رکھوں گا اور تمہارے مسئلے کے متعلق بھی انہیں کچھ بتا دوں گا۔"

کاظمی نے منیر کو بتا دیا کہ وہ کب اُس کے پاس اُس کے گاؤں میں آئے۔ منیر چلا گیا۔

❖

"عجیب اتفاق ہے خواجہ صاحب!" ___ حسنین کاظمی نے اپنے اُستاد سے کہا ___ "میں اسی کیس کے سلسلے میں آپ کے پاس آیا ہوں۔"

مجھے یہ پتہ چل گیا ہے کہ عمر حیات کے گھر پر یہ کام کون کرا رہا تھا۔"

"تم انہیں کس طرح جانتے ہو؟" — کاظمی سے اُستاد نے پوچھا۔

"میرا جنون مجھے وہاں لے گیا تھا" — حسنین کاظمی نے جواب دیا اور خواجہ صاحب کو تفصیل سے بتایا کہ وہ عمر حیات کے گھر تک کس طرح پہنچا اور اُس نے کیا کارروائی کی ہے۔ اس نے کہا — "میں بچے کو اپنے گھر لے گیا تھا اور میں نے بندش کے لئے بھی کچھ کیا تھا۔"

"تمہاری بندش کامیاب ہے کاظمی!" — خواجہ اُستاد نے کہا — "یہ شخص جس کا نام منیر ہے، اوچھا اور گھٹیا آدمی ہے۔ اسی عمر میں یہ اُلٹے چکروں میں پڑ گیا ہے۔ میں نے اس کا یہ کام اس لئے کر دیا تھا کہ بُری طرح میرے پیچھے پڑ گیا تھا۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ یہ میرا ذریعۂ معاش ہے۔ کچھ کمانا بھی ہے لیکن میں اس کا وہ کام نہیں کرنا چاہتا جو یہ کہہ رہا تھا۔ میں کسی کو جسمانی لحاظ سے ناکارہ نہیں کروں گا اور میں کسی کی جان بھی نہیں لوں گا۔"

"آپ نے اسے میرے حوالے کیوں کر دیا ہے؟" — حسنین کاظمی نے پوچھا — "میں بھلا کیا کر سکتا ہوں؟"

"اس کے سوا کچھ بھی نہ کرنا کہ اسے امید دلائے رکھنا کہ اس کا کام ہو رہا ہے" — خواجہ نے کہا — "اسے ڈراتے بھی رہنا کہ اُلٹے کام کرانے والے کا انجام بہت بُرا ہوتا ہے۔"

"اگر یہ نہ ٹلا تو میں کیا کروں؟" — حسنین کاظمی نے پوچھا — "کیا میں عمر حیات اور اُس کی بیوی کو بتا دوں کہ اُن پر یہ عمل اِس شخص نے کرایا تھا؟"

"نہیں" — خواجہ نے جواب دیا — "خون خرابہ ہو جائے گا۔ اگر یہ شخص تمہارے پیچھے ہی پڑ گیا اور تم مجبور ہو گئے تو اسے میرے پاس لے آنا" — خواجہ چُپ ہو گیا۔ دو چار لمحے حسنین کاظمی کے چہرے پہ ٹکٹکی باندھے رکھی پھر دھیمی سی آواز میں بولا — "اس کے ماں باپ بڑے ہی بدقسمت ہیں۔ اتنا خوبرو اور جوان بیٹا بہت ہی بُرے انجام کو

جا رہا ہے۔"

"کیا آپ نے کچھ دیکھا ہے؟"

"ہاں" — خواجہ نے آہستہ سے سر ہلایا — "دیکھا ہے .... ہو سکتا ہے مارا جائے۔ میں نے اس کا حساب نکالا تھا۔ آگے اندھیرا سا نظر آتا ہے۔ اگر یہ زندہ رہا تو اچھی حالت میں زندہ نہیں رہے گا۔ جو اللہ جانتا ہے وہ ہم نہیں جان سکتے لیکن اللہ نے مجھے جو علم دیا ہے یہ کوئی اچھی خبر نہیں سُنا رہا۔ اسی لئے میں نے تمہیں کہا ہے کہ یہ راز ہی رہنے دینا کہ اُس گھر پہ اس شخص نے سفلی عمل کرایا تھا۔ ہو سکتا ہے پتہ چل جانے پر وہ لوگ انتقامی کارروائی کرنے پر آ جائیں۔ مجھے نظر آ رہا ہے کہ یہ صورت منیر کے لئے اچھی نہیں ہو گی۔"

"یہ تو میں سنبھال لوں گا" — حسنین کاظمی نے کہا — "میں ملک عمر حیات کے گھر کو بچانا چاہتا تھا۔ وہ آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ کے عمل کی معیاد پوری ہو چکی ہے۔"

"تم نے جو عمل کیا ہے وہ کافی ہے" — خواجہ نے کہا — "مزید کچھ کرنے کی ضرورت نہیں۔"

حسنین کاظمی دوسرے روز جالندھر سے واپس آیا۔ ریل گاڑی سے وہ نندہ اُترا۔ اُسے یہیں اُتر کر تانگے یا یکے سے اپنے گاؤں جانا تھا۔ وہ عمر حیات کے گھر چلا گیا۔ نسیمہ اور شوکت گھر تھے۔

"کچھ ہوا تو نہیں؟" — حسنین کاظمی نے نسیمہ سے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں" — نسیمہ نے جواب دیا۔

"اب کچھ بھی نہیں ہو گا" — حسنین کاظمی نے کہا — "میں نے مکمل بندوبست کر دیا ہے۔ میں اپنے اُستاد کے پاس جالندھر اسی کام کے لئے گیا تھا۔"

"کیا آپ مجھے یہ نہیں بتائیں گے کہ یہ کیا تھا؟" — نسیمہ نے

پوچھا — "کیا یہ جن تھے جو ہمیں ہماری کسی غلطی کی سزا دیتے رہے
ہیں یا کسی نے کچھ کیا تھا؟"

"تم شاید بھول گئی ہو کہ میں پہلے روز یہاں آیا تھا تو تمہارے
اس سوال کا جواب دیا تھا" — حسنین کاظمی نے کہا — "یہ جن نہیں
تھے۔ کسی نے کچھ کیا تھا۔"

"کیا یہ پتہ نہیں چل سکتا کہ یہ کس نے کیا تھا؟"

"نہیں نسیمہ!" — حسنین کاظمی نے جواب دیا — "جو ہُوا وہ ہو
چکا۔ بھول جاؤ۔ دل سے اتار دو .... خدا کو یاد کیا کرو۔"

"کیا یہ بھی پتہ نہیں چل سکتا کہ یہ ملک صاحب کا کوئی دشمن ہے یا
میرا؟" — نسیمہ نے پوچھا — "اس معصوم بچے کے ساتھ کسی کی
کیا دشمنی ہو سکتی ہے؟"

"کیا کرو گی یہ باتیں معلوم کر کے نسیمہ؟" — حسنین کاظمی نے کہا —
"اس بچے کے ساتھ کسی کی دشمنی نہیں۔ اسے معمول بنایا گیا تھا یعنی اسے
اس سارے کھیل کا ذریعہ بنایا گیا تھا۔ میں نے اسے یہاں سے ہٹا لیا
تو تمہارے دشمن کا کھیل ختم ہو گیا۔"

"میرے دشمن کا؟" — نسیمہ نے پوچھا اور حسنین کاظمی کا ایک
ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر التجا کے لہجے میں کہا — "میں اور
کچھ نہیں پوچھوں گی۔ صرف اتنا بتا دیں کہ یہ کوئی میرا دشمن تھا؟"

"ہاں" — حسنین کاظمی نے جواب دیا — "تمہارا دشمن تھا۔
بس اور کچھ نہ پوچھو۔"

نسیمہ پر خاموشی طاری ہو گئی اور اُس نے سر جھکا لیا۔ حسنین کاظمی
نے اُس کے سر پہ ہاتھ رکھ کر سر اوپر کیا۔ نسیمہ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

"کیوں نسیمہ!" — حسنین کاظمی نے کہا — "کیا تم خوش نہیں
ہو کہ تمہاری مصیبت ختم ہو گئی ہے؟"

"خوش تو ہوں کاظمی صاحب!" — نسیمہ نے کہا — "لیکن ....

لیکن .... مجھے ایسے محسوس ہو رہا ہے جیسے میں کچھ پوچھنا چاہتی ہوں
لیکن پتہ نہیں چل رہا کیا پوچھوں، کیسے پوچھوں .... ایک بے چینی
سی ہے۔ میں تو شوخیاں کرنے والی لڑکی تھی۔ ایسے لگتا ہے جیسے
خدا نے میرے گھر پتھر برسا کر مجھے سزا دی ہے، یا مجھے جھنجھوڑ کر
بیدار کیا ہے۔"

"خوش قسمت ہے وہ بندہ جسے خدا اِسی دُنیا میں جھنجھوڑ کر
بیدار کر دے" — حسنین کاظمی نے کہا — "تم اگر بتا دو کہ تم کیسی
بے چینی محسوس کر رہی ہو تو میں کچھ کہوں۔"

"یہ باتیں ملک صاحب تک تو نہیں پہنچیں گی؟" — نسیمہ نے
پوچھا — "کچھ باتیں بڑی نازک ہیں۔"

"نہیں نسیمہ نہیں" — حسنین کاظمی نے جھنجلا کر کہا — "ملک
عمر حیات میرا دوست تو نہیں۔ یہ تو میں اُس کے کہنے پر تمہارے
گھر آیا تھا۔ یہ انسانی ہمدردی کا جذبہ تھا جو مجھے یہاں لے آیا تھا ....
تم جو کہنا چاہتی ہو بے تکلفی سے کہہ دو۔ ملک صاحب تک کچھ نہیں
پہنچے گا۔"

"ملک صاحب کے ساتھ میری شادی ان کی جائیداد اور ان کی
دولت مندی کی وجہ سے ہوئی تھی" — نسیمہ نے کہا۔

"یہ مجھے کیوں بتا رہی ہو؟" — حسنین کاظمی نے پوچھا — "کیا
اس واردات کے ساتھ اس کا کوئی تعلق ہے؟"

"شاید ہو" — نسیمہ نے کہا — "لیکن یہ باتیں آپ کو سنانے
سے میرا مطلب کچھ اور ہے۔ کوئی نہیں جو میرا ہاتھ تھام لے اور
مجھے بتائے کہ میں کیا محسوس کر رہی ہوں۔ آپ سیانے ہیں۔ آپ کو
زندگی کا تجربہ ہے۔ اچھے بُرے کو آپ سمجھتے ہیں۔ آپ انسان کی فطرت
کے راز بھی سمجھتے ہوں گے۔"

"کہو نسیمہ! کہو" ـــــ حسنین کاظمی نے کہا ـــــ "میں شاید جان گیا ہوں کہ تم کیا محسوس کر رہی ہو اور کہنا کیا چاہتی ہو .... کیا تمہارے دل پر، بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ تمہارے ضمیر پر کوئی بوجھ ہے؟"

"دل پر گھبراہٹ ہے" ـــــ نسیمہ نے کہا ـــــ "اور جو بوجھ ہے، یہ ضمیر پہ ہی ہوگا۔ آپ بہتر سمجھتے ہیں .... میں کہہ رہی تھی کہ ملک صاحب کے ساتھ میری شادی ایک کاروبار تھا۔ میری امّی کہتی تھی کہ اکیلا آدمی ہے اور اس کی اتنی زیادہ آمدنی اور اتنی زیادہ جائداد ہے۔"

"وہ سوچتی ہوگی کہ تم سُکھی رہو گی۔"

"نہیں" ـــــ نسیمہ نے کہا ـــــ "اُس نے سوچا تھا کہ وہ خود سُکھی رہے گی۔ کہتی تھی کہ خاوند سے پیسے لے کر اور اُڑا کر میں اُسے دیتی رہا کروں اور خاوند کو اپنے قبضے میں لے کر اُس سے کم از کم یہ حویلی اپنے نام لکھوا لوں .... میں نے ان چند مہینوں کی ازدواجی زندگی میں ماں کو بہت پیسے دیئے ہیں۔ ماں نے میری تربیت ایسی ہی کی ہے۔ خود بھی نمائشی سی عورت ہے۔ میرے ابّو بالکل سیدھے اور بھلے آدمی ہیں۔ وہ تو جیسے سانس بھی میری امّی کی مرضی کے مطابق لیتے ہیں۔

میرے دو بھائی ہیں۔ ایک شادی کر کے الگ ہو گیا ہے اور دوسرا دِلّی میں ملازم ہے۔ وہ بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ دو سال سے گھر آیا ہی نہیں۔ کسی نے بتایا تھا کہ شراب اور طوائف بازی کا عادی ہو گیا ہے۔ میرے ابّو کسی بھی نشے کے عادی نہیں لیکن ایسے پتہ چلتا ہے جیسے ہر وقت نشے میں رہتے ہوں۔ صرف امّی ہے جو بیدار اور چوکس رہتی ہے ....

"اُس نے مجھے بھی بیدار اور چوکس رکھا اور جب میں جوان ہوئی تو مجھے بنا سنوار کر رکھنے لگی۔ وہ مجھے بتا چکی ہے کہ اُس کی اپنی جوانی اسی طرح گزری ہے۔ اُس نے بیک وقت تین آدمیوں سے محبت کی تھی جو محبت ہو ہی نہیں سکتی۔ اُس نے شادی چوتھے آدمی سے کی

جو اُسے اس لئے اچھا لگا کہ انگلیوں پر ناچنے والا ہے ....

"میری امّی کے اندر جذبات ہیں ہی نہیں۔ اس نے مجھ میں بھی جذبات پیدا نہ ہونے دیئے لیکن ایک نوجوان مجھے اچھا لگنے لگا۔ وہ اچھا آدمی نہیں تھا لیکن اُس نے مجھے برائی سے بچائے رکھا۔ میرے اندر وہ جذبات بیدار ہو گئے جنہیں میری امّی دبائے رکھنا چاہتی تھی۔ منیر خوبصورت جوان ہے۔"

"منیر؟" ـــــ حسنین کاظمی نے پوچھا ـــــ "اُس کا نام منیر ہے؟"

"جی ہاں" ـــــ نسیمہ نے کہا ـــــ "اُس کا نام منیر ہے۔ امیر ماں باپ کا اکلوتا بیٹا ہے۔ بگڑ گیا ہے لیکن مجھے اُس نے نہیں بگڑنے دیا۔

سب اُسے آوارہ شہزادہ کہتے ہیں لیکن میں اُس کی آوارگی کا نشانہ نہیں ہوئی۔ ہم نے شادی کے وعدے کئے اور قسمیں کھائی تھیں لیکن میری امّی نے مجھے اُدھر سے ہٹا لیا۔ کہنے لگی کہ یہ شخص تمہیں دھوکہ دے رہا ہے اور دو ہندو عورتوں کے ساتھ اس کے تعلّقات ہیں۔ امّی نے ایسی باتیں کیں کہ میرے دل میں جو محبت تھی اُس پہ وہم اور وسوسے چھا گئے ....

"امّی لے ملک عمر حیات کو اپنی زبان کے جال میں پھانس لیا پھر مجھے اس کے گھر لے آئی۔ امّی نے مجھے تربیت دے رکھی تھی۔ میں نے ملک صاحب پر جادو چلا لیا۔ انہوں نے اپنے بچّے کی خاطر دوسری شادی نہ کرنے کا ارادہ کر رکھا تھا لیکن میں نے ان کے ارادے توڑ دیئے اور انہوں نے مجھے قبول کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی میری امّی ہم پر سوار ہو گئی ....

"میرے دل میں خاوند کی محبت نہیں تھی۔ یہ مجھ سے چودہ سال بڑے ہیں۔ ان کے بچّے کو تو میرے دل نے قبول کیا ہی نہیں۔ میں نے ملک صاحب کو اور کوئی دھوکہ نہیں دیا، سوائے اس کے کہ ان سے بلا ضرورت پیسے لے لے کر امّی کو دیتی رہی ... پھر ہم پر یہ مصیبت

آپڑی۔ میں تو اِسے اپنی بدنیتی کی سزا سمجھنے لگی۔"

"میرا خیال ہے منیر کے ساتھ تمہاری ملاقاتیں جاری رہی ہیں" — حسنین کاظمی نے کہا — "اور اُس کے ساتھ تمہارے ...."

"نہیں، بالکل نہیں" — نسیمہ نے تڑپ کر کہا — "ایسا نہیں ہوا۔ منیر نے کہا تھا۔ اُس نے صاف کہا تھا کہ شادی اس شخص کے ساتھ کر لو اور بیوی میری بنی رہو .... کاظمی صاحب! میں نے اُسے دھتکار دیا تھا۔ اس سے پہلے اُس نے میری امّی کے ساتھ بھی کچھ گھٹیا باتیں کی تھیں .... میں کہنا یہ چاہتی ہوں کہ پہلے دوسرے تیسرے روز پھر ہر روز میرے گھر میں پتھر گرنے اور کپڑے اور لوٹے جلنے لگے تو خوف نے میرا خون خشک کر دیا۔ مجھے تو ایسے لگتا تھا جیسے سیاہ کالے پانی کا سمندر ہے اور میں اس میں ڈوب رہی ہوں۔ بچے کو جب دَورہ پڑتا تھا تو اس کا چہرہ دیکھ کر میں کانپنے لگتی تھی ....

"کاظمی صاحب! اُس وقت مجھے ماں یاد آئی تھی۔ میں سہاروں کے لئے تڑپتی تھی۔ مجھے کس نے سینے سے لگایا؟ .... میرے خاوند نے۔ ماں نے آکر کہا کہ سائیں مستانے کے پاس چلی جاؤ۔ وہ کہتی تھی کہ درویش کو خوش کر دو گی تو تمہیں اس مصیبت سے نجات مل جاتے گی۔ منیر کو بھی پتہ چل گیا ہوگا کہ مجھ پر کیا آفت ٹوٹی ہے اور ٹوٹ رہی ہے۔ سارے شہر کو پتہ چل گیا تھا۔ منیر کی ماں آئی تھی۔ منیر اس عورت کی زبانی مجھ سے پوچھ ہی لیتا کہ میں کس حال میں ہوں۔ وہ تو محبت کے دعوے کرتا تھا لیکن محبت مجھے اس سے ملی جس سے مجھے محبت نہیں تھی۔ وہ تو اپنے بچے پر اپنا سب کچھ لُٹا دینے کی باتیں کرتا تھا لیکن اُس نے مجھے اپنے وجود کی پناہ میں لے کر کہا، مت ڈرو نسیمہ! میں اپنے بچے کو تم پر قربان کر دوں گا۔ منیر نے مجھے تسلی اور مدد کا پیغام نہیں بھیجا۔"

"جو اس ساری واردات کا، تمہاری مصیبت کا مجرم تھا، وہ تم سے ہمدردی کیوں کرتا؟" — حسنین کاظمی نے نسیمہ کی جذباتی باتوں سے

متاثر ہو کر کہہ دیا — "منیر ہی تو تھا یہ سارا ...." وہ چونک کر چپ ہو گیا۔

"کیا کہا آپ نے؟" — نسیمہ نے حیرت سے پوچھا — "کیا یہ منیر نے کرایا تھا؟"

"نسیمہ!" — حسنین کاظمی نے پریشانی سے اپنے ماتھے پر ہاتھ پھیرتے ہوتے کہا — "میرے منہ سے نکل گیا ہے۔ میں الفاظ کو نگل نہیں سکتا۔ ملک صاحب کو نہ بتانا۔"

"آپ کو کیسے پتہ چلا ہے؟" — نسیمہ نے پوچھا — "کب پتہ چلا ہے؟"

"خواجہ صاحب نے بتایا ہے" — حسنین کاظمی نے جواب دیا — "جالندھر والے خواجہ صاحب میرے اُستاد ہیں۔ اُنھوں نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے۔"

"اور کیا بتایا ہے؟"

"کیا کرو گی پوچھ کر؟" — حسنین کاظمی نے جواب دیا — "تمہاری مصیبت ختم ہو چکی ہے۔ میری صرف ایک بات کو دل میں رکھ لو۔ ملک صاحب کو نہ بتانا کہ یہ کارستانی منیر کی تھی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ ملک صاحب اُس کے گلے جا پڑیں اور کسی اور مصیبت میں اُلجھ جائیں۔ منیر لوفر اور بدمعاش ہے۔ وہ غنڈہ گردی پر اُتر آتے گا۔ تمہارے خلاف کوئی بات کہہ کر ملک صاحب کے دل سے تمہاری محبت ختم کر سکتا ہے۔"

"اوہ!" — نسیمہ کے ہونٹوں سے گھبرائی ہوئی 'اوہ' نکل گئی اور اُس کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔ حیرت اور خوف سے دبی ہوئی آواز میں وہ کہنے لگی — "وہ کر سکتا ہے۔ میرے خلاف بہت کچھ کر سکتا ہے" — اُس نے ایک بار پھر حسنین کاظمی کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لیا اور التجا کے لہجے میں بولی — "اگر آپ کے دل میں میری واقعی ہمدردی ہے تو میری مدد کریں .... شادی سے اڑھائی تین مہینے پہلے کی بات ہے۔ منیر کا ایک ہندو دوست جو امرتسر میں ملازم ہے، چھٹی آیا تو ایک

کیمرہ ساتھ لایا۔ منیر نے مجھے بلایا تو میں چلی گئی۔ نہ اُس کی ماں گھر تھی نہ اُس کا باپ....

"اُس کے پاس اُس کا یہ ہندو دوست بیٹھا ہُوا تھا۔ منیر نے مجھے کہا کہ فوٹو اُتروائیں گے۔ میں بھی کچھ ایسی ہی تھی۔ میں خوش ہوئی کہ فوٹو اُتروائوں گی۔ میرا خیال تھا کہ میں منیر کے پاس بیٹھ جاؤں گی اور فوٹو اُتر جائے گی لیکن ہُوا یوں کہ منیر سٹول پہ بیٹھ گیا اور اُس نے مجھے اِس طرح اپنی گود میں بٹھا لیا کہ میرا ایک بازو اُس کے گلے میں تھا، دوسرا ہاتھ اُس کے ہاتھ میں تھا اور ہمارے گال آپس میں ملے ہُوئے تھے....

"فوٹو جب تیار ہو کر آئی تو بہت اچھی آئی تھی۔ مجھے اور زیادہ اچھی لگی کیونکہ میں منیر کے ساتھ جُڑ کر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کی ایک کاپی منیر نے اپنے پاس رکھ لی اور ایک مجھے دے دی۔ میں نے شادی سے دو دن پہلے یہ فوٹو پھاڑ ڈالی تھی لیکن دوسری کاپی منیر کے پاس ہے۔ وہ یہ فوٹو ملک صاحب کو دکھا سکتا ہے.... سارے شہر کو دکھا سکتا ہے۔ اس سے پہلے وہ مجھے دھمکی ضرور دے گا۔ یہ فوٹو تو میرے ذہن سے نکل ہی گئی تھی۔"

"میرا خیال ہے وہ ایسا نہیں کرے گا"— حسنین کاظمی نے کہا — "اگر اُسے تمہارے خلاف یہ فوٹو استعمال کرنا ہوتا تو جالندھر جا کر خواجہ صاحب سے یہ سفلی عمل نہ کراتا۔"

"اب کرے گا"— تسنیم نے کہا — "اُس کا سفلی عمل ناکام ہو گیا ہے۔ آپ نہیں جانتے۔ وہ اوچھا آدمی ہے۔ جس نے میرے خلاف اتنا خطرناک کام کرایا ہے، وہ اس فوٹو کو میرے خلاف ضرور استعمال کرے گا۔"

حسنین کاظمی نے تسنیم کو یہ نہ بتایا کہ منیر اُس کے پاس اس کام سے آئے گا کہ تسنیم ملک عمر حیات سے طلاق لے لے اور اُس کے ساتھ شادی کر لے۔

"اتنا نہ گھبراؤ تسنیم!"— حسنین کاظمی نے کہا — "میں اس کا بھی

بندوبست کر لوں گا۔"

"کیا آپ اپنے علم اور عمل کے زور سے اُس سے یہ فوٹو نہیں لے سکتے؟"

"دیکھ کر بتاؤں گا"— حسنین کاظمی نے کہا — "کچھ نہ کچھ تو ضرور کروں گا.... تم نے اپنی بات پوری نہیں کی۔ تم کچھ اور کہہ رہی تھیں۔"

"ہاں کاظمی صاحب!"— تسنیم نے آہستہ سے کہا — "میں بات تو کچھ اور کہہ رہی تھی لیکن میں تو اور ہی چکروں میں پڑ گئی ہوں.... میں کہنا یہ چاہتی تھی کہ انسان کی فطرت کیا ہے۔ میرے دل سے دھوکے اور فریب نکل گئے ہیں اور میں ملک صاحب کو اپنا پیر اور مُرشد سمجھنے لگی ہوں اور ان کے بچے شوکت کو اب دیکھتی ہوں تو ایسے لگتا ہے جیسے یہ میرے پیٹ سے پیدا ہُوا ہو۔ جن سے مجھے محبت تھی، اُن سے نفرت ہو گئی ہے.... اور کاظمی صاحب! ماں نے جس ڈھنگ سے میری تربیت کی ہے اور جو رنگ مجھ پہ چڑھاتے تھے، یہ مجھے اُس طرف کیوں نہیں لے گئے جدھر صرف جسمانی لذّت ہوتی ہے اور اسی کو زندگی کا حاصل اور مقصد سمجھا جاتا ہے؟ منیر نے مجھے کہا کہ شادی عمر حیات سے کر لو اور در پردہ میری بیوی بنی رہو۔ مجھے ایسے لگا جیسے میرا خون اُبلنے لگا ہو اور میں بارود کی طرح پھٹ کر منیر کو بھی اپنے ساتھ تباہ کر دوں گی.... پھر ماں نے مجھے کہا، بلکہ میرے پیچھے پڑ گئی کہ میں سائیں مستانے کے پاس چلی جاؤں اور وہ مجھے اس آفت سے نجات دلا دے گا۔ میری حالت پھر وہی ہو گئی۔ میں نے ماں کو جواب ہی نہ دیا۔ اب ایسے لگتا ہے جیسے یہ عورت میری ماں نہیں۔ یہ اپنے فائدے کے لئے میری عصمت کا سودا کرنا چاہتی ہے۔"

"سائیں مستانہ جو کوئی بھی ہے مجھے اس سے غرض نہیں" — حسنین کاظمی نے کہا — "اب تمہیں اُس کی مدد کی ضرورت ہی نہیں رہی۔ تمہارا گھر محفوظ ہو گیا ہے۔"

"کاظمی صاحب!" — نسیمہ نے آہ لے کر کہا — "میری ماں اس بچے کو غائب کرانا چاہتی ہے۔ کہتی ہے کہ یہ جائیداد کا وارث ہے۔ یہ نہ رہا تو ملک صاحب کی ساری جائیداد میری اولاد کو ملے گی .... مجھے جائیداد نہیں چاہیئے کاظمی صاحب! میں اس بچے کو غائب نہیں ہونے دوں گی .... میں اپنے آپ میں بے چینی محسوس کر رہی ہوں۔ کچھ سمجھ نہیں آتی یہ کیا ہے۔ کیا ہو رہا ہے۔ کبھی ایسے محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی اور مصیبت آنے والی ہے۔"

"کوئی اور مصیبت نہیں آنے والی نسیمہ!" — حسنین کاظمی نے کہا — "میں سمجھ گیا ہوں تم کیا محسوس کر رہی ہو اور کیا جاننا چاہتی ہو۔ یہ ایک انقلاب ہے جو تمہاری ذات میں آیا ہے۔ ماں نے تمہیں اُس محبت سے دُور رکھا تھا جس کے بغیر انسانی فطرت پیاسی رہتی ہے۔ پیاسی فطرت شر اور فریب کی طرف مائل ہوتی ہے لیکن شر اور فریب سے جسم کو لذت مل سکتی ہے، فطرت کی پیاس نہیں بجھ سکتی۔ تمہاری فطرت اپنے آپ کو تمہاری ماں کے سائے سے بچاتی رہی، پھر ایسا ہولناک واقعہ یا حادثہ ہو گیا جس نے تمہارے سامنے اُس محبت کو لا کھڑا کیا جس کی ضرورت تمہاری فطرت کو تھی۔ یہ وہ محبت ہے جو خدا کو عزیز ہے اور یہ محبت انسان کو شر، فریب، کجروی اور بُرے خیالوں اور ارادوں سے بچاتی ہے ...

"تمہارے لئے یہ راستہ نیا ہے۔ ماں تمہیں کسی اور راستے پر لے جا رہی تھی۔ وہ تمہاری فطرت کو کسی اور سانچے میں ڈھال رہی تھی۔ اب تم ایک دوراہے پر آ گئی ہو جہاں تم یہ پوچھنا چاہتی ہو کہ تمہارا راستہ کون سا ہے۔ تم ماں سے پوچھو گی تو وہ تمہیں وہ راستہ دکھائے گی جس پر تمہیں سائیں مستانہ ملے گا اور جس پر تمہیں اپنے خاوند کی جائیداد ملے گی۔ اس راستے پر تمہیں ایسے خاوند بھی ملیں گے جن کے ساتھ نکاح پڑھنے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ یہ جسم کا راستہ ہے جس پر ہر جسمانی ضرورت پوری ہو گی۔"

"نہیں، نہیں" — نسیمہ نے بے قرار سے لہجے میں کہا — "میں اس راستے پر نہیں جاؤں گی۔"

"تم نہیں جاؤ گی نسیمہ!" — حسنین کاظمی نے کہا — "ایک حادثہ تمہیں صحیح راستے پر لے آیا ہے لیکن تم یوں محسوس کر رہی ہو جیسے تمہارے پاؤں میں بیڑیاں پڑی ہوئی ہیں اور تم چلنے سے معذور ہو۔"

"ایسے ہی ہے" — نسیمہ نے کہا — "بالکل ایسے جیسے آپ کہہ رہے ہیں۔ میں یہی پوچھنا چاہتی تھی کہ میں گھبرا کیوں رہی ہوں؟ آگے دیکھنے سے ڈر کیوں رہی ہوں؟"

"یہ تمہاری ماں کا آسیب ہے جو تمہاری ذات پر سوار ہے" — حسنین کاظمی نے کہا — "تمہاری ذات میں تمہارا باپ بھی موجود ہے۔ یہ تمہارا ماضی ہے نسیمہ! .... نہیں، تم نہیں سمجھ سکو گی۔ میں تمہیں آسان سی بات سمجھاتا ہوں ... تم نے ذہن سے اُن رشتوں کو توڑنا نہیں جنہیں مقدس رشتے کہا جاتا ہے۔ کہتے ہیں یہ رشتے ٹوٹ نہیں سکتے۔ نسیمہ! تمہیں یہ رشتے توڑنے پڑیں گے۔ ایسی ماں کے رشتے کو تم کیسے مقدس کہو گی جو تمہیں ناپاک راستے پر لے جا رہی ہے؟ تم اپنی فطرت کے تقدس کو قائم رکھو جسے تمہاری عصمت عزیز ہے ....

"اور یہ جو تم کہتی ہو کہ تم نے منیر کو دل وجان سے چاہتے ہوئے اُس کی بے نکاحی بیوی بننے سے انکار کر دیا تھا اور تم نے اپنی ماں کا یہ حکم بھی نہیں مانا کہ سائیں مستانے کے پاس جاؤ اور اُس کا دل خوش کرو، یہ تمہاری اپنی فطرت ہے۔ یہی فطرت ہے جسے تمہاری ماں قائل نہیں کر سکی کہ تمہارے خاوند کے بچے کو غائب کرا دیا جاتے .... یہ زنجیریں توڑ دو نسیمہ! ایسی ماں کی پہنائی ہوئی بیڑیاں توڑ ڈالو۔ اُس باپ کو باپ کہنا چھوڑ دو جو ایک ناپاک بیوی کا غلام بنا ہوا ہے۔ اس رشتے کو مضبوط کرو جو تمہارے اندر خود ہی پیدا ہو گیا ہے .... ڈرو نہیں نسیمہ! ہمت کرو۔ جب کبھی کوئی وہم، کوئی وسوسہ اور کوئی خدشہ تمہیں پریشان کرے، مجھے بلا لیا کرنا۔ اُصلے کو کہہ دیا کرنا۔ وہ تمہیں میرے پاس لے آئے گا یا میں یہاں آ جایا کروں گا .... میں اب جاتا ہوں۔"

"اور وہ جو فوٹو منیر کے پاس ہے؟"

"میں اُس سے لینے کی کوشش کروں گا" — حسنین کاظمی نے کہا اور وہ نسیم کے سر پر ہاتھ پھیر کر چلا گیا۔

◆◆◆

حسنین کاظمی اس گلی کا اگلا موڑ مُڑا تو آگے سے منیر آگیا۔ حسنین کاظمی نے تو بڑی بے تکلفی اور شگفتگی سے منیر کے ساتھ ہاتھ ملایا لیکن منیر سنجیدہ تھا۔

"میں نے آپ کو اُس گھر میں داخل ہوتے دیکھا تھا" — منیر نے کہا — "میں اُس وقت سے آپ کے انتظار میں ان گلیوں میں پھر رہا ہوں۔ ان لوگوں کے ساتھ آپ کا کیا تعلق ہے؟ .... میرا خیال ہے کہ ان پر میں نے جو عمل کرایا تھا وہ آپ نے روکا تھا۔"

"تم میرے ساتھ جو تعلق قائم کرنا چاہتے ہو اُس کی بات کرو منیر!" — حسنین کاظمی نے کہا — "مجھے ہر کسی کے ساتھ تعلق رکھنا پڑتا ہے۔"

"اگر ان لوگوں کے ساتھ آپ کا تعلق ہوا تو آپ میرا کام کس طرح کریں گے؟"

"مجھ سے سوال نہ پوچھو" — حسنین کاظمی نے کہا — "اپنے کام کے لئے میرے گھر آجانا۔ میں گاؤں جا رہا ہوں۔"

"میں تانگہ لے آتا ہوں" — منیر نے کہا — "آپ کے ساتھ چلا چلتا ہوں۔"

"لے آؤ۔"

منیر تانگہ لے آیا اور دونوں اس میں سوار ہو گئے۔ تانگہ چلا تو منیر نے اپنے کام کے سلسلے میں بات شروع کر دی۔ حسنین کاظمی نے سر سے تانگے والے کی طرف اشارہ کر کے اُسے روک دیا۔

"چوہدری منیر جی!" — تانگے والے نے پوچھا — "وہ جو ملک عمر حیات کے گھر پتھر پڑتے تھے اور آگ لگتی تھی، وہ سلسلہ کہتے ہیں رُک گیا ہے۔"

"ہاں یار!" — منیر نے کہا — "سُنا ہے رُک گیا ہے۔"

"ایک روز ملک عمر حیات ریل گاڑی سے اُترا تو میرے تانگے پر گھر آیا تھا" — تانگے والے نے کہا — "بے چارہ بہت گھبرایا ہوا تھا۔ میں نے اُس سے پوچھا تھا۔ لوگوں نے اُسے بتایا تھا کہ یہ پتھر جن پھینک رہے ہیں۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ لوگ غلط کہتے ہیں۔ جنوں کو ان کے ساتھ کیا دشمنی تھی؟ یہ کسی نے اُن پر کالا جادو چلایا تھا .... آپ کا کیا خیال ہے؟"

"خدا ہی جانتا ہے بھائی!" — منیر نے کہا — "میں کیا کہہ سکتا ہوں۔"

"میں نے ایسے دو واقعے دیکھے ہیں" — تانگے والے نے کہا — "یہ تیسرا ہے۔ پہلے دونوں میں بھی ایک جوان لڑکی کا چکر تھا۔ ملک کی بیوی بھی جوان ہے اور سُنا ہے بڑی خوبصورت لڑکی ہے۔ کوئی اس کے پیچھے پڑا ہوا ہے اور لڑکی مانتی نہیں۔ سنا ہے لڑکی کی ماں چلنے پھرنے والی عورت ہے۔ یہ کوئی ایسا ہی سلسلہ لگتا ہے۔ کوئی جن نہیں۔ انسان جب شیطانی کاموں پر اُتر آتے ہیں تو شیطان اور جن بھی کانوں کو ہاتھ لگاتے ہیں .... لیکن جناب! ایک بات آپ کو بتا دوں۔ کسی پر کالے تعویذ کرانے والے کا انجام بہت بُرا ہوتا ہے۔"

منیر نے حسنین کاظمی کی طرف دیکھا۔

"کیوں سرکار!" — تانگے والے نے حسنین کاظمی سے کہا — "آپ جہاندیدہ بزرگ معلوم ہوتے ہیں۔"

"ہاں بھائی!" — حسنین کاظمی نے کہا — "کسی کا بُرا مانگنے والے کا بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔"

منیر نے کچھ بھی محسوس نہ کیا بلکہ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔ تانگہ پگڈنڈی پر ہچکولے کھاتا گیا۔ تانگے والا کچھ نہ کچھ بولتا گیا۔ کبھی تو یہ بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ اُس نے بات گھوڑے سے کی ہے یا اپنی سواریوں سے کچھ کہا ہے۔

◆◆◆

"منیر چوہدری!" — گھر جا کر حسنین کاظمی نے منیر سے پوچھا — "تم ملک عمر حیات کی بیوی کے ساتھ کیوں شادی کرنا چاہتے ہو؟ کیا تمہیں اُس سے اتنی زیادہ محبّت ہے کہ اُسی کے ساتھ شادی کرو گے یا کوئی اور وجہ ہے؟"

"محبّت تو ہے سرکار!" — منیر نے کہا — "لیکن اُس نے اور اُس کی ماں نے مجھے دُھتکارا ہے۔ میں نے اُس کی ماں کو مال کھلایا ہے۔"

"سوچ لو" — حسنین کاظمی نے کہا — "کسی کو اجاڑنے کے لئے اُلٹا عمل کرنا پڑے گا۔ تمہارا مقصد پورا ہو سکتا ہے لیکن اس کا تمہیں نقصان بھی ہو سکتا ہے۔ اگر لڑکی اس خاوند کے پاس تنگ ہو یعنی خاوند اُس کے ساتھ ظالموں جیسا سلوک کرتا ہو پھر یہ ایک نیکی ہوگی کہ اُس لڑکی کو آزاد کرا یا جائے۔ اگر لڑکی اپنے خاوند کے ساتھ خوش ہے تو اُسے اُجاڑنا گناہ ہے۔"

"میں نے سب کچھ سوچ لیا ہے" — منیر نے کہا — "مجھے یہ لڑکی چاہئے۔ اگر آپ یہ کام نہیں کر سکتے تو مجھے بتا دیں۔ میں خواجہ صاحب کے پاس چلا جاؤں گا۔"

"وہاں جانا بیکار ہے" — حسنین کاظمی نے کہا — "اُنہوں نے تمہیں اسی لئے میرے حوالے کیا ہے کہ وہ تمہارا کام نہیں کرنا چاہتے۔ اُنہوں نے مجھے کہا تھا کہ وہ ایک گناہ کر بیٹھے ہیں، دوسرا نہیں کریں گے۔ میں بھی کروں گا تو سوچ سمجھ کر کروں گا۔"

"آپ مُنہ سے بولیں" — منیر نے کہا — "آپ جتنا نذرانہ مانگیں گے دوں گا۔"

"میں کچھ بھی نہیں لوں گا" — حسنین کاظمی نے کہا — "پہلے مجھے یہ دیکھنا پڑے گا کہ یہ کام ہو بھی سکتا ہے یا نہیں۔ اگر ہو سکتا ہے تو کب۔ چاند کا حساب کرنا پڑے گا۔"

حسنین کاظمی منیر کو ٹالنا چاہتا تھا۔ اِس کا اُس نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ

اپنی اُوٹ پٹانگ اصطلاحوں میں باتیں کیں، ستاروں اور بُرجوں کے نام لئے، چاند کے راستے کا ذکر کیا اور جب دیکھا کہ منیر خلا میں بھٹکنے لگا ہے تو اُسے اگلے چاند کی تیسری رات چار ایسی چیزیں لانے کو کہا جن کا ملنا بہت ہی دشوار تھا۔

"اگر اگلے چاند کی تیسری تک یہ چیزیں نہ مل سکیں تو اس سے اگلے چاند کی تیسری کو لے آنا" — حسنین کاظمی نے کہا — "تمہارا کام کر دوں گا۔"

اصلا حسنین کاظمی سے ملنے گیا تو حسنین کاظمی نے اُسے یہ تو نہ بتایا کہ ملک عمر حیات کے گھر پر سفلی عمل کس نے کیا تھا، اُسے یہ بتا دیا کہ اِن لوگوں کی یہ مصیبت ہمیشہ کے لئے ٹل گئی ہے۔

"میں سائیں متانے اور مسجد کے امام صوفی صاحب اور پیر صاحب کو ننگا کرنا چاہتا ہوں" — اصلے نے کہا — "کیسے کروں؟"

"تمہاری کون سُنے گا اَصلے!" — حسنین کاظمی نے کہا — "تمہیں تو سب پاگل کہتے ہیں۔ ان فریب کاروں اور نوسر بازوں کی جڑیں بڑی مضبوط ہیں اور اتنی لمبی کہ لوگوں کے دِلوں تک اور عقل تک پہنچی ہوتی ہیں۔ تم ان نوسر بازوں کو ماننے والی مخلوق کو اپنا دشمن بنا لوگے۔ چپ رہو۔"

اصلا چپ رہنے والا آدمی نہیں تھا۔ وہ ملک عمر حیات کے گھر چلا گیا۔

"کیا اب بھی آپ جنّات کو مانیں گے؟" — اَصلے نے عمر حیات اور نسیمہ سے کہا — "جنّات ہوں گے، ضرور ہوں گے لیکن آپ لوگوں کے گھر میں جو کچھ ہُوا ہے یہ جنّات کا کام نہیں تھا۔ کاظمی صاحب نے مجھے ساری بات بتائی ہے۔"

"میں بھی کاظمی صاحب سے مل چکا ہوں" — عمر حیات نے کہا — "انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ یہ عمل کرانے والا کون تھا۔"

"انہوں نے مجھے بھی نہیں بتایا" — اصلے نے کہا — "لیکن یہ تو پتہ چل گیا ہے نا، کہ یہ صوفی، جوگی، سائیں متانے اور شاہ وغیرہ فریب کار اور بہروپیے ہیں .... ملک صاحب! میری مجبوری یہ ہے کہ لوگ مجھے مغز پھرا اور پاگل کہتے ہیں اس لئے میری کوئی سُنتا نہیں۔ میں ان فریب کاروں کی مٹی پلید کرنا چاہتا ہوں۔"

"نسیم!" — عمر حیات نے کہا — "تم دوسرے کمرے میں چلی جاؤ" — نسیم چلی گئی تو عمر حیات نے اُصلے سے کہا — "اِدھر میرے قریب بیٹھو .... غور سے سنو" — اُس نے اصلے کے کان میں سرگوشیاں شروع کر دیں۔

"مجھے اشارہ کر دینا" — اصلے نے عمر حیات کی بات سُن کر کہا — "میں آجاؤں گا۔"

◆◆◆

نسیم کی ماں کو اس حد تک خوشی تھی کہ اُس کی بیٹی کی مصیبت ختم ہو گئی تھی لیکن سائیں متانہ جو متانہ نقشبندی کہلاتا تھا، اُس کے ذہن سے نہیں اُترا تھا۔ اس دوران وہ دو مرتبہ آئی اور نسیم سے کہہ چکی تھی کہ وہ سائیں متانے کی بات کو مٹی میں نہ ملائے، ورنہ اُس پر معلوم نہیں کیسی آفت نازل ہو گی۔ اب وہ پھر آگئی۔

"تم تو بے فکر اور بے غم بیٹھی ہو بیٹی!" — ماں نے نسیم سے کہا — "میں فکر سے مری جا رہی ہوں۔ میں سائیں متانے کے گھر سے آرہی ہوں۔ اُس نے کہا ہے کہ دو دنوں تک تمہاری بیٹی یہاں نہ آئی تو میں مجبور ہو جاؤں گا۔ بچّہ تو نہیں رہے گا، تمہارے بیٹی غائب ہو جائے گی۔"

"میں وہاں کیسے جاؤں امّی!" — نسیم نے کہا — "بچّہ میرے ساتھ ہوتا ہے۔ ملک صاحب یہیں ہوتے ہیں .... ایک صورت ہو سکتی ہے۔ کل ملک صاحب دو تین دنوں کے لئے باہر جا رہے ہیں۔ سائیں متانے سے کہنا کل رات میرے گھر آجائے۔ بچّہ سو چکا ہوگا۔ میں اکیلی ہوں گی۔"

"اُنہیں ناراض نہ کرنا" — ماں نے کہا — "جو کہیں فوراً مان لینا پھر دیکھنا وہ تجھے کیا دیتے ہیں۔ میں ابھی سائیں صاحب کے پاس جاتی ہوں۔"

ماں اُٹھ دوڑی اور تھوڑی دیر بعد آگئی۔

"سائیں متانہ کل رات آجائیں گے" — ماں نے واپس آکر نسیم سے کہا — "وہ کوئی اُلٹی سیدھی بات کریں تو گھبرا نہ جانا۔"

نسیم مُسکرا دی۔

◆◆◆

وہ دن گزر گیا۔ رات بھی گزر گئی پھر اگلا دن بھی گزر گیا۔

شام گہری ہو جانے کے بعد جب قصبہ اُونگھ رہا تھا اور گلیاں سنسان پڑی تھیں، نسیم کے دروازے پر دستک ہوئی۔ شوکت گہری نیند سو چکا تھا۔ نسیم نے اُسے دیکھا پھر اُس نے گہرا سانس لیا جیسے گھبراہٹ پر قابو پانے کی کوشش کی ہو۔ وہ جب دروازے کی طرف چلی تو اُس نے اپنے قدموں میں لڑکھڑاہٹ محسوس کی۔ وہ ذرا سا رُکی .... دروازے پر پھر دستک ہوئی۔ نسیم دروازے کی طرف چل پڑی۔

چٹخنی کھولتے اُس کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ اُس نے دروازہ کھولا تو چرس کا بھبھوکا سیدھا نسیم کے نتھنوں سے ٹکرایا۔ اُسے چکّر سا آگیا۔ چرس کے تعفّن کے پیچھے پیچھے سائیں متانہ اندر آیا۔

"ہم نے تجھ پر رحم کیا ہے کہ آگئے ہیں" — سائیں متانے نے کہا — "تیرا پتّا کٹ چکا تھا۔ ہم نے راتوں کو چلّے کر کے تجھے بچایا ہے۔ آمیرے ساتھ .... لے چل، کہاں لے چلتی ہے۔"

متانہ ڈیوڑھی میں آیا تو نسیم نے باہر والے دروازے کی چٹخنی چڑھا دی۔ ڈیوڑھی تاریک تھی۔

"آؤ سائیں جی!" — ایک مردانہ آواز آئی — "یہ آپ کو کہاں لے چلے گی۔ آپ ہمارے مہمان ہیں۔"

"اُس کمرے میں لے چلو" — ایک اور آواز آئی۔

"قیمہ کر دو اِس کُتے کا"۔۔۔ نسیمہ نے کہا ۔۔۔ "اور صحن میں دبا دو۔"

سائیں مستانہ چار پانچ آدمیوں کی لپیٹ میں آچکا تھا۔ لوگوں کو آنے والے وقت کی خبریں دینے والا سائیں مستانہ نقشبندی قبل از وقت جان نہ سکا تھا کہ اُسے پھندے میں لایا جارہا ہے۔ یہ پھندہ اس طرح تیار کیا گیا تھا کہ نسیمہ نے ملک عمر حیات کو بتایا تھا کہ قبرستان کے قریب رہنے والا سائیں مستانہ جسے پتھر پڑنے کے دوران ایک بار گھر بلایا گیا تھا، وہ اُس کے پیچھے پڑا ہُوا ہے۔ نسیمہ نے عمر حیات کو یہ نہ بتایا کہ اُس کی ماں عمر حیات کے بچے کو غائب کرانے کا انتظام کر رہی ہے۔

عمر حیات نے اُصلے سے بات کی۔ اُصلے نے مشورہ دیا کہ مستانے کو کسی طرح گھر بلایا جاتے۔ عمر حیات نے اپنے ہاتھ میں چند ایک غنڈے اور عادی مجرم رکھے ہُوتے تھے۔ اُس نے نسیمہ سے کہا کہ وہ مستانے کو کسی رات گھر بلائے۔ نسیمہ پہلے ہی تیار تھی۔

"یہ سوچ لو نسیمہ!"۔۔۔ عمر حیات نے اُسے کہا تھا ۔۔۔ "میں بتا نہیں سکتا کہ یہ چرسی مستانہ ہمارے پھندے میں آگیا تو ہم اُس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے۔ تم گھبرا تو نہیں جاؤ گی؟"

"آپ کیا کریں گے؟"۔۔۔ نسیمہ نے کہا تھا ۔۔۔ "آپ زیادہ سے زیادہ یہ کریں گے کہ اُسے ماریں پیٹیں گے اور چھوڑ دیں گے۔ اگر آپ مجھے روکیں نہیں تو میں اس چرسی کُتے کو قتل کر دوں .... آپ نہیں جانتے میرے سینے میں کیسے کیسے طوفان اُٹھ رہے ہیں۔ میرے پنجے میں جو بھی آیا وہ زندہ نہیں نکل سکے گا۔"

اُس رات مستانہ پھندے میں آگیا تو نسیمہ نے پہلی بات یہ کہی کہ اس کا قیمہ کر کے صحن میں دبا دو۔ اُس نے ماں کو مستانے کے پاس بھیج کر عمر حیات کو بتا دیا تھا کہ مستانہ کل رات آرہا ہے۔ عمر حیات نے اپنے

آدمیوں اور اصلے کو سورج غروب ہوتے ہی بلا کر ڈیوڑھی کے ساتھ والے کمرے میں بٹھا لیا تھا۔

❖

"او تے بدبختو!"۔۔۔ سائیں مستانے نے جھومتی جھولتی آواز میں کہا ۔۔۔ "میری بے ادبی نہ کرو۔ سب کے گھروں کو آگ لگے گی۔ سب کے ...."

پیچھے سے اُس کی گردن پر اتنی زور سے گھونسہ پڑا کہ اُس کی دھمکی ادھوری رہ گئی۔ دائیں طرف سے ایسا ہی ایک گھونسہ اُس کے پہلو میں لگا اور وہ اُس طرف دوہرا ہو گیا۔ اُسے ایک کمرے میں لے گئے جو روشن تھا لیکن سائیں مستانے کے لئے اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اُس کے چرس زدہ جسم پر گھونسے اور ڈنڈے برس رہے تھے اور وہ فرش پر تڑپ رہا تھا، بلبلا رہا تھا۔

کمرے کا دروازہ دھماکے سے کھلا۔ سب نے اُدھر دیکھا۔ نسیمہ ہاتھ میں باورچی خانے کی چھُری لئے نظر آئی۔ دوسرے لمحے وہ سائیں مستانے کے سینے پر بیٹھی ہوئی تھی اور اُس کی چھُری مستانے کی شہ رگ تک پہنچ گئی تھی۔ عمر حیات نے بڑی تیزی سے اُس کے چھُری والے ہاتھ کی کلائی پکڑ لی اور اُسے اُٹھنے کو کہا۔

"چھوڑ دے مجھے عمر!"۔۔۔ اُس نے چیخ نما آواز میں کہا ۔۔۔ "میں سارے بدلے اسی سے لوں گی۔"

ملک عمر حیات نے سب سے پہلے تو یہ محسوس کیا کہ نسیمہ نے اُسے ملک صاحب یا شوکی کے ابا کہنے کی بجائے عمر کہا تھا۔ اسی سے پتہ چلتا تھا کہ وہ نارمل ذہنی حالت میں نہیں۔ پھر عمر حیات نے دیکھا کہ نسیمہ کا بازو لکڑی کی مانند ہو گیا تھا۔ پورا زور لگانے سے بھی عمر حیات نسیمہ کو مستانے کے سینے سے نہ اُٹھا سکا۔ نسیمہ کا چہرہ دیکھا تو وہ سیاہی مائل سُرخ ہو گیا تھا اور غصّے سے اُس کے دانت پِس رہے تھے۔

"اسے پیچھے کھینچ اُصلے!"۔۔۔ عمر حیات نے کہا ۔۔۔ "یہ پاگل ہو

گئی ہے۔"

اُصلے نے پیچھے سے لسیمہ کی کمر میں بازو ڈالے اور اُسے کھینچا۔ دوسرے آدمی لسیمہ کو ہاتھ لگانے سے جھجکتے تھے کہ وہ ملک عمر حیات کی بیوی تھی۔ اُصلا اس گھر میں آچکا تھا اور ان کا ہمدرد تھا۔ اُن کی اس مصیبت میں اُس نے دلچسپی لی اور ان کے لئے بھاگ دوڑ کی تھی۔

عمر حیات اور اُصلے نے مل کر بڑی مشکل سے لسیمہ کو پیچھے گھسیٹا۔ دیکھا کہ اُس کا اتنا خوبصورت چہرہ بگڑ گیا تھا۔ اس سے پتہ چلتا تھا کہ وہ دَورے کی کیفیت میں ہے۔ مستانہ جو چت پڑا تھا، بیٹھ گیا تھا۔

"یہ بچے کو غائب کرنا چاہتا ہے"۔۔۔ لسیمہ نے نظریں مستانے پر جمائے ہوئے قہر بھری آواز میں کہا ۔۔۔ "تُو بچے کی طرف آنکھ اٹھا کے بھی دیکھ .... تجھے میرے ہاتھوں مرنا ہے۔"

"کون سے بچے کو غائب کرنا چاہتا ہے؟"۔۔۔ عمر حیات نے پوچھا۔

"ساری باتیں بتاؤں گی عمر!"۔۔۔ لسیمہ نے ہانپتی اور اُکھڑی ہوئی سانسوں سے کہا ۔۔۔ "پہلے مجھے اس کی گردن پہ چھُری پھیر لینے دے۔"

"اِسے ہم زندہ نہیں جانے دیں گے لسیمہ!"۔۔۔ عمر حیات نے کہا ۔۔۔ "ہم جو کرنا چاہتے ہیں وہ تو ہمیں کر لینے دے۔"

عمر حیات اور اُصلا لسیمہ کو سونے والے کمرے میں لے گئے۔ وہ کچھ ٹھنڈی ہو گئی تھی۔

◆◆◆

"اب بتا مستانے!"۔۔۔ اُصلے نے اُس سے پوچھا۔

"تم لوگ چاہتے کیا ہو؟"۔۔۔ مستانے نے کراہتے ہُوئے پوچھا۔

"اپنی اصلیت بتا دے"۔۔۔ عمر حیات نے کہا۔

"اصلیت تم نے دیکھ نہیں لی؟"۔۔۔ مستانے نے کہا ۔۔۔ "روزی کا ذریعہ بنایا ہُوا ہے۔ لوگ بیوقوف ہیں، معلوم نہیں کیا سمجھ کر میرے پاس آجاتے ہیں۔ مجھے پہنچ والا پیر اور عامل سمجھتے ہیں۔"

"میری بیوی کو تُو کیوں بلا رہا تھا؟"

"اِس کی ماں سے پوچھو"۔۔۔ مستانے نے کہا۔

ایک آدمی نے اُس کی کمر میں بڑی زور سے لات مار کر کہا ۔۔۔ "تُو بتا.... بول، ملک صاحب نے کیا پوچھا ہے؟"

"ملک صاحب کی ساس میرے پیچھے پڑی ہوئی تھی کہ ملک صاحب کے بچے کو غائب کر دو"۔۔۔ مستانے نے کراہتے ہُوئے کہا ۔۔۔ "دوسروں کی طرح وہ بھی سمجھتی ہے کہ میرے پاس جن ہیں یا کوئی اور طاقت ہے۔ میں نے اُسے کہا تھا کہ جب تک یہ بچہ اس گھر میں ہے اس گھر پر نئی سے نئی مصیبت آتی رہے گی .... میں اس گھر میں آیا تھا۔ مجھے کچھ علم نہیں تھا یہ پتھر کہاں سے آرہے ہیں اور کپڑوں کو آگ کیسے لگتی ہے۔ ملک صاحب کی ساس مجھے پیسے دیتی تھی اور یہی رَٹ لگاتے رکھتی تھی کہ بچے کو غائب کر دو....

"پھر ایک روز آئی اور کہنے لگی کہ پتھروں اور آگ والا معاملہ تو ختم ہو گیا ہے، اب عمر حیات کے بچے کو غائب کر دو۔ میں نے اُسے کہا کہ میں نے بڑی مشکل سے پتھروں اور آگ کا سلسلہ ختم کیا ہے۔ وہ مان گئی۔ میں نے اُس سے پوچھا کہ وہ بچے کو کیوں غائب کرانا چاہتی ہے۔ اُس نے کہا کہ یہ بچہ باپ کی جائداد کا وارث ہے۔ یہ غائب ہو جائے یا مر کھپ جائے تو جائداد میری بیٹی کی اولاد کو ملے گی .... میں نے اُسے کہا کہ بچے کو غائب کر دوں گا اور ایک ہزار روپیہ لوں گا۔"

"اور میری بیوی کیا کہتی تھی؟"۔۔۔ عمر حیات نے پوچھا ۔۔۔ "کیا یہ بھی بچے کو غائب کرانا چاہتی تھی؟"

"نہیں"۔۔۔ مستانے نے جواب دیا ۔۔۔ "اگر اس کا بھی یہی مطلب ہوتا تو میرے پاس ضرور آتی۔ اِسے میں بلاتا رہا، یہ نہیں آتی۔ میں نے اس کی ماں کو بہت ڈرایا کہ یہ میرے پاس نہ آئی تو اسے بہت نقصان ہو گا۔"

"نہیں ملک صاحب!"۔۔۔ اُصلے نے کہا ۔۔۔ "بھابھی ایسی نہیں ہو سکتیں۔ آپ نے دیکھا نہیں وہ اِسے قتل کرنے کے لئے کس طرح پاگل ہو گئی تھیں؟"

"دیکھو متانے!" — عمر حیات نے کہا — "میں تجھے مہلت دیتا ہوں۔ کل شام تک اس شہر سے غائب ہو جاؤ۔ اگر میں نے تمہیں دیکھ لیا تو زندہ نہیں رہو گے۔"

متانے کی ہڈی پسلی ایک ہو چکی تھی۔ اُس سے تو بولا بھی نہیں جاتا تھا۔ وہ بڑی مشکل سے اُٹھا۔ چلنے لگا تو اُسے چکر آ گیا۔ عمر حیات کے کہنے پر اُسے پانی پلایا گیا۔ وہ پاؤں گھسیٹتا باہر نکل گیا۔

❖

"نسیمہ!" — رات کو جب اصلا اور دوسرے آدمی چلے گئے تو عمر حیات نے نسیمہ سے کہا — "کیا متانے نے ٹھیک کہا ہے کہ تمہاری ماں شوگی کو غائب کرا رہی تھی؟"

"بالکل ٹھیک کہتا ہے" — نسیمہ نے جواب دیا — "میں نے آپ کو اس لئے نہیں بتایا تھا کہ میں خود امی سے تعلق توڑ رہی تھی، لیکن میری امی ڈھیٹ عورت ہے۔ اگر میں امی کے ساتھ ہوتی تو بچہ غائب ہو چکا ہوتا۔"

"خود ہی بتاؤ تمہاری ماں کے ساتھ کیا سلوک کروں؟" — عمر حیات نے پوچھا۔

"میں اُس کا یہاں آنا بند کر دوں گی" — نسیمہ نے کہا — "اور میں اُس کے ہاں کبھی نہیں جاؤں گی۔ میں اُس کی صورت نہیں دیکھوں گی"

دوسرے روز جب عمر حیات اپنے کام پر چلا گیا تو نسیمہ کی ماں آ گئی۔ اُسے معلوم تھا کہ عمر حیات جا چکا ہو گا۔

"سائیں متانہ آیا تھا؟" — اُس نے نسیمہ سے پوچھا۔

"آیا تھا" — نسیمہ نے بے رُخی سے جواب دیا۔

"پھر؟" — ماں نے پوچھا۔

"اُسی سے جا کر پوچھ لو" — نسیمہ نے کہا — "ابھی چلی جاؤ..... یہ

خیال رکھنا امی! اُس کی بات سُن کر میرے گھر میں نہ آنا۔ تم شاید آنا بھی نہیں چاہو گی۔ یہ خیال بھی رکھنا کہ کبھی میرے خاوند کے سامنے نہ آ جانا۔"

"کیسی اُلٹی اُلٹی باتیں کر رہی ہو نسیمہ!" — ماں نے کہا — "بات کیا ہے؟"

"میں نے کہا ہے کہ اُس چرسی کُتے سے جا کر پوچھ لو" — نسیمہ نے غصے سے کہا — "بچے کو غائب کرتے کرتے وہ خود غائب ہو رہا ہے۔ آج شام سے پہلے پہلے اُسے مل لو، پھر وہ تمہیں کہیں نظر نہیں آئے گا۔"

ماں بیٹی کا انداز سمجھ گئی۔ اُس نے گھونٹ سا نگلا اور چلی گئی — پھر اپنی بیٹی کے پاس نہ آئی۔

دن کے پچھلے پہر حسنین کاظمی آ گیا۔ اُس کے ساتھ اصلا تھا۔ اصلا اُسے رات کا واقعہ سُنا چکا تھا۔ عمر حیات گھر آ چکا تھا۔

"ایک کو سُنا ہے تم لوگوں نے بھگا دیا ہے" — حسنین کاظمی نے کہا

"جی ہاں کاظمی صاحب!" — عمر حیات نے کہا — "اب ایک جوگی کی باری ہے۔"

"اس طرح کس کس کو بھگاؤ گے" — حسنین کاظمی نے کہا — "یہ سلسلہ بند کر دو۔ سائیں متانہ اور جوگی یہاں سے بھاگ کر جہاں بھی جائیں گے وہاں یہی کام کریں گے اور لوگ اِن کے مرید بن جائیں گے۔"

متانے اور جوگی کی باتیں چل پڑیں۔

"سائیں متانے نے کہا تھا کہ میری اولاد ہو گی ہی نہیں" — نسیمہ نے کاظمی سے کہا۔

"میں پہلے روز یہاں آیا تھا تو تمہیں بتایا تھا کہ انسان کو خدا نے بڑی زبردست قوتیں دی ہیں" — حسنین کاظمی نے کہا — "یہ قوتیں معجزے دکھا سکتی ہیں لیکن زندگی اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے۔"

"کاظمی صاحب!" — عمر حیات نے کہا — "سُنا ہے ہاتھ دیکھ کر بتایا

جاسکتا ہے کہ اولاد ہوگی یا نہیں ..... نسیمہ کا ہاتھ دیکھیں۔"

"مجھے اتنا زیادہ تجربہ تو نہیں" — حسنین کاظمی نے کہا — "کچھ لکیریں پڑھ سکتا ہوں .... لا بیٹی! اپنا دایاں ہاتھ دکھا ذرا!"

نسیمہ نے دایاں ہاتھ اُس کے آگے کر دیا۔ حسنین کاظمی نے جیب سے عینک نکال کر ناک پر رکھی اور نسیمہ کا ہاتھ دیکھنے لگا۔

"میری سمجھ کے مطابق اولاد تو ہے" — کاظمی نے کہا اور لکیروں کو اور زیادہ غور سے دیکھنے لگا۔

کمرے میں خاموشی تھی جیسے وہاں کوئی بھی موجود نہ ہو۔ حسنین کاظمی نسیمہ کے ہاتھ پر جھکا ہوا تھا۔ وہ اور زیادہ جُھک گیا۔ کچھ دیر بعد اُس نے سَر یوں پیچھے کیا جیسے پھن دار سانپ نے اُس پر حملہ کر دیا ہو۔

"نہیں" — اُس نے گھبرائے ہوئے سے لہجے میں ایسے کہا جیسے اپنے آپ کو کچھ کہا ہو — "نہیں ہو سکتا۔"

"کیا نہیں ہو سکتا کاظمی صاحب؟" — عمر حیات نے پوچھا۔

"اوہ!" — حسنین کاظمی جیسے بیدار ہو گیا ہو۔ کہنے لگا — "بعض لکیریں دھوکہ دیتی ہیں۔ میں شاید صحیح پڑھ نہیں سکا .... کوئی ایسی بات نہیں۔ اولاد ہوگی .... لیکن ...."

"کوئی ایسی ویسی بات ہے تو بتا دیں کاظمی صاحب!" — عمر حیات نے کہا۔

"ایسی ویسی بات!" — حسنین کاظمی کی گھبراہٹ بڑھ گئی تھی۔ وہ پھر اپنے آپ کے ساتھ بات کر رہا تھا — "نہیں نہیں!"

"کاظمی صاحب!" — عمر حیات نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر پوچھا — "کیا آپ نے میری بیوی کے ہاتھ میں کوئی بہت خطرناک اشارہ دیکھا ہے؟"

"شاید مجھے غلطی لگ رہی ہے" — حسنین کاظمی نے پہلے والی گھبراہٹ سے کہا اور اُٹھ کھڑا ہوا — "میں آپ لوگوں کو دیکھنے آیا تھا۔ میں جاتا ہوں۔"

"کاظمی صاحب!" — نسیمہ نے کہا — "آپ نے میرے ہاتھ میں کوئی خاص چیز دیکھی ہے۔"

حسنین کاظمی نے نسیمہ کو سَر سے پاؤں تک دیکھا اور کوئی جواب دیئے بغیر چلا گیا۔ اُسے یہ بھی یاد نہ رہا کہ اصلاً اُس کے ساتھ آیا تھا۔ وہ کمرے میں خوف کا تاثر چھوڑ کر اکیلا ہی نکل گیا۔

حسنین کاظمی کبھی کا جا چکا تھا لیکن ملک عمر حیات کے گھر کے اُس کمرے میں جہاں وہ بیٹھے ہوتے تھے، اُس کی موجودگی کا احساس باقی تھا۔ وہ کمرے میں خوف و ہراس کا جو تاثر چھوڑ گیا تھا، وہ گہرا ہو گیا تھا۔ کمرے میں ڈراؤنی سی خاموشی تھی۔ وہاں عمر حیات، اُس کی بیوی نسیمہ اور اُصلا بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ ایک دوسرے کی طرف دیکھنے سے ڈر رہے تھے۔

"ملک صاحب!" ـــ اُصلے نے سکوت توڑا ـــ "ہاتھ کی لکیریں ایک جال ہے۔ اس جال میں جو اُلجھ جاتا ہے اُس کا وہی حال ہوتا ہے جو مکڑی کے جالے میں آئی ہوئی مکھی کا ہوتا ہے .... آپ نے اپنے اُوپر اتنا خوف کیوں طاری کر لیا ہے؟"

"ضرور کوئی بات ہے" ـــ نسیمہ نے اُصلے سے کہا ـــ "بھائی جان! آپ کاظمی صاحب سے پوچھیں۔"

"ہاں اُصلے!" ـــ عمر حیات نے کہا ـــ "بات معمولی نہیں ورنہ کاظمی صاحب کا یہ رَدِ عمل نہ ہوتا۔ تم اُن سے پوچھنا۔ ہمیں نہیں بتائیں گے۔ تمہیں بتا دیں گے .... کیا نظر آیا ہے انہیں؟"

"آپ تو بھابی کو بھی ڈرا رہے ہیں ملک صاحب!" ـــ اُصلے نے عمر حیات سے کہا ـــ "اِن لکیروں کو اتنا بھی سچا نہ سمجھیں۔ کاظمی صاحب یہ دعویٰ نہیں کرتے کہ وہ دست شناسی کے ماہر ہیں۔ پھر بھی میں اُن سے معلوم کرنے کی کوشش کروں گا کہ اُنہوں نے بھابی کی لکیروں میں کیا دیکھا ہے۔"

"معلوم نہیں خدا نے میری قسمت میں اور کیسے کیسے حادثے لکھ رکھے ہیں" ـــ نسیمہ نے بوجھل سی آواز میں کہا ـــ "ابھی ایک مصیبت ٹلی ہے، خدا ہی جانتا ہے اور کون سی مصیبت آ رہی ہے۔"

"جب وہ مصیبت آئے گی تو دیکھ لیں گے" ـــ عمر حیات نے کہا ـــ

"اللہ اُسے بھی ٹال دے گا۔"

اُصلا ہنستا ہُوا چلا گیا۔

اُسی شام ملک عمر حیات اپنے کام سے واپس آتے ہوئے اپنے گھر جانے کی بجائے نسیمہ کی ماں کے ہاں چلا گیا۔ پہلے وہ اپنے سُسر سے مِلا۔ سُسر مفلوج سا آدمی تھا۔ لاش کی مانند پلنگ پر پڑا ایک پُرانا اخبار پڑھ رہا تھا۔ اخبار کے پردے سے ہاتھ باہر کر کے اپنے داماد سے ہاتھ مِلایا اور مُسکرایا۔

"مبارک ہو عمر!" ـــ اُس نے کہا ـــ "تمہاری مصیبت ٹل گئی ہے۔ ایک کالے بکرے کا صدقہ دے دینا۔"

"خالہ کہاں ہیں؟"

"ساتھ والے کمرے میں ہو گی" ـــ سُسر نے جواب دیا اور آگے ہو کر دھیمی آواز میں بولا ـــ "اُس سے ذرا دُور رہ کر بات کرنا۔ غصّے میں ہے آج۔ یہ دیکھ لو۔ رَدّی کے اخبار کے پیچھے چُھپا ہُوا ہُوں۔"

عمر حیات نے اپنے سُسر کو بڑی غور سے دیکھا۔ سُسر احمقوں کی طرح ہنس پڑا۔ عمر حیات کی آہ نکل گئی اور وہ دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ نسیمہ کی ماں گہری سوچ میں کھوئی ہوئی تھی۔ عمر حیات دروازے میں رُک گیا۔ اُس کی ساس کو محسوس تک نہ ہُوا کہ کوئی دروازے میں کھڑا ہے۔ وہ ٹانگیں لٹکائے، ایک ہاتھ ٹھوڑی کے نیچے رکھے، فرش پر نظریں جمائے ہُوئے تھی۔

"خالہ!"

عمر حیات کی دھیمی سی آواز پہ وہ چونک پڑی اور اُٹھ کھڑی ہُوئی۔

"آؤ.... آؤ بیٹا!" ـــ وہ اُٹھتے ہوئے اور ہکلاتے ہوئے بولی ـــ "آؤ بیٹھو.... نسیمہ اور شوکی ٹھیک ہیں نا!"

عمر حیات پہ گہری سنجیدگی اور خاموشی طاری تھی۔ اس سے نسیمہ کی ماں اور زیادہ گھبرانے لگی۔

"بیٹھو گے نہیں؟" — نسیمہ کی ماں نے پیار سے کہا — "کیا ہو گیا ہے؟ کوئی اور گڑبڑ تو نہیں؟"

"تم میرے بچے کو غائب کرانا چاہتی ہو" — عمر حیات نے ایسے لہجے میں کہا جس میں سنجیدگی کے ساتھ غصّہ بھی تھا — "میرا بچہ غائب ہو بھی گیا تو کیا میری جائداد تمہیں مل جائے گی؟"

"کیا کہہ رہے ہو عمر؟" — نسیمہ کی ماں نے حیران ہو کے پوچھا — "تمہارے بچے کو میں ...."

"ہاں تم!" — عمر حیات نے اُس کی بات کاٹ کر کہا — "اگر اپنی بیٹی کی قیمت چاہیئے تو مجھ سے لے لو.... کیا وہ غنڈہ بدمعاش جسے تم مستانہ نقشبندی کہتی ہو میرے بچے کو غائب کر سکتا ہے؟"

نسیمہ کی ماں کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا لیکن وہ معمولی ذہن کی عورت نہیں تھی سنبھل گئی۔

"معلوم ہوتا ہے تمہارے کانوں میں کسی نے میرے خلاف خوب زہر انڈیلا ہے" — نسیمہ کی ماں نے کہا — "اور تم میرے سر پر کُودنے آ گئے ہو۔"

"میں تمہیں یہ کہنے آیا ہوں کہ آئندہ میرے دروازے میں قدم نہ رکھنا" — عمر حیات نے کہا — "تمہاری بیٹی تمہارے گھر میں کبھی نہیں آئے گی۔"

"کیوں نہیں آئے گی؟" — نسیمہ کی ماں نے کہا — "میں نے بیٹی کو تمہارے ہاتھ بیچا تو نہیں۔"

"تیری بیٹی تجھ پر لعنت بھیجتی ہے" — عمر حیات نے کہا — "تو اُس کے ذریعے مجھے لوٹنا چاہتی تھی .... ذرا جا کر اپنے سائیں مستانے کا حال پوچھ لینا۔ اُس کے جسم کو اچھی طرح دیکھنا۔ شاید تمہیں کوئی جگہ نظر آ جائے جہاں اُسے ڈنڈہ یا گھونسا نہ پڑا ہو .... اور اُسے کہنا اپنے جنّوں بھوتوں کو لے آئے۔ اُسے کہنا اپنے تعویذ اور اپنی پھونکیں مجھ پر آزمائے۔"

نسیمہ کی ماں تڑپی لیکن زبان سے کچھ کہہ نہ سکی۔ اُس کے چہرے کا رنگ جو پیلا پڑ گیا تھا، سُرخی مائل ہو گیا۔ وہ دبک جانے والی عورت نہیں تھی۔ اتنی جوان اولاد کی ماں ہوتے ہوئے بھی اُسے اپنے حُسن اور اپنے لمبوترے متناسب جسم پر ناز تھا۔ اُس کی آنکھوں کی چمک ابھی ماند نہیں پڑی تھی۔ اُس کے سراپا میں اور اُس کے چہرے کے نقوش میں ایسا تاثر تھا جو دوسروں کو مرعوب کرتا تھا۔ وہ مہاراجوں اور نوابوں کے خاندان سے معلوم ہوتی تھی۔ اُس کے ہونٹوں پر جو تبسّم ہر لمحہ رہتا تھا، وہ اُس کا جادُو تھا اور دوسرا جادُو اس کی زبان کی چاشنی میں تھا۔ اپنے اس سحر سے وہ واقف تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ کس قسم کے آدمی کو کس طرح مسحور کیا جاتا ہے۔

"او، میرے پگلے بیٹے!" — اُس نے لپک کر عمر حیات کا چہرہ اپنے ہاتھوں کے پیالے میں لے لیا اور اُس کا ماتھا چُوم کر بولی — "دشمنوں نے میرے بچے اور میری بچی کو کس بُری نظر سے دیکھا ہے۔ اللہ ان حاسدوں کو اسی دنیا میں دوزخ کی آگ میں جلائے۔ آ میرا چاند! یہاں بیٹھ۔"

اُس کے کپڑوں سے لکھنؤ کے عطر کی تیز خوشبو آ رہی تھی۔ وہ اپنے بالوں میں جو تیل ڈالتی تھی وہ بھی تیز خوشبو والا ہوتا تھا۔ مردوں کو دیوانہ بنانے کے لئے یہ خوشبو اور ماتھے پہ ہونٹوں کا لمس کافی تھا۔ عمر حیات پہلے سے ہی دیوانہ ہو رہا تھا لیکن اُس کی دیوانگی کا باعث کچھ اور تھا۔ یہ دیوانگی باؤلے پن کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ اُس کے گھر پہ کالا جادو کیا گیا تھا، اُس کے بچے کو دَورے کی اذیتیں دی گئی تھیں اور اس بچے کو غائب کرنے کی سکیم بھی بن گئی تھی۔ اُس پہ اس عورت کا جادُو، اس کا بوسہ اور اس کے عطر کی خوشبو اثر نہیں کر سکتی تھی۔ اُس نے چوٹیں کھائی تھیں۔ اس عورت سے اُسے گھن آنے لگی۔

"مکّار عورت!" — عمر حیات نے اُس کے بازوؤں پہ ہاتھ مار کر اپنا چہرہ اُس کے ہاتھوں سے چھڑاتے ہوئے کہا — "تو اپنی بیٹی

سے زیادہ خوبصورت اور نوجوان تو نہیں۔ اگر وہ راز جو اُس نے مجھے بتایا ہے، کوئی اور بتاتا تو میں اُسے دھکے دے کر گھر سے نکال دیتا۔ میں تجھے صرف یہ کہنے آیا ہوں کہ کبھی میرے گھر کا رُخ نہ کرنا اور بھول جا اپنی بیٹی کو۔"

"میری بیٹی کو قیدی نہ بنا عمر!" — ماں نے رندھی ہوئی سی آواز میں کہا۔

"وہ آزاد ہے" — عمر حیات نے کہا — "تُو نے تو بیٹی مجھے دے کر مجھ پر جال پھینکا تھا لیکن اُوپر اللہ کی ذات ہے جس نے تیری بیٹی کے دل میں میری اور میرے بچے کی محبت پیدا کر دی۔ اُسے اللہ نے جھٹکا ہی ایسا دیا تھا۔ میں اُس شخص کا شکر گزار ہوں جس نے میرے گھر پر کالے تعویذ کرا کے پتھر پڑواتے تھے.... اور تُو؟.... عیار عورت! تُو نے میری اس مصیبت میں اپنی جھولی بھرنے کی کوشش کی۔ میرے بچے کو اغوا کرانا چاہا!"

"نسیمہ جھوٹ بولتی ہے" — نسیمہ کی ماں نے کہا — "بڑی حویلی میں جا کر اور چار پیسے دیکھ کر اُس کا دماغ خراب ہو گیا ہے۔"

"تیرا سائیں مستانہ تو جھوٹ نہیں بولتا" — عمر حیات نے کہا — "تُو نے تو اُس کے ساتھ اپنی بیٹی کی عصمت کا سودا کر لیا تھا۔ تُو اُسے اس چرسی کے پاس بھیج رہی تھی.... وہ تیری بیٹی نہیں میری بیوی ہے۔ اُس نے مجھے بتا دیا۔ میرے کہنے پر تیری بیٹی نے تجھے کہا تھا کہ سائیں مستانے سے کہنا کہ آج رات میرا خاوند گھر نہیں ہو گا اور مستانہ آ جاتے لیکن تیری بیٹی کا خاوند چار آدمیوں کے ساتھ گھر میں موجود تھا" — عمر حیات کی آواز میں غصے کا جوش پیدا ہو گیا — "جا، اُس سے پوچھ کہ سائیں مستانے! تیری کرامات کہاں گئی تھیں جب تجھ پر ڈنڈے اور گھونسے برس رہے تھے؟ ہم تو اُسے جان سے مار ڈالتے اور لاش غائب کر دیتے لیکن اُس نے تیری فطرت اور تیری بدکاریوں سے پردے اُٹھا کر اپنی جان بچا لی.... شام کے بعد وہ یہاں سے غائب نہ ہُوا تو صبح میں اُسے غائب

کراؤں گا لیکن وہ زندہ نہیں ہو گا۔"

نسیمہ کی ماں چپ چاپ کھڑی سُن رہی تھی۔ پہلے تو اُس کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا مگر اب اُس کے چہرے کے رنگ اور تاثر میں کوئی تبدیلی نہیں آ رہی تھی جیسے عمر حیات کی باتیں اُس پر ذرا سا بھی اثر نہ کر رہی ہوں۔ عمر حیات نے اُسے بولنے کا موقعہ ہی نہ دیا۔ وہ گھوما اور کمرے سے نکل گیا۔

نسیمہ کی ماں کے ہونٹوں پر جو تبسم ہر وقت رہتا تھا، وہ مسکراہٹ بن گیا لیکن اس مسکراہٹ میں مسرت نہیں کوئی اور ہی تاثر تھا جیسے بچھو نے ڈسنے کے لئے ڈنک تیار کر لیا ہو۔

◆◆◆

وہ سائیں مستانے کے ہاں گئی تھی۔ اُس نے وہ رات ہیجانی کیفیت میں کروٹیں بدلتے گزاری تھی جس رات مستانہ اُس کی بیٹی کے گھر گیا تھا۔ اسے پوری امید تھی کہ اُس کی بیٹی عمر حیات کے بچے کو غائب کرانے کے لئے مستانے کو وہ قیمت دیدے گی جو اُس نے مانگی ہے۔ اسی لئے تو اس کی بیٹی نے مستانے کو اپنے گھر بلایا تھا لیکن وہ ایک جال تھا جس میں مستانہ آ گیا تھا۔ صبح ہوتے ہی نسیمہ کی ماں نسیمہ کے ہاں جا پہنچی تھی اور نسیمہ نے اُسے دھتکار دیا تھا۔

وہ اپنی بیٹی کے گھر سے نکلی اور سائیں مستانے کے ہاں چلی گئی تھی۔ اُس کا دل جو نسیمہ کے ہاں جانے تک مسرور تھا، اب بوجھل تھا۔ اُسے یہ تو معلوم ہی نہیں تھا کہ رات مستانے کے ساتھ کیا سلوک ہُوا ہے، وہ اتنا جان گئی کہ کچھ ہُوا ضرور ہے اور جو کچھ بھی ہُوا ہے اچھا نہیں ہُوا۔

وہ جب سائیں مستانے کے گھر میں داخل ہوئی تھی تو ڈیوڑھی میں دو ملنگ اُداس اُداس بیٹھے تھے۔ تین عورتیں الگ کھڑی تھیں۔

"سائیں جی اندر ہیں؟" — نسیمہ کی ماں نے ملنگوں سے پوچھا۔

"ہیں تو سہی بی بی!" — ایک ملنگ نے اُسے کہا تھا — "لیکن ملیں گے نہیں۔"

"ہم بڑی دُور سے آئی ہیں" — دیہاتی سی ایک عورت نے کہا —

"یہ کہتے ہیں کہ سائیں جی ملیں گے ہی نہیں۔"

"کیوں نہیں ملیں گے؟" — نسیمہ کی ماں نے ملنگوں سے کہا — "انہیں جا کے کہو کہ ملک عمر حیات کی ساس آئی ہے۔"

تب ایک ملنگ اندر چلا گیا تھا اور واپس آکر اُس نے کہا — "تم سب چلی جاؤ۔ سائیں جی نے دو جن حاضر کئے ہوئے ہیں اور انہیں سائیں جی نے مُرغا بنایا ہُوا ہے۔ وہ سخت غصّے میں ہیں۔ یہ جن راہ جاتے لوگوں کو تنگ کرتے ہیں۔ سائیں جی سخت غصّے میں ہیں۔ تم پھر کبھی آنا۔"

وہ تینوں عورتیں تو فوراً نکل گئیں، نسیمہ کی ماں رُکی رہی تھی۔ دونوں ملنگوں نے باری باری اُسے ڈرایا کہ وہ یہاں سے چلی جاتے ورنہ اُسے نقصان پہنچے گا۔

"میں جاتی ہوں" — اُس نے کہا تھا — "سائیں جی سے میرا کہہ دینا کہ آئی تھی، پھر کبھی آؤں گی۔"

یہ تو ڈیوڑھی کی باتیں تھیں، نسیمہ کی ماں کو اندر کی باتوں کا علم نہیں ہو سکا۔ وہاں کسی جن کو مستانے نے مرغا نہیں بنا رکھا تھا، وہ خود ایسا مرغا بنا ہُوا تھا جس کی گردن پر چھری پھیر کر تڑپنے کے لئے پھینک دیا جاتا ہے۔ اُس کی ہڈیاں دُکھ رہی تھیں۔ ڈنڈوں اور گھونسوں نے اُسے کوٹ دیا تھا۔ اُسے کسی کروٹ چین نہیں آتا تھا۔ اُس کے شاگردوں نے گھی میں ہلدی کاڑھ کر اُس کے جسم پر مل دی تھی۔ اُس کی ایک آنکھ سے کچھ نیچے بھی نیلے رنگ کا نشان تھا۔ وہاں ڈنڈہ لگا تھا یا گھونسہ۔ اس حالت میں ایک ملنگ نے اُسے جا کر بتایا تھا کہ ملک عمر حیات کی ساس آئی ہے۔

"اس مکّار عورت کو ایک کمرے میں بند کر دو" — سائیں مستانے نے کہا تھا — "اسی نے مجھے کہا تھا کہ رات اس کی بیٹی کے گھر پہنچ جاؤں۔ اس بدمعاشی میں یہ بھی شامل ہے۔"

"نہیں مستانے!" — ملنگ نے اُسے کہا تھا — "وہ تو اسی طرح آتی ہے جس طرح پہلے آیا کرتی تھی۔ تمہیں ملک اور اُس کی بیوی نے جال

میں پھنسایا تھا۔ تمہیں کئی بار کہا ہے کہ اس طرح لوگوں کے گھروں میں جانے سے تمہاری قدر گھٹتی ہے، پھر وہاں کئی طرح کے لوگ ہوتے ہیں۔ پردہ اُٹھنے کا ڈر ہوتا ہے۔ یہ تمہارا اپنا قصور ہے۔"

"جاؤ، اُسے کہہ دو کہ میں آج نہیں مل سکتا" — مستانے نے کہا تھا۔

سائیں مستانے کے پاس اُس کے دو ساتھی بیٹھے ہوتے تھے۔ ان میں ایک وہ تھا جسے یہ لوگ گنجا کہتے تھے۔ اسے ایک بار مستانے نے کہا تھا کہ گیارہ بارہ سال کی عمر کے ایک بچے کو غائب کرنا ہے اور گنجے نے کہا تھا کہ وہ یہ کام کر دے گا۔ یہ بچہ عمر حیات کا بیٹا شوکت تھا۔

"اب بتا مستانے!" — گنجے نے پوچھا تھا — "کرنا کیا ہے۔ ایک تو پانچ سو روپیہ ہاتھ سے گیا اور تمہارا بھرم بھی نہ رہا۔ اچھا بھلا اڈہ تباہ ہو گیا۔"

"انتقام" — مستانے نے کہا تھا — "وہی کام کریں گے جو چھوڑ دیا تھا۔"

"ملک کو قتل کرنا ہے؟" — گنجے نے پوچھا تھا — "بچے کو اُٹھانا ہے؟ ملک کی بیوی کو اُٹھانا ہے؟"

"ان کا گھر خالی کرنا ہے" — مستانے نے کہا — "قتل یا اغوا نہیں کرنا۔ پکڑے جائیں گے۔ اگر واردات کے دوران موقعہ مل گیا تو ملک کی بیوی کو خراب کریں گے۔ اسی کے پیچھے تو میری ہڈیاں ٹوٹی ہیں۔"

"کب ارادہ ہے؟" — دوسرے ساتھی نے پوچھا تھا — "یہ خیال رکھنا کہ زیادہ آدمی ساتھ نہیں لیں گے۔ ہم تینوں کافی ہیں۔"

"آج شام تو ہم یہاں سے جا رہے ہیں" — مستانے نے کہا۔

"کیوں ڈرتے ہو مستانے!" — گنجے نے کہا — "اس طرح ہم دوسروں کے ڈر سے بھاگنے لگے تو...."

"نہیں گنجے!" — مستانے نے کہا تھا — "لڑائی جھگڑا نہیں کریں گے، ورنہ اسی میں پکڑے جائیں گے۔ پولیس ہمارے خلاف ہو گی۔ اپنی ہسٹری دیکھو۔

ہم اپنا کام کریں گے جو پیر اُستاد نے سکھایا تھا ... تین چار دن گزر جانے دو۔ آج رات ہم یہاں سے جا ہی رہے ہیں۔ ہم پر واردات کا کسی کو شک نہیں ہو گا۔"

"کوئی گھر بھیدی پھینک دیں وہاں؟" ـــــ دوسرے ساتھی نے پوچھا تھا۔

"نہیں" ـــــ مستانے نے کہا تھا ـــــ "میں نے اس مکان کو اچھی طرح دیکھا ہُوا ہے۔ وہاں جب پتھر پڑتے تھے اور آگ لگتی تھی تو ملک کی ساس مجھے وہاں لے گئی تھی۔ میں نے مکان کو اندر اور باہر گھوم پھر کر دیکھا تھا۔ گھر والے سمجھتے تھے کہ میں اُن جنوں کو دیکھ رہا ہوں جو گھر میں پتھر پھینکتے ہیں لیکن میں دیکھ رہا تھا کہ اس گھر میں کبھی داخل ہونا پڑے تو کیسے داخل ہو سکتے ہیں۔ مجھے ایک جگہ نظر آگئی تھی۔ وہاں اینٹیں ذرا باہر نکلی ہوئی ہیں۔ آسانی سے دیوار پھاند سکتے ہیں اور واپسی دروازے سے ہو گی۔"

یہ جرائم پیشہ لوگ تھے۔ رات کو کسی کے گھر میں داخل ہونا ان کے لئے مشکل نہیں تھا۔ یہ چونکہ ان کا پیشہ تھا اس لئے وہ کسی بڑی حویلی کو دیکھتے تھے تو یہ جائزہ ضرور لیتے تھے کہ اس حویلی میں کس طرح داخل ہُوا جا سکتا ہے۔ ان کے ذہن قصابوں جیسے تھے جو گلی میں سے گزرتی بھیڑ، بکری یا گائے کو دیکھتے ہیں تو جائزہ لے لیتے ہیں کہ اس میں سے کتنا گوشت نکلے گا۔

مستانے، گنجے اور ان کے تیسرے ساتھی نے ملک عمر حیات کے گھر ڈکیتی کا پروگرام بنا لیا۔ اُنہوں نے فیصلہ کیا کہ تین چار دنوں تک مستانہ چلنے پھرنے کے قابل ہو جائے گا پھر واردات کریں گے۔

نسیمہ کی ماں نے یہ رات بھی جب اُس کا داماد اُس کی بے عزّتی کر کے اور اُسے دھمکیاں دے کر چلا گیا تھا، ہیجانی کیفیت میں سوچتے گزار دی۔ اُسے یہ سوچ تو اور زیادہ پریشان کر رہی تھی کہ مستانے نے اُسے ملنے

سے کیوں انکار کر دیا تھا۔ اُس کے ذہن میں انتقام کے سوا کچھ اور آتا ہی نہیں تھا۔ اُسے معلوم نہیں تھا کہ مستانہ انتقام کا فیصلہ کر چکا ہے۔ نسیمہ کی ماں کے ذہن میں تمام رات مستانہ گھومتا پھرتا رہا تھا۔ اُسے وہ پہنچ والا اور کرامات والا سائیں سمجھتی تھی۔

اُسے اپنی بیٹی پر تو بہت ہی غصہ تھا۔ بیٹی کے لئے عمر حیات جیسے اکیلے اور امیر آدمی کو ماں نے ہی پھانسا تھا مگر بیٹی آموں کے اس پیڑ سے اکیلے ہی آم کھانے بیٹھ گئی تھی۔ ماں کے دل میں اپنی بیٹی کے لئے کوئی جذبات نہیں تھے۔ اسے تو اُس نے آلۂ کار بنایا تھا مگر اس آلے نے اُلٹا اُس کی خواہشات کا خون کر دیا۔

رات گزر گئی۔ صبح اس کے ہاں نسیمہ کی ایک سہیلی آگئی۔ اِدھر اُدھر کی باتیں ہونے لگیں۔

"خدا کا شکر ہے خالہ! نسیمہ کے سر سے بلا ٹلی" ـــــ نسیمہ کی سہیلی نے کہا ـــــ "لیکن خالہ! نسیمہ آپ سے ناراض کیوں ہے؟"

"مجھ سے؟" ـــــ ماں نے جھوٹ موٹ کی حیرت سے کہا ـــــ "میرے ساتھ اُس کی کیا ناراضگی ہو سکتی ہے؟"

"وہ تو کہتی ہے کہ میرا بس چلے تو ماں کو میں گولی مار دوں" ـــــ سہیلی نے کہا ـــــ "میں نے وجہ پوچھی تو اُس نے کچھ نہیں بتایا۔ کہنے لگی کہ کبھی تم اُدھر گئیں تو اُسے کہہ دینا کہ میرے گھر نہ آئے۔"

"تم مجھے یہ پیغام دینے آئی ہو؟" ـــــ ماں نے پوچھا۔

"نہیں خالہ!" ـــــ سہیلی نے کہا ـــــ "مجھے کیا ضرورت ہے کسی کے پیغام کسی تک پہنچانے کی۔ نسیمہ نے یہ بات کہی تو مجھے بہت افسوس ہُوا۔"

"نہیں جاؤں گی اُدھر!" ـــــ ماں نے کہا ـــــ "اُسے کہنا کہ تُو نے ماں کے احسان کا بدلہ بڑا اُلٹا دیا ہے۔"

"میں نہیں کہوں گی خالہ!" ـــــ سہیلی نے کہا ـــــ "میں نے اُسے کہا تھا کہ ماں بیٹی کی ناراضگی اچھی نہیں ہوتی۔ اس پر اُس نے

مجھے بھی جلی کٹی سنا دیں۔ اُس نے تو یہاں تک کہا ہے کہ یہ ماں نہیں ڈائن ہے۔ اُسے میرا سکون آرام نہیں اپنی عیش چاہیئے.... بس اس طرح واہی تباہی بکتی رہی۔"

"تم نے پیغام پہنچا دیا ہے"۔۔۔ نسیمہ کی ماں نے کہا ۔۔۔ "میں وہاں نہیں جاؤں گی۔"

نسیمہ کی ماں عقل والی عورت تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ اپنی اس سہیلی کو نسیمہ نے بھیجا ہے۔ ماں غصّے میں جلنے کُڑھنے لگی۔ نسیمہ کی سہیلی چلی گئی تو ماں کے سینے میں انتقام کی جو چنگاری سلگ رہی تھی وہ بھڑک کر شعلہ بن گئی۔ سہیلی کے جانے کے بعد اُس نے مستانے کے ہاں جانے کا ارادہ کیا.

◆◆◆

اُس وقت منیر اُس جوگی کے پاس بیٹھا ہُوا تھا جس کے پاس نسیمہ کی ماں ایک بار گئی تھی اور جوگی نے اُسے کہا تھا کہ اپنی بیٹی کو عمر حیات سے طلاق دلوا دے کیونکہ ان کے ناموں کے حروف اور ستارے آپس میں نہیں ملتے بلکہ ان کے ستارے ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔

"پھر میرے پیسے واپس کر دو"۔۔۔ منیر جوگی سے کہہ رہا تھا۔۔۔ "میرا کام نہیں ہُوا۔"

"میں نے اپنا کام پورا کر دیا ہے"۔۔۔ جوگی نے کہا ۔۔۔ "ذرا غور کرو کہ میں ملک عمر حیات کی ساس کو یہاں کس طرح لایا تھا۔ اپنے ایک آدمی کو اس کام پہ لگا دیا کہ ملک عمر حیات کے گھر کو دیکھتا رہے۔ جب وہاں پتھر پڑیں تو وہ ملک سے کہے کہ وہ انہیں ایک جوگی کا اتا پتہ بتاتا ہے جس کے ہاتھ میں کالے جادو کے توڑ کی طاقت ہے ....

"میرا یہ آدمی دو دن اُس محلے میں گھومتا پھرتا رہا۔ آخر اُسے پتہ چلا کہ اس گھر میں پتھر گر رہے ہیں۔ وہ وہاں جا کھڑا ہُوا جیسے اور تماشائی کھڑے تھے۔ میرا یہ آدمی جوگیا کپڑوں میں تھا۔ اس نے ملک عمر حیات سے وہی بات کہی جو میں نے اُسے بتائی تھی۔ اُس نے کہا کہ جوگی مَوج میں آگیا تو کام کر دے گا اور وہ صرف عورت کی بات سُنتا ہے لیکن اُسے نہ عورت کے جسم کے ساتھ دلچسپی ہے نہ روپے پیسے کے ساتھ....

"ملک کی ساس میرے پاس آگئی۔ میں نے جب اُسے کہا کہ یہ بچّہ تمہاری بیٹی کا نہیں تو وہ بہت حیران ہوئی کہ میں نے کیسے جان لیا ہے کہ یہ بچّہ اُس کی بیٹی کا نہیں۔ پھر میں نے ایسے ایسے چکّر چلائے، ایسی حرکتیں اور ایسی باتیں کیں کہ اُس کے پاؤں تلے سے زمین نکال دی۔ میں نے اُسے صاف کہا کہ وہ اپنی بیٹی کو طلاق دلوا دے ورنہ اُسے بہت نقصان ہوگا۔ سب سے بڑا نقصان تو میں نے اُسے یہ بتایا کہ اُس کی بیٹی کی اولاد ہوگی ہی نہیں۔"

جوگی نے منیر کو تفصیل سے سنایا کہ اُس نے کس طرح ناموں کے حروف کا گورکھ دھندا بنا کر نسیمہ کی ماں کو دکھایا تھا۔

"میں نے اُسے کہا تھا"۔۔۔ جوگی نے منیر کو سنایا ۔۔۔ "کہ تمہاری بیٹی کی شادی کسی ایسے آدمی کے ساتھ ہونی چاہیئے جس کا نام 'میم' سے شروع ہو اور درمیان میں کہیں 'ن' بھی آجائے تو یہ اور زیادہ خوش قسمتی ہوگی، لیکن وہ عورت طلاق کا نام نہیں لے رہی تھی، ایک ہی بات کہتی تھی کہ ملک عمر حیات کے بچے کو غائب کراؤ۔ میں کہتا تھا کہ بچے کا اس میں کوئی قصور نہیں، تم بیٹی کا بھلا چاہتی ہو تو اسے اس آدمی سے طلاق دلاؤ....

"میں نے اُسے بہت ڈرا کر رخصت کیا تھا لیکن رات کو سائیں مستانے کے دو آدمی آگئے۔ ملک کی ساس اُس کی مریدنی معلوم ہوتی ہے۔ اُس کے پاس گئی ہوگی اور اُسے بتایا ہوگا کہ میں نے اُسے کیا کہا ہے۔ مستانے کے آدمیوں نے مجھے دھمکیاں دیں۔"

"مستانہ تو سنا ہے کچھ علم رکھتا ہے"۔۔۔ منیر نے کہا ۔۔۔ "لوگ اُس کے پاس جاتے ہیں۔"

"اتنا ہی علم رکھتا ہے جتنا میں رکھتا ہوں"۔۔۔ جوگی نے کہا ۔۔۔ "اُسے میں جانتا ہوں اور وہ مجھے جانتا ہے۔ پکّا ڈکیت تھا۔ کسی استاد نے اسے

اس لاٹن پر ڈال دیا تھا۔ اس میں چل نکلا۔ مسلمانوں کی عورتیں تو اس کے پاس مرادیں لے کر جاتی ہی ہیں، ہندوؤں اور سکھوں کی عورتوں میں بھی اُس کا نام چلتا ہے .... دیکھ منیر میاں! انسان کو اپنی خواہشیں گمراہ کرتی ہیں۔ یہ تو تمہیں معلوم ہے کہ میرے پاس کوئی علم اور کوئی طاقت نہیں۔ صرف زبان کی طاقت ہے۔ میری اُستادی یہ ہے کہ میں جانتا ہوں کہ کس موقعے پر کون سے الفاظ جادو کا اثر کرتے ہیں۔ لوگ اپنی خواہشوں اور اپنی مشکلوں کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہیں۔ تم جا کے لوگوں سے کہو کہ یہ جوگی نوسر باز ہے، دھوکہ باز ہے، تمہاری کوئی نہیں سُنے گا۔ مجھ جیسے اور سائیں منانے جیسے اور تمہارے پیروں اور گدی نشینوں جیسے آدمی لوگوں کی امیدوں اور مرادوں کا سہارا ہوتے ہیں۔ سہارا جھوٹا ہی ہو، لوگ اسے چھوڑتے نہیں۔"

"جانے دو ان باتوں کو یار!" — منیر نے کہا — "میرا کام تم سے نہیں ہُوا۔ میرا کام کر دو یا میرے پیسے واپس کرو۔"

"منیر میاں!" — جوگی نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا — "میں نے اپنا کام کر دیا ہے۔ پیسہ ایک بھی واپس نہیں کروں گا۔ یہ کر سکتا ہوں کہ عمر حیات کی بیوی کو اٹھوا لاؤں گا اور تمہیں یہاں بلا لوں گا۔ آگے تمہاری عقل اور ہمت ہے کہ لڑکی سے منوا لو کہ خاوند سے طلاق لے لے اور تمہارے ساتھ شادی کر لے .... کہو، منظور ہے؟ .... دو ہزار روپیہ لوں گا۔"

"نہیں" — منیر نے کہا — "یہ تو زبردستی والی بات ہُوئی نا!"

"میں یہی کر سکتا ہوں" — جوگی نے کہا — "میرے ہاتھ میں کوئی علم ہوتا تو میں اس کے زور پر اُسے یہاں بلا لیتا .... دوسری صورت یہ ہے کہ عمر حیات کی ساس کو کسی طرح میرے پاس بھیجو۔ اگر وہ دو بار اور آجاتی تو میں اس کی بیٹی کو بلا لیتا اور اسے اتنا ڈراتا کہ وہ خاوند کے گھر جانے کی بجائے اپنی ماں کے پاس چلی جاتی .... اب تم سوچ لو .... میں تمہیں ایک اور بات کہنا چاہتا ہوں۔ تمہیں لڑکیوں کی کیا کمی ہے؟ اس لڑکی میں تم نے کیا وصف دیکھا ہے؟ جائداد والی ہے؟ امیروں کی بیٹی ہے؟"

"میرے دل کو اچھی لگتی ہے" — منیر نے کہا — "مجھے اس پر غصّہ بھی ہے۔ اس نے میری بے عزّتی کی ہے۔ یہ وجہ بھی ہے کہ میں نے ماں بیٹی کو پیسہ بہت کھلایا ہے۔ میرے اندر ایک خرابی بھی ہے۔ میرے دل میں ایک ارادہ آجاتے تو وہ میں پورا کر کے رہتا ہوں۔"

"ایک راستہ ہے" — جوگی نے کہا — "ملک عمر حیات کو پار کر دو۔"

"قتل؟"

"قتل" — جوگی نے کہا — "کر سکو گے؟ .... طریقہ میں بتاؤں گا۔"

"سوچنے دو" — منیر نے کہا — "تم کیا طریقہ بتاؤ گے؟ .... زہر دلوا دوں؟"

"کس کے ہاتھ سے؟"

"ہاں!" — منیر نے کہا — "یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔"

"کہیں باہر بھی اسے قتل نہ کرنا" — جوگی نے کہا — "تمہارے کھُرے تمہیں پکڑوا دیں گے .... آدھی رات کے بعد اُس کے گھر میں داخل ہو جاؤ۔ آج کل موسم ایسا ہے کہ لوگ لحاف اور رضائیاں لے کے برآمدوں میں یا کمروں میں دروازے کھول کر سوتے ہیں۔ کوئی ہتھیار استعمال نہ کرنا۔ سانس روک کر مارنا۔"

جوگی منیر کو پیسے واپس نہیں کرنا چاہتا تھا۔ وہ تجربہ کار جرائم پیشہ تھا۔ اُس نے منیر کے دماغ میں قتل کا بیج بو دیا اور اسے قتل کے طریقے بتاتا چلا گیا۔ منیر کی تو شخصیت ہی کھوکھلی تھی۔ اکلوتا بیٹا تھا جسے ماں باپ کے غیر ضروری لاڈ اور پیار نے خود سَر اور سرکش بنا دیا تھا۔ زمین جائداد اور روپے پیسے کی کمی نہیں تھی۔ وہ تو اب اپنے ماں باپ کے قابو میں بھی نہیں رہا تھا۔ انسان کی ہر خواہش تو پوری نہیں ہو سکتی۔ منیر کو لڑکپن میں کسی نے بتایا تھا کہ تعویذوں سے اور کالے علم سے ہر خواہش پوری ہو سکتی ہے۔ چنانچہ وہ

عاملوں وغیرہ کی دُنیا میں جا پہنچا تھا۔ کسی عامل، جوگی یا ہر اُس شخص کی بات اُس کے لئے آسمان سے اُترا ہُوا فرمان ہوتا تھا جس کے متعلق اسے کوئی بتا دیتا تھا کہ اُس کے ہاتھ میں کوئی غیبی یا پُراسرار قوّت ہے۔ اب یہ جوگی اُسے کہہ رہا تھا کہ وہ عمر حیات کو قتل کر دے تو وہ بڑے غور سے سُن رہا تھا وہ جب جوگی کے گُف سے نکلا تو اُس کے ذہن پر عمر حیات سوار تھا

نسیمہ کی ماں ایک بار پھر سائیں مستانے کے ہاں گئی تھی، لیکن اسے مستانہ نہیں ملا تھا۔ ڈیوڑھی میں وہی دو ملنگ بیٹھے تھے جنہوں نے ایک روز پہلے اُسے کہا تھا کہ سائیں مستانہ کسی سے نہیں ملے گا۔ آج انہوں نے اسے یہ بُری خبر سنائی کہ سائیں مستانہ کچھ کہے بغیر چلا گیا ہے۔

"کب تک واپس آئیں گے؟" — نسیمہ کی ماں نے پوچھا۔

"شاید کبھی نہیں" — ایک ملنگ نے جواب دیا تھا — "سیلانی آدمی ہیں، معلوم ہوتا ہے کہ رات کو انہیں کوئی اشارہ ملا تھا۔ اُٹھے اور چلے گئے۔ ہمارے ساتھ اُنہوں نے جاتے ہوئے ہاتھ ملایا اور اتنا ہی کہا تھا کہ اللہ کو منظور ہُوا تو کبھی ملیں گے۔ اُن کے وہ دو خاص مرید جو ہر وقت اُن کے دربار میں رہتے تھے، ان کا سامان لے کر ان کے پیچھے پیچھے چلے گئے تھے۔"

نسیمہ کی ماں کچھ دیر وہیں سر جھکائے کھڑی رہی۔ مستانہ اُس کا آخری سہارا تھا۔ وہ بھی گیا۔ وہ سر جھکائے ہُوئے وہاں سے نکلی اور یوں قدم گھسیٹتی ہوئی چل پڑی جیسے اُس نے حالات کے آگے ہتھیار ڈال دیئے ہوں۔ کچھ دیر چلتے چلتے اُس کی نظریں زمین سے اُٹھیں اور اُس نے سامنے دیکھا، منیر چلا آ رہا تھا۔ وہ جوگی کی گُف سے آ رہا تھا۔ وہاں کوئی آبادی نہیں تھی۔ کھیت بھی نہیں تھے۔ بنجر اور غیر آباد سا علاقہ تھا۔ دونوں میں سے کسی نے بھی راستہ بدلنے کی کوشش نہ کی۔ دونوں نے دائیں بائیں اور پیچھے یوں دیکھا جیسے دیکھ رہے ہوں کہ کوئی انہیں دیکھ تو نہیں رہا۔ تھوڑا

سا فاصلہ تھا جو فوراً ہی طے ہو گیا۔

"کہاں سے آ رہی ہو خالہ؟" — منیر نے پوچھا اور رُک گیا۔

"خانقاہ پر سلام کرنے گئی تھی" — نسیمہ کی ماں نے جھوٹ بولا۔

"ابھی تک ناراض ہو خالہ؟"

"نہ منیر بیٹا!" — نسیمہ کی ماں نے پیار سے لہجے میں جواب دیا — "تیرے ساتھ میری کیا ناراضگی ہے؟"

"خالہ!" — منیر نے آہ سی لے کر کہا — "نسیمہ کے گھر پر جو مصیبت آئی تھی وہ میں سُنتا رہا ہوں۔ کئی بار خیال آیا کہ وہاں جاؤں تو اور کچھ نہیں تو نسیمہ اور تمہارے داماد کو تسلّی ہی دے دوں لیکن میں نے صبر کیا اور نہ گیا۔ مجھے ڈر تھا کہ ملک عمر حیات کچھ اور ہی نہ سمجھ بیٹھے۔"

"خدا نے وہ مصیبت تو ٹال دی ہے" — نسیمہ کی ماں نے کہا — "اب تو وہ سکون اور آرام میں ہے۔"

"میں اگر بات کروں گا تو تم کہو گی کہ جھوٹ بولتے ہو" — منیر نے جھوٹ بولتے ہوئے کہا — "مجھے معلوم تھا کہ یہ نہ جن ہیں نہ کوئی شر شرارہ ہے۔ کسی دشمن نے اُلٹے تعویذ کروا دیئے تھے جن کا اثر یہ ہُوا کہ کتنے ہی دن تک نسیمہ کے گھر پر پتھر برستے رہے۔ میں پہلے امرتسر گیا۔ سُنا تھا کہ ایک آدمی کالے تعویذوں کا توڑ کرتا ہے۔ وہ آدمی مجھے وہاں نہ ملا۔ وہیں سے پتہ چلا کہ ہوشیارپور میں ایسا ہی ایک تجربہ کار آدمی ہے۔ میں امرتسر سے سیدھا ہوشیارپور چلا گیا اور وہ آدمی مجھے مل گیا۔ میں نے اُس کے ساتھ بات کی۔ اُس نے بھی یہی کہا کہ یہ کسی دشمن کی کارستانی ہے۔ میں نے اُسے کہا کہ میں اُس کی جھولی بھر دوں گا، وہ ہمیں اس مصیبت سے نجات دلا دے۔ اُس نے مجھ سے منہ مانگے پیسے لئے اور کہنے لگا کہ دو دنوں بعد یہ سلسلہ ختم ہو جائے گا۔ میں واپس آگیا۔ جیسے اُس نے بتایا تھا، ویسے ہی ہُوا۔"

"تُو نے تو بڑا کرم کیا بیٹے!" — نسیمہ کی ماں نے کہا — "میری بیٹی کی تو جان پر بنی ہوئی تھی۔"

"میری نیّت تم جیسی نہیں خالہ!" — منیر نے کہا — "تمہیں بُرا

تو لگے گا، لیکن سچ بات یہ ہے کہ تم نے عمر حیات کے پیسے کو بیٹی دی ہے .... تمہیں کچھ ملا؟"

"یہ فیصلہ میرا تو نہیں تھا منیر!" — نسیمہ کی ماں نے شکایت اور پیار کے ملے جُلے لہجے میں کہا — "میں تو بیٹی کا رشتہ تمہیں دینا چاہتی تھی۔"

"میں تو اب بھی نسیمہ کی خاطر کنوارہ پھر رہا ہوں" — منیر نے کہا — "اگر نسیمہ نہیں ملے گی تو ساری عمر شادی نہیں کروں گا .... کیا تم اپنی بیٹی کو عمر حیات سے طلاق دلوا سکتی ہو؟"

"کیا تم اس کام کو اتنا آسان سمجھتے ہو؟" — نسیمہ کی ماں نے کہا۔

"خالہ!" — منیر نے کہا — "مُنہ سے بولو، کیا مانگتی ہو۔ بیٹی کو طلاق دلواؤ اور اُس کا نکاح میرے ساتھ کر دو۔"

"عمر حیات طلاق دے گا نہیں" — نسیمہ کی ماں نے کہا — "ایک ہی طریقہ ہے کہ عمر حیات اپنی آئی پر مر جاتے تو نسیمہ تمہیں مل سکتی ہے۔"

"خالہ!" — منیر نے ہنستے ہوئے کہا — "تم نے تو یوں بات کی ہے جیسے تم چاہتی ہو کہ تمہارا داماد مر ہی جائے۔ کوئی ماں اپنی بیٹی کے سہاگ کے متعلق ایسی بات مُنہ سے نہیں نکالتی۔"

نسیمہ کی ماں نے ڈسنے کے لئے ڈنک تیار کر لیا۔ اُس نے نظروں سے اور عقل سے منیر کو بھانپا اور دیکھا کہ عمر حیات سے انتقام لینے کے لئے منیر کو آلۂ کار بنایا جا سکتا ہے یا نہیں۔ منیر کو وہ جانتی تھی۔ اُسے معلوم تھا کہ یہ کھوکھلا سا انسان ہے اور اسے بھڑکایا جا سکتا ہے۔ اب تو یہ عورت اپنی بیٹی کو بھی بخشنے کے لئے تیار نہیں تھی۔ اُس نے اپنے چہرے پر اُداسی اور مایوسی کا تاثر پیدا کر لیا۔

"کیوں خالہ!" — منیر نے پوچھا — "کچھ پریشان سی لگتی ہو۔"

"کچھ پریشان؟" — نسیمہ کی ماں نے کہا — "میں تو بہت ہی پریشان ہوں .... مجھے ایسے لگتا ہے جیسے میں نے تمہارا جو دل دکھایا تھا اس کی مجھے اور میری بیٹی کو سزا مل رہی ہے۔"

"وہ سزا تو میں نے ختم کر دی ہے خالہ!" — منیر نے کہا۔

"میں اُس کی بات نہیں کر رہی منیر!" — نسیمہ کی ماں نے کہا — "تم پتھروں کی اور آگ کی بات کر رہے ہو۔ اچھا ہُوا کہ تم مل گئے ہو۔ نہ ملتے تو شاید میں تمہیں خود ملتی۔ عمر حیات بہت بڑا دھوکہ باز ثابت ہُوا ہے۔ اُسے تو ہانڈی روٹی اور دوسرے کاموں کے لئے نوکرانی کی ضرورت تھی۔ اُس نے نسیمہ کو نوکرانی کا درجہ دے دیا۔ اُسے میرے پاس بھی نہیں آنے دیتا۔ اپنے گھر میں اُس نے میرا داخلہ بھی بند کر دیا ہے۔ نسیمہ کے متعلق پتہ چلا ہے کہ دن رات روتی ہے۔ نسیمہ کے باپ کو تم جانتے ہو، کسی کام کا آدمی نہیں۔ نسیمہ کے بھائی ہوتے نہ ہوتے ایک برابر ہیں۔ میں اکیلی اور عورت ذات کیا کر سکتی ہوں۔ تم نے تو طلاق کی اب بات کی ہے، میں تو کبھی کی سوچ رہی ہوں کہ اُسے عمر حیات سے کس طرح آزاد کراؤں۔"

"کوئی طریقہ سمجھ میں نہیں آیا؟" — منیر نے پوچھا۔

"نہیں" — نسیمہ کی ماں نے آہ لے کر کہا — "اسی لئے تو میرے مُنہ سے یہ الفاظ نکل گئے تھے کہ وہ اس دُنیا سے ہی اُٹھ جاتے، لیکن خدا بُرے آدمی کو بڑی لمبی ڈھیل دیتا ہے۔"

"خالہ!" — منیر نے کہا — "اگر عمر حیات دُنیا سے اُٹھ جاتے تو وعدہ کرتی ہو کہ نسیمہ کا نکاح میرے ساتھ کرا دو گی؟ جو کہو گی دوں گا۔"

"تم تو یوں بات کرتے ہو جیسے اُس کی زندگی اور موت تمہارے اختیار میں ہے" — نسیمہ کی ماں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

"تم اِن باتوں کو چھوڑو خالہ!" — منیر نے کہا — "تم میرے ساتھ پکا وعدہ کرو۔"

"ہُوا وعدہ منیر!" — نسیمہ کی ماں نے کہا۔

منیر نے اِدھر اُدھر دیکھ کر نسیمہ کی ماں کا ایک ہاتھ اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر دبایا۔

"اگر تم وعدے سے پھر گئیں خالہ! تو تمہارا بھی اور نسیمہ کا بھی انجام

بہت بُرا ہوگا" — منیر نے کہا — "اگر وعدہ پورا کر دو گی تو تمہارے دن پھر جائیں گے۔"

منیر چلا گیا۔ اُس کے دماغ پر خون سوار ہو گیا تھا۔ جرائم پیشہ جوگی نے بھی اُسے یہی مشورہ دیا تھا کہ عمر حیات کو پار کر دو۔ اُس نے طریقے بھی بتا دیئے تھے۔ نسیمہ کی ماں نے بھی یہی کہا تھا بلکہ اس عورت نے تو خواہش ظاہر کی تھی۔ منیر نے یہ چالاکی کی تھی کہ نسیمہ کی ماں پر اُس نے ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ اُس نے عمر حیات کو راستے سے ہٹانے کا فیصلہ کر لیا ہے لیکن وہ نہیں جانتا تھا کہ نسیمہ کی ماں اُس سے کہیں زیادہ چالاک ہے۔ وہ منیر کا ارادہ بھانپ گئی تھی اور وہ یہی چاہتی تھی۔

◆◆◆

"تم پوچھ کر کرو گے کیا؟" — حسنین کاظمی اُصلے سے کہہ رہا تھا — "تم انہیں جا بتاؤ گے۔ معلوم نہیں اُن پر اس انکشاف کا کیا اثر ہو۔"

"نہیں بتاؤں گا کاظمی صاحب!" — اُصلے نے کہا — "میں نے تو انہیں کہا تھا کہ ان لکیروں میں کچھ بھی نہیں.... ایک تو مجھے سچ بتائیں کہ نسیمہ کی لکیروں میں آپ نے کیا دیکھا ہے، دوسرے مجھے جھوٹ موٹ کی کوئی بات بتائیں جو میں انہیں بتا کر اُن کا خوف ختم کر دوں۔"

عمر حیات اور نسیمہ نے اُصلے سے کہا تھا کہ وہ حسنین کاظمی سے پوچھے کہ اُس نے نسیمہ کے ہاتھ کی لکیروں میں کیا دیکھا تھا۔ اُصلا حسنین کاظمی کے گاؤں چلا گیا اور اُس کے گھر میں بیٹھا اُس کے پیچھے پڑا ہوا تھا۔

"اُصلے بھائی!" — حسنین کاظمی نے کہا — "اگر تم صحیح بات معلوم کرنا ہی چاہتے ہو تو میں تمہارے سپرد ایک کام کرتا ہوں۔ تم ان دونوں سے بے تکلف ہو۔ اس دوستی کو اور بڑھاؤ اور نسیمہ کا خیال رکھو۔"

"کیا کرے گی وہ؟" — اُصلے نے پوچھا۔

"قتل" — حسنین کاظمی نے جواب دیا — "یا خودکشی۔"

اُصلا حسنین کاظمی کے منہ کی طرف دیکھنے لگا۔ وہ حسنین کاظمی کی پیش گوئی کو صحیح نہیں ماننا چاہتا تھا۔

"اُس کے ہاتھ کی ایک لکیر بڑی صاف ہے" — حسنین کاظمی نے کہا — "میں یہ دعوے نہیں کرتا کہ میں دست شناسی کا ماہر ہوں لیکن تین چار لکیریں ایسی ہیں جو میں اس طرح بلا شک و شبہ پڑھ سکتا ہوں جس طرح اپنا نام پڑھ لیا کرتا ہوں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس لڑکی کی قسمت میں لکھا ہے کہ وہ کسی کو قتل کرے گی یا خودکشی کرے گی۔ اس کے ہاتھ کی ایک لکیر بتاتی ہے کہ اس لڑکی میں قتل کرنے کی صلاحیت موجود ہے اور بعض حالات میں یہ لڑکی اپنے آپ پر قابو نہیں رکھ سکتی۔ اس کی شخصیت بدل جاتی ہے اور یہ مرنے مارنے پر آ جاتی ہے۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں" — اُصلے نے کہا — "میں اسے اس کیفیت میں دیکھ چکا ہوں۔ میں نے آپ کو سنایا تھا کہ ہم نے سائیں مستانے کو دھوکے میں ملک صاحب کے گھر بلایا اور اُسے خوب پیٹا تھا۔ میں نے آپ کو ایک بات نہیں سنائی تھی۔ مستانہ فرش پر پڑا تڑپ رہا تھا۔ نسیمہ دوسرے کمرے میں تھی۔ اچانک وہ آ گئی۔ اُس کے ہاتھ میں چھری تھی۔ وہ مستانے کے پیٹ پر بیٹھ گئی اور چھری اُس کی شہ رگ پر رکھ دی۔ اگر ملک عمر اُسے پکڑ نہ لیتا تو وہ مستانے کی شہ رگ کاٹ دیتی۔ وہ تو پاگل ہو گئی تھی کاظمی صاحب! اُس کے بازو اکڑ گئے تھے۔ جسم میں اتنی طاقت آ گئی تھی کہ میں نے اور ملک عمر نے اُسے بڑی ہی مشکل سے پیچھے گھسیٹا تھا۔"

"تم نے دیکھا نہیں ہوگا" — حسنین کاظمی نے پوچھا — "اُس کے چہرے پر تاثر کیسا تھا؟"

"دیکھا تھا کاظمی صاحب!" — اُصلے نے جواب دیا — "چہرہ سُرخ، آنکھیں سُرخ، دانت باہر کو آتے ہوتے .... اور کیا بتاؤں کاظمی صاحب! اتنا حسین چہرہ بگڑ کر بھدا انہیں ڈراؤنا بن گیا تھا۔ یہ تو مرگی، ہسٹیریا یا پاگل پن کا دَورہ تھا۔"

"پاگل پن کا!" — حسنین کاظمی نے کہا — "قتل یا خودکشی اتنے سے ہی وقت کے پاگل پن کا نتیجہ ہوتا ہے جتنا وقت نسیمہ دَورے کی حالت میں

رہی تھی۔۔۔۔ زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ۔۔۔۔ قتل یا خودکشی کو تو ایک
لمحے کا پاگل پن کہتے ہیں۔۔۔۔ نسیمہ میں یہ پاگل پن موجود ہے۔"

"کیا یہ ضروری ہے کہ وہ کسی نہ کسی کو قتل کرے گی؟" ــــ اُصلے نے پوچھا۔

"کسی کو یا اپنے آپ کو" ــــ حسنین کاظمی نے کہا ــــ "میں سوچ رہا ہوں کہ ملک عمر حیات کو بتاؤں یا نہ بتاؤں۔"

"بتا دینا بہتر رہے گا" ــــ اُصلے نے کہا ــــ "اس سے یہ ہوگا کہ ملک اُس کا خیال رکھے گا۔ جب کبھی نسیمہ پر یہ دَورہ پڑے، ملک اُسے سنبھال لے گا، لیکن نسیمہ کو کیا بتائیں گے؟"

"یوں کرو میرے بھائی!" ــــ حسنین کاظمی نے کہا ــــ "ملک عمر حیات کو صحیح بات بتا دو اور اُسے کہنا کہ مجھ سے مل لے، اور نسیمہ کو بتانا کہ اُس کی طبیعت میں غصہ اتنا زیادہ ہے کہ اُس نے غصے پر قابو نہ پایا تو اُسے بہت نقصان پہنچے گا۔"

◆

انسان جس قدر بیوقوف ہوتا ہے وہ اپنی اَنا کے متعلق اتنا ہی حساس ہوتا ہے۔ اُس میں دُور اندیشی نام کو نہیں ہوتی۔ وہ سوچا نہیں کرتا کیونکہ اُس کی عقل پر جذبات کا غلبہ ہوتا ہے اور وہ لازمی طور پر انتقام پسند ہوتا ہے۔ اُس کا ذہن عفو اور درگذر کو قبول نہیں کرتا۔ صلح جُوئی کو وہ بزدلی اور اپنی توہین سمجھتا ہے ــــ یہ نفسیاتی کیفیت منیر کی تھی۔

منیر حسنین کاظمی کے گھر گیا۔ اُس کے پاس وہ تمام چیزیں تھیں جو حسنین کاظمی نے اُسے بتائی تھیں کہ عمل کے لئے درکار ہیں۔ حسنین کاظمی کا خیال تھا کہ ان میں دو چیزیں ایسی ہیں جن کا حصول دشوار ہے، لہٰذا اس بہانے وہ منیر کو ٹال دے گا لیکن منیر نے یہ چیزیں ڈھونڈ نکالی تھیں۔ اُس کے پاس روپیہ پیسہ تھا جو اُس نے بے دریغ خرچ کیا تھا۔

حسنین کاظمی یہ چیزیں دیکھ کر پریشان ہو گیا۔ وہ اُس کا کام نہیں کرنا چاہتا تھا۔ منیر چاہتا تھا کہ ملک عمر حیات نسیمہ کو طلاق دے دے۔ اگر

نہ دے تو وہ مر جائے یا سفلی عمل کے ذریعے اُس میں ایسا جسمانی یا ذہنی نقص پیدا ہو جائے کہ نسیمہ اُس سے طلاق لے لے۔ حسنین کاظمی اِس علم سے واقف تھا اور یہ کام کر سکتا تھا لیکن وہ شیطانی عمل کو گناہِ کبیرہ سمجھتا تھا۔ اُس نے منیر کو دیکھتے ہی سوچ لیا کہ وہ اِس شخص کو کس طرح ٹالے گا۔

"اب میرا کام ہو جانا چاہیئے سرکار!" ــــ منیر نے حسنین کاظمی سے کہا ــــ "آپ نے جو چیزیں بتائی تھیں وہ لے آیا ہوں۔ اب بتائیں کہ رقم کتنی پیش کروں۔"

"میری بات غور سے اور ٹھنڈے دل سے سُننا منیر!" ــــ حسنین کاظمی نے کہا ــــ "تم میرے بیٹے بھی ہو چھوٹے بھائی بھی ہو۔ میری نیت پر تمہیں شک نہیں ہونا چاہیئے۔ میں تم سے جتنی رقم مانگوں گا، تم دے دو گے۔ میں تم سے اور بھی بہت کچھ لے سکتا ہوں۔ تمہارا کام بھی کر سکتا ہوں۔ اس کے بعد تمہارا انجام جو کچھ بھی ہو، اِس سے مجھے کیا! لیکن میں تمہارا کام نہیں کروں گا۔"

"خدا کے لئے سرکار!" ــــ منیر نے التجا کی ــــ "مجھ پر یہ ظلم نہ کریں۔ میرا کام کر دیں۔"

"کام کر دینا تم پر ظلم ہوگا" ــــ حسنین کاظمی نے کہا ــــ "میں نے تمہیں کہا ہے کہ میری بات غور سے سنو۔۔۔۔ جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جانتے۔ میں تمہارا کام کر سکتا ہوں۔ تمہاری شادی نسیمہ کے ساتھ ہو جائے گی لیکن ایک ہی مہینے بعد تمہارا جو حال ہوگا وہ تمہاری سوچ کے دائرے میں نہیں آسکتا۔"

"آپ نے مجھے پہلے نہیں بتایا۔"

"میں نے اُس وقت دیکھا نہیں تھا" ــــ حسنین کاظمی نے کہا ــــ "پرسوں رات حساب نکالا ہے۔ ہمیں سب سے پہلے حساب نکال کر دیکھنا پڑتا ہے کہ اِس سائل کا کام ہو بھی سکے گا یا نہیں، اور اگر ہو گیا تو سائل پر کوئی مصیبت تو نہیں نازل ہوگی؟ میں نے ستاروں اور ان کے بُرجوں کی نقل و حرکت کو دیکھا ہے۔ یہ ہمارا علم ہے۔ اسے تم نہیں سمجھ سکتے۔ میں تمہیں صرف یہ

بتا سکتا ہوں کہ تمہارا کام ہو سکتا ہے لیکن یہ سفلی عمل ہوگا جس کا اثر صرف تم پر نہیں تمہارے پورے خاندان پر پڑے گا۔"

"جالندھر والے خواجہ صاحب نے تو ایسی بات نہیں کہی تھی" —— منیر نے کہا۔

"انہوں نے تمہیں میرے حوالے جو کیا تھا، اس کی کوئی وجہ تھی" —— حسنین کاظمی نے کہا —— "تم وہاں سے آ گئے تھے۔ میں نے رات خواجہ صاحب کے ہاں گزاری تھی۔ انہوں نے مجھے کہا تھا کہ وہ یہ کام اس لئے نہیں کرنا چاہتے کہ اس میں تمہارا نقصان ہے۔ انہوں نے کہا تھا کہ ہو سکتا ہے انہیں غلطی لگی ہو اس لئے میں تمہارا حساب نکال کر دیکھ لوں۔ اگر خطرہ نظر نہ آئے تو اس کا کام کر دینا... منیر بھائی! خطرہ صاف نظر آ رہا ہے۔ اسے ٹالا نہیں جا سکتا۔ میں خود اس کی زد میں آ سکتا ہوں۔"

"پھر میں خواجہ صاحب کے پاس چلا جاؤں؟"

"نہیں" —— حسنین کاظمی نے جواب دیا —— "وہ تمہاری بات نہیں سنیں گے۔ وہ اپنا فیصلہ دے چکے ہیں۔ وہاں نہ جانا۔"

منیر پر مُردنی چھا گئی۔ کچھ دیر سر جھکائے بیٹھا رہا۔

"ایک بات بتائیں" —— منیر نے پوچھا —— "اگر ملک عمر اپنی آئی پر مر جائے اور میں نسیمہ کے ساتھ شادی کر لوں تو بھی مجھے نقصان پہنچے گا؟"

"نہیں" —— حسنین کاظمی نے کہا —— "اس صورت میں تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچے گا۔ ملک عمر کی موت کے بعد نسیمہ تمہاری بیوی بن جاتے تو تم دونوں کو فائدہ پہنچے گا نقصان نہیں۔"

منیر سر جھکائے ہوئے وہاں سے اٹھا اور حسنین کاظمی کو سلام کئے بغیر نکل آیا۔ حسنین کاظمی کے گاؤں سے واپس آ کر منیر نسیمہ کی ماں کے ہاں چلا گیا۔ کچھ دیر اس کے ساتھ سر جوڑ کر بیٹھا رہا۔ نسیمہ کی ماں اس کی تائید میں سر ہلاتی رہی اور اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیلتی چلی گئی۔ تھوڑی سی دیر میں منیر اس مسکراہٹ کے طلسم میں گم ہو گیا۔

◆◆◆

دو ہی روز بعد، رات آدھی گزر گئی تھی۔ منیر ملک عمر حیات کی حویلی کے پاس آن کھڑا ہوا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ چھ انچ لمبے پھل والا چاقو اس کے کرتے کی جیب میں تھا۔ اس نے دیوار کو اس جگہ سے دیکھا جہاں سے کچھ اینٹیں باہر نکلی ہوئی تھیں۔ یہ جگہ اس نے دن کے وقت اگر اچھی طرح دیکھ لی تھی۔ دیوار کے اندر جو کچھ تھا وہ منیر نے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ اسے دو روز پہلے نسیمہ کی ماں نے بغیر دکھائے سمجھا دیا تھا۔ ان دنوں راتیں تاریک تھیں۔ نسیمہ کی ماں نے اسے حویلی کے اندر کا راستہ بھی اچھی طرح سمجھا دیا تھا، یعنی وہ راستہ جس نے اسے عمر حیات تک لے جانا تھا۔

اس نے دیکھ لیا تھا کہ چوکیدار دوسری گلی میں چلا گیا ہے۔ وہ دیوار پر چڑھنے لگا تو اسے پتہ چلا کہ یہ تو بہت آسان ہے۔ چند لمحوں میں وہ دیوار پر چڑھ گیا اور دوسری طرف اترنے لگا جو چڑھنے سے زیادہ آسان کام تھا۔ نیچے اتر کر بائیں ہاتھ میں پکڑی ہوئی ٹارچ کو اور مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اسے ٹارچ کی ابھی ضرورت نہیں تھی۔ اسے چاقو کی بھی ضرورت نہیں تھی۔ عمر حیات کو اس نے گلا گھونٹ کر یا ناک اور منہ پر کپڑا رکھ کر قتل کرنا تھا۔ چاقو تو وہ اپنی حفاظت کے لئے ساتھ لایا تھا۔

اس کے دائیں طرف برآمدہ تھا۔ ایک آدھ منٹ کے لئے وہ برآمدے میں جا کر رک گیا اور آہٹیں سننے کی کوشش کرنے لگا۔ حویلی کے اندر کا ماحول بالکل خاموش تھا لیکن یہ خاموشی فوراً ہی ٹوٹ گئی۔ اسے ایک آہٹ سی سنائی دی جو کسی کے قدموں کی نہیں تھی۔ اگر کسی کے قدموں کی ہی تھی تو وہ دبے پاؤں یا پاؤں آہستہ آہستہ گھسیٹ کر چل رہا تھا۔ منیر چوکنا ہو گیا۔

اسے ایسے لگا جیسے کوئی صحن میں آ گیا ہو۔ وہ عمر حیات کے سوا اور کون ہو سکتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ اس گھر میں عمر حیات کے سوا اور کوئی مرد نہیں۔ اگر وہ عمر حیات ہی تھا تو منیر کا کام آسان ہو گیا تھا۔ جسمانی لحاظ سے عمر حیات منیر سے کمزور تھا۔ منیر تو ہٹا کٹا جوان تھا۔ وہ اندھیرے میں دیکھنے

کی کوشش کرنے لگا۔ اُس نے سوچ لیا تھا کہ وہ دبے پاؤں پیچھے سے جاکر عمر حیات کی گردن کے گرد بازو لپیٹ دے گا اور بازو کا گھیرا تنگ کر کے اُسے مار ڈالے گا۔

اُسے کھسر پھسر سی سنائی دی، پھر ایک آدمی صحن سے گزر کر ڈیوڑھی میں چلا گیا۔ منیر کو ایسی آواز سنائی دی جیسے اُس آدمی نے دروازے کی زنجیر اتاری ہو۔ وہ باہر جا رہا ہو گا لیکن وہ آدمی واپس آگیا اور سامنے والے برآمدے میں چلا گیا۔ منیر برآمدے سے نکل کر ساتھ والی دیوار کے ساتھ ہو گیا اور دیوار کے ساتھ پیٹھ لگاتے اُس طرف کو سرکنے لگا جدھر وہ آدمی گیا تھا۔ اُسے کچھ شک سا ہُوا۔ اگر وہ عمر حیات ہی تھا تو اُسے ڈیوڑھی کی زنجیر کھولنے کی کیا ضرورت تھی۔ پھر وہ اس طرح دبے پاؤں کیوں چل رہا تھا۔

حویلی خاصی کشادہ تھی۔ منیر اور آگے چلا گیا۔ اسے کچھ ایسا شک ہونے لگا جیسے اُس برآمدے میں ایک نہیں دو یا تین آدمی ہوں۔ ایک آدمی آگے جانے کی بجائے پیچھے آگیا۔ اُسے منیر کی موجودگی کا علم نہیں تھا۔ اُس کے اور منیر کے درمیان پانچ چھ قدموں کا فاصلہ تھا۔ وہ آدمی رُک گیا۔ منیر وہیں دبکا رہا۔ جو آدمی آگے چلا گیا تھا وہ بھی پیچھے آگیا اور پہلے آدمی کے ساتھ لگ کر کھڑا ہو گیا۔ منیر کو بڑی صاف سرگوشی سنائی دی ــــ "دوسری طرف سے چلتے ہیں۔ اس کمرے میں تو وہ سوتے ہوتے ہیں۔"

منیر غیر معمولی طور پر دلیر آدمی تھا۔ اُس کے دماغ میں بجلی کی طرح روشنی سی چمکی۔ اُس نے کُرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا اور چاقو نکال لیا۔ اُس کے دوسرے ہاتھ میں ٹارچ تھی۔ اُس نے دانتوں سے چاقو کھولا۔ چاقو کھلنے کی ہلکی سی آواز پیدا ہوتی جو رات کی خاموشی میں یوں سنائی دی جیسے کسی نے کوئی چیز پھینکی ہو۔ اُن دونوں آدمیوں نے بدک کر اُدھر دیکھا۔ منیر نے ٹارچ روشن کی۔ جس چہرے پر روشنی پڑی اُسے منیر بڑی اچھی طرح جانتا تھا۔ وہ مشہور جرائم پیشہ آدمی تھا جسے سب گنجا کہتے تھے۔ منیر کو یہ سمجھنے میں دیر

نہ لگی کہ گنجا یہاں کیا کر رہا ہے۔

گنجا ماہر واردتیا تھا۔ وہ پلک جھپکتے بھاگا اور ڈیوڑھی میں جا پہنچا۔ منیر کو دروازہ کھُلنے کی آواز آئی۔

گنجے کا ساتھی جیسے فیصلہ نہ کر سکا ہو کہ اُسے کیا کرنا چاہیئے۔ منیر اُس کی حرکتیں دیکھتا رہا۔ منیر نے ٹارچ کی روشنی جب اُس کے چہرے پر پھینکی تو وہ دیکھ کر حیران رہ گیا کہ وہ چہرہ سائیں مستانے کا تھا۔ اچانک مستانہ ڈیوڑھی کی طرف بھاگ اُٹھا، لیکن منیر اُس سے زیادہ تیز نکلا۔ اُس نے اپنی ٹانگ آگے کر کے مستانے کی ایک ٹانگ پر ماری۔ مستانہ مُنہ کے بل گرا۔ وہ جب اُٹھا تو منیر کے چاقو کی نوک اُس کی ٹھوڑی کے نیچے تھی۔

"خبردار!" ــــ منیر نے آہستہ سے کہا ــــ "ذرا سی حرکت کی تو چاقو تمہاری شہ رگ کے اندر ہو گا۔"

مستانہ سُن ہو کے رہ گیا۔

"ملک صاحب!" ــــ منیر نے بڑی زور سے آواز دی ــــ "ملک صاحب! گھبراؤ نہیں، باہر آجاؤ۔"

ملک عمر حیات اور نسیمہ کی آنکھ کھُل گئی۔ نسیمہ نے اُسے کہا کہ وہ باہر نہ نکلے۔ دونوں خاموش رہے۔ منیر نے اُسے پھر پکارا۔

"باہر آجاؤ ملک صاحب!" ــــ اُس نے کہا ــــ "میں منیر ہوں!"

صحن کا بلب روشن ہو گیا۔ اس کا سوئچ کمرے میں تھا، لیکن باہر کوئی بھی نہ آیا۔ منیر نے چاقو کی نوک مستانے کی ٹھوڑی کے نیچے ہی رکھی اور اُسے دھکیلتا ہُوا ایک کمرے کے دروازے تک لے گیا۔ کمرے کی کھڑکی کھُلی۔ منیر نے دیکھا کھڑکی کی سلاخوں کے پیچھے ملک عمر حیات اور نسیمہ کھڑے تھے۔ اُن کے چہروں پر خوف و ہراس تھا۔ اُن کے مُنہ سے بات بھی نہیں نکلتی تھی۔

"ملک صاحب، ڈرو مت!" ــــ منیر نے کہا ــــ "میں نے تمہارا چور پکڑا ہُوا ہے۔ باہر نکلو اور چوکیدار کو بلا لاؤ۔"

نسیمہ کا خون کھول رہا تھا۔ اُس کے سینے میں منیر کی نفرت کا طوفان

اُمڈ آیا تھا۔ اُس کی زبان پر ایک ہی بار ڈھیروں لعنت ملامت آگئی تھی۔ وہ تو جانتی تھی کہ اُس کے گھر پر سفلی عمل منیر نے ہی کرایا تھا لیکن اُس نے حسنین کاظمی کے کہنے پر عمر حیات کو نہیں بتایا تھا۔ اگر وہ منیر کو لعن طعن کرتی تو عمر حیات اُس سے پوچھتا کہ وہ اُسے کس طرح جانتی ہے۔ نسیمہ کی زبان پر تو آگئی تھی کہ تُو نے انتقام لینے کے لئے پہلے وہ ذلیل حرکت کی اور اب غنڈہ گردی کے لئے میرے گھر میں آگھسا ہے۔ نسیمہ کے دل پر خوف طاری ہو گیا۔ اُسے توقع نہیں تھی کہ منیر اس حد تک بھی پہنچ سکتا ہے۔

عمر حیات منیر کو اتنا ہی جانتا تھا کہ اِسی شہر کا ایک آوارہ امیر زادہ ہے اور اس کا انداز غنڈوں جیسا ہے۔ اُسے مستانے کے ساتھ اپنے گھر میں دیکھ کر وہ اس کے سوا اور کیا سمجھ سکتا تھا کہ مستانہ اپنی بے عزّتی کا انتقام لینے آیا ہے اور منیر کو ساتھ لایا ہے۔ اُس کے لئے یہ صورتِ حال بڑی عجیب تھی کہ آدھی رات کو اُس کے گھر میں منیر نے چاقو کی نوک مستانے کی ٹھوڑی کے نیچے رکھی ہوئی تھی۔ نسیمہ عمر حیات سے بار بار کہتی تھی کہ وہ باہر نہ نکلے۔ مستانے کا تو یہ حال تھا جیسے اُس کے مُنہ میں زبان ہی نہیں۔

"اوہ ملک عمر!" ــــ منیر نے جھنجلا کر کہا ــــ "ڈرتے ہو تو کسی اور دروازے سے باہر چلے جاؤ اور چوکیدار کو بلا لاؤ۔ اُسے تھانے بھیجیں گے۔"

"پہلے یہ بتاؤ یہ چکر کیا ہے؟" ــــ عمر حیات نے پوچھا۔

"اگر یہ چکر تمہارے خلاف ہوتا تو ہم دونوں کیا یہیں کھڑے رہتے؟" ــــ منیر نے کہا ــــ "تمہارے کمرے کا دروازہ کھُلا تھا اور تم دونوں سوئے ہوتے تھے۔ دروازہ تو تم نے اب بند کیا ہے۔ ہم اپنا کام کر نہ جاتے؟ کیا تم مجھے اِس ڈکیت کا ساتھی سمجھتے ہو؟ مجھے تم جانتے نہیں؟ میرے باپ کو تم نہیں جانتے؟ .... اِس کا ایک ساتھی بھاگ گیا ہے۔ میں نے انہیں دیوار پر چڑھتے اور اندر آتے دیکھا تھا۔ انہیں موقعہ پہ پکڑنے کے لئے میں اُسی راستے سے اندر آگیا تھا .... باہر آؤ ملک! اگر ڈرتے ہو اور مجھ

پہ نہیں اعتبار نہیں تو دونوں نے کر شور مچایا۔ چوکیدار بھی جاتے محلّے کے لوگ بھی آجائیں گے۔"

◆◆

ملک عمر حیات نے خطرہ مول لے کر نسیمہ کے منع کرنے کے باوجود دروازہ کھول کر باہر گیا۔

"بیٹھ جا سائیں!" ــــ منیر نے مستانے سے کہا ــــ "ذرا سی حرکت پر تم مارے جاؤ گے۔"

مستانہ بیٹھ گیا۔ نسیمہ بھی باہر آگئی۔ اس کے ہاتھ میں باورچی خانے کی چھُری تھی اور اُس کی سانسیں بڑی تیز چل رہی تھیں۔ منیر اُس کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ وہ عمر حیات پہ ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ وہ نسیمہ کو جانتا ہے۔

"ملک صاحب!" ــــ مستانہ بولا ــــ "اس سے یہ پوچھیں کہ یہ آپ کے گھر میں کیا کر رہا ہے۔ یہ میرا ساتھی ہے۔ یہ اندر آکر مجھ سے جھگڑ پڑا۔ یہ کچھ اور چاہتا تھا اور میں ...."

اُس کے پہلو میں منیر کا ٹھُڈ پڑا اور وہ دوسرے پہلو پر لڑھک گیا۔ منیر نے اُسے تین چار ٹھُڈ مارے۔

"میں تیرے ساتھ تھا؟" ــــ منیر نے کہا ــــ "یا وہ تیرا باپ تیرے ساتھ تھا۔"

"اسے اُٹھنے نہ دینا ملک!" ــــ منیر نے عمر حیات سے کہا ــــ "چھُری اس کی گردن پر رکھ دو۔ میں چوکیدار کو لے کر آتا ہوں" ــــ وہ باہر کو دوڑ پڑا۔

"کیوں بے؟" ــــ ملک عمر حیات نے نسیمہ کے ہاتھ سے چھُری لے کر مستانے سے پوچھا ــــ "کیا کرنے آیا تھا یہاں؟"

"ملک صاحب!" ــــ مستانے نے ہاتھ جوڑ کر التجا کی ــــ "بخش دو۔ میں تمہارے شہر سے چلا گیا ہوں پھر کبھی اِدھر کا رُخ نہیں کروں گا۔"

"آئے کیوں تھے؟" — عمر حیات نے پوچھا — "انتقام لینے؟ مجھے قتل کرنے؟ میرے بچے کو اُٹھانے؟"

مستانے نے سَر ہلایا جس کا کوئی مطلب نہ تھا۔ منیر آگیا۔ اُس کے ساتھ چوکیدار تھا۔

"یہ دیکھ اوئے!" — منیر نے مستانے کی طرف اشارہ کرکے چوکیدار سے کہا — "تیرے ہوتے ہوتے یہ دو آدمی اس گھر میں آئے تھے، پھر میں ان کے پیچھے انہیں پکڑنے آیا۔ اس کا ایک ساتھی بھاگ گیا اور تجھے کچھ پتہ ہی نہیں .... جا دفع ہو جا یہاں سے۔ سیدھا تھانے جا اور وہاں بتا کر ملک عمر حیات صاحب کے گھر ہم نے ایک چور پکڑ کے رکھا ہُوا ہے۔"

نسیمہ حیرت سے منیر کو دیکھ رہی تھی۔ اُس کے اندر ایک رَو غصّے کی پھر جاتی تھی اور دوسری استعجاب کی۔ عمر حیات کبھی منیر کو دیکھتا کبھی مستانے کو۔

"ملک صاحب! حیران نہ ہوں" — منیر نے چوکیدار کے جانے کے بعد جھوٹ بولا — "میں گھومنے پھرنے والا آدمی ہوں۔ ایک دوست کے گھر تاش کھیلتا رہا اور اپنے گھر کو جا رہا تھا۔ مجھے دو آدمی باہر والی دیوار پر چڑھتے نظر آئے۔ میں پیچھے رُک گیا۔ میری جیب میں چاقو تھا۔ میں نے شور مچانے کی بجائے یہ بہتر سمجھا کہ انہیں اندر موقعہ پہ پکڑوں۔ میں شور مچاتا تو یہ بھاگ جاتے۔ یہ اندر آ گئے تو ذرا وقت بعد میں بھی دیوار پر چڑھ کر اندر آ گیا اور اُس برآمدے میں چھُپ کر انہیں دیکھنے لگا۔ اندھیرے میں اچھی طرح نظر نہیں آتا تھا۔ میں اس دیوار کے ساتھ ساتھ سرکتا یہاں آ گیا اور چاقو جیب سے نکال کر کھولا۔ اس کی آواز پہ اس کے ایک ساتھی نے پیچھے دیکھا ....

"اندھیری راتوں کی وجہ سے میں ٹارچ اپنے ساتھ رکھتا ہوں۔ میں نے ٹارچ روشن کرکے اُس آدمی پہ ڈالی تو اُسے پہچان لیا۔ وہ گنجا بدمعاش تھا۔"

"گنجا؟" — عمر حیات نے کہا — "اُسے میں جانتا ہوں۔ وہ تو نامی مجرم ہے۔"

"اور وہ اس مستانے کا یار ہے" — منیر نے کہا — "اُسے کون

نہیں جانتا۔ وہ بھاگ گیا .... ہاں، میں بھول گیا تھا۔ اُس نے پہلے جا کر ڈیوڑھی کا باہر والا دروازہ کھولا تھا۔ یہ آئے دیوار کے اُوپر سے تھے اور اپنا کام کرکے دروازے سے نکلنا چاہتے تھے .... وہ تو بھاگ گیا، میں نے اِس سائیں کو نہ جانے دیا۔ آگے آپ نے دیکھا ہے میں نے کیا کیا ہے" — اُس نے فرش پہ بیٹھے ہوئے مستانے کی کمر پہ لات مارتے ہُوئے کہا — "بول اوئے نقشبندی! کیا میں تیرے ساتھ تھا؟"

"میں نے چوری نہیں کی، کچھ بھی نہیں کیا" — مستانے نے گڑگڑا کر کہا — "اب بخش دو۔ کہو تو ناک کی لکیریں نکالوں گا۔"

"پولیس آ رہی ہے" — منیر نے کہا — "ہم اُسے کہیں گے کہ تمہیں بخش دے۔"

❖

چھوٹا تھانیدار ایک ہیڈ کانسٹیبل اور دو کانسٹیبلوں کو ساتھ لئے آ گیا۔ اُس نے مستانے کو غور سے دیکھا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے بھی دیکھا۔

"یہ تم ہو مستانے سائیں؟" — اے۔ ایس۔ آئی نے کہا اور اپنی ناک پر ہاتھ رکھ کر اور پیچھے ہٹ کر بولا — "بدبخت نے کتنی چرس پی ہوئی ہے۔"

"اس کے ساتھ گنجا بھی تھا" — منیر نے کہا — "وہ بھاگ گیا ہے۔"

"پکڑ لیں گے" — اے ایس آئی نے کہا — "اُسے بھی پکڑ لیں گے" — اُس نے منیر سے پوچھا — "تم یہاں کیسے آئے؟"

"یہ بھی میرا ساتھی ہے" — مستانے نے کہا۔

"بکواس کرتا ہے" — عمر حیات نے کہا — "منیر کی آواز پہ میری آنکھ کھُلی تھی۔ میں نے باہر کی بتی جلائی تو دیکھا کہ منیر نے چاقو کی نوک اِس کی ٹھوڑی کے نیچے رکھی ہوئی تھی۔"

اے ایس آئی نے منیر کا بیان لیا۔ منیر نے وہی بیان دیا جو وہ عمر حیات کو دے چکا تھا۔ اے ایس آئی نے عمر حیات کا الگ اور نسیمہ کا الگ بیان لیا۔ باہر جا کر ٹارچ کی روشنی میں وہ جگہ دیکھی جہاں سے منیر چڑھا

و اندر آیا تھا۔ اُس نے مستانے اور گنجے کو ... ں سے اوپر چڑھتے نہیں دیکھا تھا اُس کا خیال تھا کہ وہ اسی راستے اوپر چڑھے اور اندر آئے ہوں گے

مستانے کی جامہ تلاشی میں اُس کے نیفے سے خنجر نکلا

اے ایس آئی نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا کہ وہ گنجے کو ڈھونڈے اور اسے تھانے لے چلے۔ اے۔ ایس۔ آئی نے مزید جو کارروائی کرنی تھی وہ کی اور نسیمہ کے سوا باقی سب کو تھانے لے گیا۔ ہیڈ کانسٹیبل اس وقت گنجے کو ساتھ لے تھانے میں آیا جب سورج طلوع ہو چکا تھا منیر ابھی مشتبہ تھا کیونکہ مستانہ کہتا تھا کہ منیر اس کے ساتھ تھا مستانہ تجربہ کار مجرم تھا، لیکن تھانے والے اُس سے زیادہ تجربہ کار تھے۔ اُنہوں نے گنجے کو الگ لے جا کر کہلوا لیا کہ منیر اُن کے ساتھ نہیں تھا اور یہ بھی کہ وہ اور مستانہ ڈکیتی کی نیت سے عمر حیات کے گھر میں داخل ہوئے تھے۔

گنجے کا ریکارڈ تو اسی تھانے میں تھا، مستانے کے متعلق پتہ چلا کہ وہ کسی اور علاقے کا جرائم پیشہ تھا اور کچھ عرصے سے یہاں آ کر آباد ہوا اور نقشبندی بن گیا تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ عورتوں میں پہنچا ہوا سائیں بن گیا تھا۔

کیس عدالت میں چلا گیا ملک عمر حیات منیر کا ممنون تھا وہ منیر کو اپنے گھر لے جانے لگا منیر عمر حیات اور نسیمہ سے کہتا تھا کہ مستانہ اور گنجا عمر حیات کو قتل کرنے اور بچے کو اغوا کرنے آئے تھے اور انہوں نے نسیمہ کو بہت خراب کرنا تھا

یہ چھوٹا سا قصبہ تھا پہلے روز ہی گھر گھر اور بچے بچے تک کو پتہ چل گیا کہ رات عمر حیات کے گھر چور آئے تھے اور انہیں منیر نے پکڑا ہے۔ عمر حیات کا گھر ایک بار پھر لوگوں کی دلچسپی کا مرکز بن گیا۔ ہر لوگ ایک بات سن کر دو اور اپنی طرف سے ملا کر اس واردات کو دلچسپ سنسنی خیز اور پر لطف بنانے لگے۔ "سائیں مستانہ چور نہیں ہو سکتا" — مستانے کی معتقد عورتیں کہتی تھیں — "نسیمہ کے گھر پر اللہ کی مار ہے۔ جیسی ماں تھی ویسی بیٹی نکلی۔ پہلے اُس

کے گھر غیب سے پتھر گرتے اور کپڑے اور لوٹے جلتے رہے، اب چو... لے لگے ہیں، اور دیکھو، بے چارے سائیں کو پکڑوا دیا۔"

"ارے منیر کو تم نہیں جانتے؟" — کئی لوگ کہتے تھے — "عورتوں کا شکاری ہے۔ ماں باپ نے شہزادہ بنا کے رکھا ہوا ہے۔ کوئی اُس کے باپ کو کہہ بیٹھے کہ تیرا بیٹا آوارہ ہے تو باپ گلے پڑ جاتا ہے۔ کوئی بھلا آدمی اس میرے کے ساتھ منہ نہیں لگاتا۔"

"صاف بات ہے جی!" — کچھ لوگ کہتے تھے — "ملک عمر کو تو اپنے گھر اور اپنی عزت کا کچھ خیال ہی نہیں۔ اُس کی بیوی اور منیر کی یاری بڑے عرصے سے چل رہی ہے۔"

سب سے زیادہ حیران نسیمہ کی ماں تھی۔ اُس نے اس واقعہ کے تین چار روز بعد منیر کو اپنے گھر بلایا اور اُسے الگ کمرے میں بٹھا لیا

"یہ تُو نے کیا کیا منیر؟" نسیمہ کی ماں نے اُس سے پوچھا — "میں تو کوئی اور خبر سننے کو بے تاب تھی۔"

"یہ بھی اُستادی ہے خالہ" — منیر نے کہا — "میں گیا تو اُسی کام کے لئے تھا لیکن وہاں مستانہ مل گیا۔ اس کے ساتھ گنجا بدمعاش تھا۔ وہ بھی وہاں اُسی ارادے سے گئے تھے جو ارادہ میرا تھا۔ اُنہوں نے اب یہ کہہ دیا ہے کہ وہ ڈکیتی کی نیت سے گئے تھے لیکن مجھے شک ہے کہ وہ ملک عمر کو قتل کرنے گئے تھے۔ مجھے کل ہی ملک عمر نے سنایا ہے کہ اُس نے مستانے کو دھوکے میں ایک رات اپنے گھر بلا کر ... آدمیوں سے بہت پٹوایا تھا وہ کہتا تھا کہ مستانہ نسیمہ پر بری نظر رکھتا تھا .... وہ خالہ! ملک عمر کہتا ہے کہ مستانے کو اُس نے نسیمہ کے پیچھے ڈالا تھا۔ وہ تو صاف کہتا ہے کہ نسیمہ کی ماں بدمعاش عورت ہے۔"

"بدمعاش تو اُس کی اپنی ماں تھی" — نسیمہ کی ماں نے جوابی وار کے طور پر منیر کو عمر حیات کی ماں کے دو تین قصے سنا دیئے، پھر کہنے لگی — "تم نے کچھ نہیں کیا منیر! میں تو کہتی تھی کہ صبح اُٹھتے ہی خبر سنوں گی کہ ملک عمر

رات کو مر گیا ہے۔"

"میں نے ملک عمر کی حویلی میں اُن دونوں کو دیکھا تو میرا راستہ بند ہو گیا"— منیر نے کہا —"وہ اُس کمرے کے قریب پہنچ گئے تھے جس میں تم نے مجھے بتایا تھا کہ ملک سوتا ہے۔ میں وہاں سے نکلنے کی کوشش کرتا تو انہیں پتہ چل جاتا اور وہ مجھے پکڑ لیتے۔ اگر وہ واردات کر کے نکل جاتے تو میں پکڑا جا سکتا تھا۔ میرے دماغ میں ایک اور بات آ گئی۔ میں نے سوچا کہ اس کی بجائے کہ میں خود پھنسوں، میں پیچھے سے انہیں جا پکڑتا ہوں .... میری چال کام آ گئی اور میں نے ملک عمر اور نسیمہ سے کہا کہ میں نے ان دونوں کو اندر آتے دیکھا تھا اور میں انہیں عین موقعہ پر پکڑنے کے لئے دیوار پھاند کر اندر آ گیا۔"

"اس سے تجھے کیا ملا؟"

"اب ملے گا"— منیر نے جواب دیا —"ملک عمر مجھے اپنے گھر لے جاتا ہے۔ نسیمہ مجھ پر بہت خوش ہے۔ ابھی نسیمہ کے ساتھ اکیلے بات کرنے کا موقع نہیں ملا۔ نسیمہ کو یقین ہے کہ مستانہ اور گنجا اُسے اُٹھا لے جانے کو آئے تھے۔ ملک کے گھر میں میرا آنا جانا ہو گیا ہے۔ اب نسیمہ کے دل میں ملک عمر کی نفرت پیدا کروں گا۔ اُس کے دل میں اتنا زہر بھر دوں گا کہ وہ ملک کا جینا حرام کر دے گی اور ملک اُسے طلاق دے دے گا۔"

"سُن منیر!"— نسیمہ کی ماں نے کہا —"یہی طریقہ آزما کے دیکھ۔ اگر تجھے کامیابی نہ ہوئی تو میں تجھے ایک اور طریقہ بتاؤں گی۔"

"وہ کیا ہے؟"

"میں ایک عورت کو استعمال کروں گی"— نسیمہ کی ماں نے کہا —"تجھے ساتھ رکھوں گی۔ یہ عورت عمر حیات کے ساتھ لگی ہوئی ہو گی اور یہ کام تیرا ہو گا کہ نسیمہ کو یہ منظر دکھا دے۔"

"پہلے مجھے اپنا طریقہ آزما لینے دے خالہ!"

"اس کے باوجود اس شخص سے ہوشیار رہنا"— حسنین کاظمی نسیمہ سے کہہ رہا تھا —"میرا خیال تھا ملک صاحب گھر ہوں گے لیکن وہ اپنے کام سے نکل گئے ہیں.... چلو یہ بھی اچھا ہے وہ گھر نہیں ہیں۔ انہیں ابھی پتہ نہیں چلنا چاہئے کہ تم لوگوں پر سفلی عمل اسی شخص منیر نے کرایا تھا۔ تم نے ملک صاحب کو بتایا تو نہیں؟"

"نہیں"— نسیمہ نے جواب دیا —"کئی بار خیال آیا ہے کہ بتا دوں۔"

"جب تک میں نہ کہوں نہ بتانا"— حسنین کاظمی نے کہا —"اب اگر بتاؤ گی تو ملک صاحب نہیں مانیں گے کیونکہ منیر نے تم لوگوں پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ جس طرح تم نے مجھے سارا واقعہ سنایا ہے کہ اس طرح منیر ان خطرناک مجرموں کو پکڑنے ان کے پیچھے آ گیا تھا، یہ سُن کر تو میں بھی یہی کہوں گا کہ منیر نے تم لوگوں کی عزت، جان اور مال پہ اپنی جان کی بازی لگا دی تھی۔ وہ دونوں اسے وہیں قتل کر سکتے تھے .... پھر بھی نسیمہ! اس شخص سے ذرا دُور رہنا۔ اگر میرے پاس یہ علم نہ ہوتا تو میں بھی منیر سے متاثر ہو جاتا۔ یہ اس علم کی برکت ہے کہ میں لوگوں کے دلوں کا بھید جان لیتا ہوں۔"

"ملک صاحب نے تو اُسے پکا دوست بنا لیا ہے"— نسیمہ نے کہا۔

"تم محتاط رہنا"— حسنین کاظمی نے کہا —"اُس کے ساتھ اچھا سلوک رکھنا لیکن اُسے مخلص اور دردمند نہ سمجھ لینا۔ اس شخص پر شیطان کا غلبہ ہے۔"

"ہاں کاظمی صاحب!"— نسیمہ نے ہنستے ہوئے کہا —"آپ نے بتایا نہیں تھا کہ آپ نے میرے ہاتھ کی لکیروں میں کیا دیکھا تھا۔"

"غصہ!"— حسنین کاظمی نے کہا —"تمہارے اندر ایسا غصہ بھرا ہوا ہے جیسے بارود خانے میں بارود بھرا ہوتا ہے۔ تمہارا ہاتھ دیکھ کر میں ڈر اس لئے گیا تھا کہ اس بارود خانے میں ذرا سی بھی چنگاری گر پڑی تو بہت بڑا دھماکہ ہو گا۔ تم جانتی ہو جہاں دھماکہ ہوتا ہے وہاں کیسی تباہی ہوتی ہے۔"

"پھر مجھے کیا کرنا چاہئے؟"

صبر و تحمل ۔۔۔۔ حسنین کاظمی نے کہا ۔۔۔ کبھی غصّہ آجائے تو اس پر فوراً قابو پا لیا کرو۔'

حسنین کاظمی نے بڑی سنگین اور خطرناک بات ہنس کر گول کر دی۔ وہ نسیمہ کو نہیں بتانا چاہتا تھا کہ اُسے جب دورے کی صورت میں آئے گا تو اس پر قابو نہیں پا سکے گی اور غصّہ سے قتل یا خودکشی تک پہنچا دے گا۔

◆

اسی دن کا واقعہ ہے منیر نسیمہ کے ہاں گیا ملک عمر گھر نہیں تھا۔ نسیمہ نے مسکرا کر اس کا استقبال کیا۔

"ملک صاحب کہاں ہیں؟" ۔۔۔ منیر نے پوچھا۔

"آج تو وہ شام کے بعد آئیں گے" ۔۔۔ نسیمہ نے جواب دیا اور اُسے بیٹھنے کو کہا۔

"نہیں نسیمہ!" ۔۔۔ منیر نے کہا ۔۔۔ "میں ملک صاحب سے ملنے آیا تھا۔ تم اب میرے لئے غیر ہو اور میں تمہارے لئے غیر مرد ہوں تمہارا خاوند گھر نہیں ہے تو میں تمہارے پاس نہیں بیٹھوں گا۔"

تھوڑا ہی عرصہ پہلے منیر اور نسیمہ کی محبت تھی اور محبت کی ملاقاتیں تھیں

نسیمہ نے اسی بے تکلفی کا مظاہرہ کیا تو منیر بیٹھ گیا۔

"تم میرے پاس نہیں بیٹھو گی" ۔۔۔ منیر نے پوچھا

"یہی کہتے ہو کہ تم میرے لئے غیر مرد ہو" ۔۔۔ نسیمہ نے ہنستے ہوئے کہا ۔۔۔ "میں دُور ہی بیٹھوں تو اچھا ہے"

"اس محبت کو دل سے نکال ڈالا ہے نسیمہ؟"

"میں نے نہیں" ۔۔۔ نسیمہ نے کہا ۔۔۔ "تم نے اپنے دل سے اس محبت کو دھو ڈالا ہے اور اس کی جگہ دشمنی بھر لی ہے"

"دشمنی" ۔۔۔ منیر نے کہا ۔۔۔ "کیا تم اسے دشمنی کہتی ہو کہ میں نے تمہاری عزت اور تمہاری جان بچائی ہے؟ وہ دونوں ملک صاحب کو قتل ۔ ۔"

"احسان تو میں ساری عمر نہیں بھولوں گی منیر!" ۔۔۔ نسیمہ نے کہا ۔۔۔ "لیکن میں اُن پتھروں کو بھی کبھی نہیں بھولوں گی جو تمہارے تعویذ میرے گھر میں برسانے رہے ہیں اور اس آگ کو میں کیسے بھول سکتی ہوں ۔۔۔"

"کیا کہہ رہی نسیمہ؟"

"منیر!" ۔۔۔ نسیمہ سنجیدہ ہو گئی اور بولی ۔۔۔ "کیا تم مجھے مرعوب کرنا چاہتے تھے؟ ۔۔۔ تم نے سوچا کیا تھا منیر؟"

منیر ہنس پڑا اور نسیمہ کے پاس آ بیٹھا۔

"نسیمہ!" ۔۔۔ منیر نے کہا ۔۔۔ "کسی وقت تمہاری یہ غلط فہمی بھی رفع کر دوں گا" ۔۔۔ اُس نے نسیمہ کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور جذباتی سے لہجے میں بولا ۔۔۔ "تمہاری محبت نے مجھے پاگل کر دیا ہے۔ میں نے جو کچھ بھی کیا تمہاری محبت کی خاطر کیا ہے۔ اپنی جان کو خطرے میں ڈالا ہے"

"اگر تم مجھے بار بار یہ احسان یاد دلاؤ گے تو میں کہوں گی کہ اس احسان کی قیمت بتاؤ" ۔۔۔ نسیمہ نے کہا ۔۔۔ "منہ سے مانگو۔ قیمت دوں گی"

"تم قیمت نہیں دو گی نسیمہ!"

"بولو منیر!" ۔۔۔ نسیمہ نے کہا ۔۔۔ "مانگو۔ حکم دو"

منیر نے اپنا بازو نسیمہ کی کمر کے گرد لپیٹ کر اُسے اپنے ساتھ لگا لیا اور دوسرا ہاتھ اس کے ایک گال پر رکھ کر اُس کا مُنہ اپنے مُنہ کے قریب کرنے لگا۔

"میں نے تیری محبت کی دیوانگی میں شادی نہیں کی نسیمہ!" ۔۔۔ منیر نے نشیلی سی آواز میں کہا ۔۔۔ "اپنا آپ میرے حوالے کر دو ۔۔۔ کچھ دیر کے لئے"

منیر نے ایک حرکت اور کی تو نسیمہ کے اندر دھماکہ ہوا۔ اُسے اپنی سانسیں یوں لگیں جیسے وہ شعلے اُگل رہی ہو ۔۔۔ بارود خانے میں چنگاری گر پڑی تھی ۔۔۔ نسیمہ اچھل کر اٹھی۔ اُس کا چہرہ سُرخ اور آنکھیں بوٹیوں

کی طرح ہوگئیں۔ دانت اُس بھیڑیئے کی طرح باہر نکل آئے جو اپنے شکار پر جھپٹنے والا ہو۔ اتنا حسین چہرہ ڈراؤنا ہوگیا۔

منیر اُٹھنے لگا تو نسیمہ کا ایک ہاتھ اُس کی شہ رگ پر چلا گیا۔ اُس نے منیر کی شہ رگ اپنی پانچ انگلیوں کے شکنجے میں پکڑ لی اور اُس کے ناخن منیر کی شہ رگ میں اُترنے لگے۔ منیر کا دم گھٹ گیا۔ اُس نے دونوں ہاتھوں سے نسیمہ کی کلائی پکڑ لی اور اُسے مروڑنے لگا لیکن اُسے ایسے لگا جیسے اس نے ہاتھوں میں خشک لکڑی پکڑ رکھی ہو۔ نسیمہ کا سارا جسم اکڑ گیا تھا۔

منیر کی آنکھیں باہر آنے لگیں۔ مُنہ کھُل گیا اور زبان باہر آگئی۔ اُس کا جسم تڑپنے لگا اور پھر تڑپ کم ہونے لگی۔

اچانک نسیمہ کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ نسیمہ کے ناخن منیر کے گوشت سے باہر آگئے۔ منیر ہٹا کٹا جوان تھا۔ اُس میں ابھی جان باقی تھی۔ اُس نے جھٹکا دے کر اپنی جان چھڑا لی۔ اُس نے اپنی شہ رگ پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ ہاتھ پر خون لگا ہُوا تھا۔

نسیمہ پلنگ پر اوندھے منہ گری اور ہچکیاں لے لے کر رونے لگی — پاگل پن کی لہر گزر گئی تھی۔

منیر آہستہ آہستہ باہر کو چل پڑا اور نسیمہ کے گھر سے نکل گیا۔

منیر شکست کھانے یا بھاگ جانے والا آدمی نہیں تھا۔ گھر میں اکلوتے پن اور ماں باپ کے ضرورت سے زیادہ لاڈ اور پیار نے اُس میں جو خامیاں پیدا کی تھیں، وہ اُس کے لئے ایک قوّت کی صورت اختیار کر گئی تھیں۔ اُس کا شعور بیدار ہُوا تو سب سے پہلے اُس میں یہ احساس پیدا ہُوا تھا کہ اُس کی ہر ضد پوری کی جاتی ہے۔ اب تو اُس کے ماں باپ بھی اُس کے ہاتھوں بے بس تھے۔ وہ اب ہر کسی سے توقع رکھتا تھا کہ اُس کے ہاتھوں میں بے بس ہو جائے اور جو اُس کی یہ توقع پوری نہیں کرتا تھا اُس سے وہ کسی نہ کسی طریقے سے ہتھیار ڈلوا لیا کرتا تھا۔ کوئی طریقہ کامیاب نہ ہو تو وہ انسانوں کو خرید بھی لیا کرتا تھا۔ اُس کے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں تھی۔

نسیمہ کو وہ نہیں خرید سکتا تھا۔ نسیمہ کا پرس نوٹوں سے بھرا رہتا تھا۔ نسیمہ پر اُس کا کوئی جھانسہ کامیاب نہیں ہُوا تھا۔ کالا علم بھی ناکام ہو گیا تھا۔ جالندھر والے خواجہ صاحب اور حسنین کاظمی نے بھی اُسے صاف جواب دے دیا تھا مگر وہ کورے جواب سے راضی ہونے والا آدمی نہیں تھا۔

نسیمہ کا صرف انکار ہی اُس کے لئے قابلِ برداشت نہیں تھا، اب تو نسیمہ نے اُس پر ہاتھ اُٹھایا تھا۔ ہاتھ بھی ایسا اُٹھایا کہ اُس کی شہ رگ مٹھی میں لے کر دبا لی تھی۔ یہ تو منیر کی خوش قسمتی تھی کہ نسیمہ کے دورے جیسے غصّے کی لہر گزر گئی تھی ورنہ اُس نے منیر کا گلا گھونٹ دیا تھا۔ دو چار سانسوں کی ہی کسر رہ گئی تھی۔

وہ جب نسیمہ کے گھر سے نکل کر گلی میں آیا تو اُس نے بدک کر ایک ہاتھ اپنی شہ رگ پر رکھ لیا۔ وہ ابھی تک نسیمہ کی انگلیاں اپنی شہ رگ میں اُترتی ہوئی محسوس کر رہا تھا۔ اُس کے سانسوں کا تسلسل اُس کے قابو میں آ ہی نہیں رہا تھا۔ اُس نے گلے سے ہاتھ ہٹا کر دیکھا تو اُس کے ہاتھ پر خون تھا۔ اُس

نے جیب سے ریشمی رومال نکالا۔ اس رومال کی وہ نمائش بھی کیا کرتا تھا جب دیکھتا کہ سامنے سے کوئی لڑکی یا لڑکیاں آرہی ہیں، وہ رومال جیب سے نکال کر گلے میں ڈال لیا کرتا تھا۔ اس رومال کو وہ گلاب کے عطر سے تر رکھتا تھا۔ اُس روز جب اُس کی شہ رگ سے خون کے چند قطرے پھوٹ آئے تھے، اُس نے اپنا نمائشی رومال اپنی گردن کے گرد لپیٹ لیا اور اپنے گھر جانے کی بجائے اپنے سبزیوں والے باغ میں چلا گیا۔

وہاں اُس نے اپنے لئے الگ کمرہ بنا رکھا تھا جسے وہ اکثر بدمعاشی کے لئے استعمال کرتا تھا۔ باغ میں رہٹ بھی تھا۔ اُس نے رہٹ چلوایا اور بہت دیر حوض میں بیٹھا رہا اور پانی آبشار کی طرح اُس کے سر پہ گرتا رہا مگر اُس کے وجود میں جو آگ لگی ہوئی تھی وہ سرد نہ ہوتی۔ اُسے اتنا ٹھنڈہ پانی بھی جلتا اور جلاتا محسوس ہو رہا تھا۔

پانی سے نکل کر وہ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اُس نے شہ رگ پر ہاتھ پھیر کر دیکھا۔ خون بند ہو چکا تھا لیکن اُس کی سانسیں ابھی تک ٹھکانے نہیں آتی تھیں۔ یہ غصّے اور انتقام کی شدّت کا اثر تھا۔ وہ لیٹ گیا اور فوراً ہی اُٹھ بیٹھا۔ بے چینی بڑھتی جا رہی تھی۔ وہ پھر لیٹ گیا لیکن بستر بھی جلتا محسوس ہو رہا تھا۔ وہ اٹھا اور گھر چلا گیا۔

◆◆◆

"کب سے انتظار کر رہی ہوں"۔۔۔ ماں نے اُسے کہا ۔۔۔ "کھانا کھا لو!"

"کھا لوں گا"۔۔۔ منیر نے بے رُخی سے کہا اور کمرے میں چلا گیا۔

"منیر کاکے!"۔۔۔ باپ نے آواز دی۔

"ہاں ہاں"۔۔۔ اُس نے تلخ لہجے میں کہا ۔۔۔ "کھا لیتا ہوں .... لے آؤ یہیں!"

"لڑ کر آئے ہو کسی سے!"۔۔۔ ماں مکھن کے پراٹھے چنگیر میں رکھ کے اندر گئی ۔۔۔ "باپ سے تو اچھی طرح بولا کرو۔"

"مجھ سے لڑ کر کسی نے قتل ہونا ہے!"۔۔۔ منیر نے ماں سے کہا ۔۔۔

"میں اس وقت غصّے میں ہوں۔"

"نہ کاکے!"۔۔۔ باپ نے اُس کے پاس آکر کہا ۔۔۔ "غصّہ نہ کیا کرو .... آج تھانیدار ملا تھا۔ کہیں جا رہا تھا۔ میں نے آگے ہو کر سلام کیا تو وہ رُک گیا۔ کہنے لگا، چوہدری! تیرا بیٹا اصل شیر ہے۔ اُس نے بہت بڑے ڈاکو اور نمبر باز کو پکڑا ہے۔"

"میں اس سے بھی بڑے ڈاکوؤں کو پکڑ سکتا ہوں"۔۔۔ منیر نے کہا ۔۔۔ "مستانہ تو چیز ہی کوئی نہیں۔ میں تو بڑے بڑے جابر آدمیوں کا گلا دبا دیا کرتا ہوں۔"

منیر ایسی باتیں اکثر کیا کرتا تھا۔ اُس کی ماں پھولی نہیں سماتی تھی۔ اُس کے باپ کا سینہ چوڑا ہو جایا کرتا تھا۔ منیر ماں باپ کو مرعوب کر کے گردن اکڑا لیا کرتا تھا۔ وہ بزدل نہیں تھا۔ بیوقوفی کی حد تک دلیر تھا۔ لڑائی مار کٹائی کا شوقین تھا اور اُس نے کم ہی کبھی مار کھائی تھی۔ ماں باپ نے اُسے کھلا پلا کر جنگلی سانڈ بنا رکھا تھا لیکن اُس روز جب اُس نے کہا کہ میں بڑے بڑے جابر آدمیوں کا گلا دبا دیا کرتا ہوں تو اُسے ایسے لگا جیسے نسیمہ نے ایک بار پھر اُس کی شہ رگ پکڑ لی ہو اور اُس کی نازک سی اُنگلیوں کے ناخن اُس کی شہ رگ میں اُتر رہے ہوں۔

اُس نے ریشمی رومال جو گردن سے لپیٹ رکھا تھا اُسے اور زیادہ مضبوطی سے لپیٹ لیا تاکہ اس کے ماں باپ اس کی شہ رگ پر ناخنوں کے نشان نہ دیکھ لیں۔

وہ کمرے میں جب اکیلا تھا تو اُس کی آنکھوں کے آگے نسیمہ آ گئی۔ نسیمہ ان لڑکیوں میں جن کے ساتھ منیر کے مراسم تھے واحد لڑکی تھی جو اُس کی ہوس کا نشانہ نہیں بنی تھی حالانکہ شادی سے پہلے وہ اُسے تنہائی میں ملتی تھی۔ راتوں کو ملتی تھی۔ انہیں دیکھنے والا کوئی نہیں ہوتا تھا۔ اُن کے درمیان پہنے ہوئے کپڑوں کے سوا کچھ بھی حائل نہیں ہوتا تھا، پھر بھی نسیمہ اُسے بے تکلفی کی ایک حد سے آگے نہیں بڑھنے دیتی تھی اور اسے وہ محبت کہتی تھی۔ اسی

محبت کے طلسم کا اثر تھا کہ اُس نے منیر کے ساتھ شادی کا عہد کیا تھا اور اُس کے ساتھ گھر سے بھاگ جانے کو بھی تیار ہو گئی تھی۔

منیر حیوانی جذبات کا بڑا خوبصورت مجسمہ تھا۔ اُس نے نسیمہ کے ساتھ صاف نیت سے پاک محبت کی خاطر تعلقات پیدا نہیں کئے تھے لیکن نسیمہ نے اُس کے دل میں پاک محبت یا محبت کی پاکیزگی پیدا کر دی تھی اور منیر نے اس محبت کو قبول کر لیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ نسیمہ کے لئے پاگل ہُوا جا رہا تھا۔ اگر نسیمہ کے ساتھ اُس کے مراسم دوسری لڑکیوں جیسے ہوتے تو وہ اُس کی پروا نہ کرتا۔ نسیمہ اُس کے لئے ایسا کھلونا نہ ہوتی جس کے ساتھ کھیل کھیل کر وہ اُکتا چکا ہوتا۔

وہ محبت اب انتقام کے جذبے کی صورت اختیار کر گئی تھی۔

منیر کے سینے میں ایک بچہ جاگ اُٹھا۔ بچہ اُس کھلونے کی ضد کر رہا تھا جس کے ساتھ وہ کھیلا نہیں تھا۔ کھلونا اُس کے سامنے پڑا تھا مگر اُسے مل نہیں رہا تھا۔

غصہ بڑھتا جا رہا تھا۔ انتقام کی آگ بھڑکتی جا رہی تھی۔

منیر کے ذہن میں خواجہ صاحب آتے۔ اُس نے خواجہ صاحب کو ذہن سے نکال پھینکا۔ حسنین کاظمی کا خیال آیا۔ اُسے بھی اُس نے ذہن سے نکال دیا۔

"سب دھوکہ ہے" — اُس نے اپنے آپ سے کہا — "جھوٹے سہارے ہیں۔ فریب کار عامل! کرتے کراتے کچھ ہیں نہیں۔ لُوٹتے ہیں ..... اب میرا اپنا جادو چلے گا۔ نسیمہ کو مجبور کر دوں گا اور وہ باغ والے کمرے میں بِن بلائے آجائے گی۔"

اُسے نسیمہ کی ماں یاد آئی۔ اُس نے منیر سے کہا تھا کہ وہ عمر حیات کو ایک عورت کے ساتھ پکڑوائے گی۔ یہ عورت عمر حیات کے ساتھ لگی بیٹھی ہو گی اور کسی طرح یہ منظر نسیمہ کو دکھایا جائے گا۔ مقصد یہ تھا کہ نسیمہ عمر حیات سے طلاق لے لے۔

منیر کو یہ طریقہ کچھ اچھا لگا اور وہ سوچنے لگا کہ عورت کا انتظام تو نسیمہ کی ماں کر دے گی اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ عورت عمر حیات کو اپنے پھندے میں لے لے لیکن نسیمہ کو یہ منظر کس طرح دکھایا جائے گا؟

وہ کچھ سوچتا رہا کہ یہ ناٹک کس طرح کامیابی سے کھیلا جا سکتا ہے۔ اُس کے دماغ میں اتنی باریکی نہیں تھی۔ اُس کی نفسیاتی کیفیت ایسی تھی کہ اُس کی سوچ گہرائی میں جا ہی نہیں سکتی تھی۔ سوچتے سوچتے اُسے خیال آگیا کہ وہ ماں بیٹی ہیں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ عین موقعہ پہ ماں کو اپنی بیٹی کا خیال آجائے اور وہ بھانڈہ ہی پھوڑ دے۔

منیر ادھر سے بھی مایوس ہو گیا۔ مایوسی کے عالم میں اُسے نسیمہ کی محبت اور وارفتگی اور ملاقاتیں یاد آنے لگیں۔ یہ خیال بھی آیا کہ اس محبت کو وہ پاک ہی رہنے دے تو کیا ہو ..... اُسے کچھ سکون سا محسوس ہُوا لیکن اچانک انتقام کا شعلہ بھڑکا اور اُس کے ذہن میں پاکیزگی کا جو پُرسکون خیال آیا تھا، وہ ذہن میں ہی جل کر راکھ ہو گیا۔

❖❖❖

اُس کے ذہن نے اپنے آپ کو سکون دینے کے لئے بڑے حسین تصوّر آراستہ کر لئے ..... محبت کی ملاقاتوں کے تصوّر ..... ان تصوّروں سے یادوں نے جنم لیا اور اُسے وہ فوٹو یاد آگیا جس میں نسیمہ اُس کی گود میں اُس کے بازوؤں کے گھیرے میں بیٹھی ہے اور دونوں کے گال ملے ہوئے ہیں۔

اس فوٹو کی یاد کیا آئی کہ منیر کے ذہن میں پھلجھڑیاں جلنے اور شرارے بکھیرنے لگیں۔ اُس کا دماغ روشن ہو گیا۔ اُس نے اپنے ٹین کے سوٹ کیس میں سے وہ فوٹو نکالا۔ خوشی کی ایک لہر اُس کے سارے وجود میں پھر گئی۔ اُسے یُوں محسوس ہونے لگا جیسے نسیمہ کی تصویر میں جان پڑ گئی ہو اور وہ اُس کے بازوؤں میں جیتی جاگتی آگئی ہو۔

وہ گھر سے نکل گیا۔ محلے کی اس گلی کے آخر میں نہایت معمولی سا

ایک مکان تھا۔ منیر اُس مکان میں گیا۔ یہ ایک غریب بہشتی کا مکان تھا۔ بہشتی گھر نہیں تھا۔ اُس کی بیوی اور ایک جوان بیٹی گھر تھیں۔ منیر کو اپنے گھر میں دیکھ کر ماں بیٹی اُس کے آگے جیسے بچھنے لگی ہوں۔ بہشتی کی بیوی کی عمر چالیس سال سے کچھ کم تھی لیکن اُس کے چہرے پر بڑھاپے کے کوئی آثار نہیں تھے۔ وہ سفیدی مائل گندمی رنگ کی خوبصورت عورت تھی۔

اُس کی کُل اولاد یہی ایک لڑکی تھی جس کی عمر اٹھارہ بیس سال کی تھی۔ وہ ماں کی صحیح تصویر تھی۔

بہشتی اتنا ہی بدصورت تھا جتنی خوبصورت اُس کی بیوی تھی اور وہ اتنا ہی ڈھیلا ڈھالا اور بھدے سے جسم کا تھا جتنی تیز طرار اور پھرتیلی اُس کی بیوی تھی۔ بہشتی بدھو سا آدمی تھا صبح سے شام تک مشکیزہ اُس کی پیٹھ پر رہتا اور وہ محلے سے باہر ایک کنوئیں سے مشکیزہ بھرتا اور لوگوں کے گھروں میں گھڑے مٹکے بھرتا رہتا تھا۔ دُنیا سے وہ لاتعلق معلوم ہوتا تھا۔ اُسے تو جیسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ اس کے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔

بہشتی کی بیوی خفیہ پیغام اِدھر اُدھر لے جانے کا کام کرتی تھی۔ اُس کی جوانی ایسے ہی خفیہ کاموں میں گزری تھی۔ نسیمہ اور منیر کی جب ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں تو ان کا رابطہ اسی بہشتن کے ذریعے قائم تھا۔

منیر بہشتن کے گھر گیا تو وہ سمجھ گئی کہ منیر کسی کام سے آیا ہے۔ اُس نے اپنی بیٹی سے کہا کہ اندر سے چارپائی اُٹھا لا اور [illegible]۔ لڑکی اندر چلی گئی تو منیر نے بہشتن سے کہا کہ اُس کے باغ میں آجائے۔ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

بہشتن اُس کے پیچھے پیچھے اُس کے باغ والے کمرے میں پہنچ گئی۔

منیر نے جیب سے فوٹو نکالا اور بہشتن کے آگے رکھ دیا۔

"یہ تصویر میں نے پہلے بھی دیکھی تھی" — بہشتن نے کہا — "اب کیوں میرے آگے رکھ دی ہے"

"تم سے کیا پردہ جیراں!" — منیر نے کہا — "شادی کر کے چڑیا جال سے نکل گئی ہے۔"

"شادی سے پہلے تو اشارے پہ آجاتی تھی" — جیراں بہشتن نے کہا۔

"اب نہیں آتی" — منیر نے کہا — "اب تو بات بھی نہیں کرتی۔"

"تمہارے اس احسان کو بھی نہیں مانتی کہ تم نے اُس کے گھر سے ڈاکو پکڑے تھے؟" — جیراں نے کہا — "منیر چوہدری! تم نہ پہنچتے تو ڈاکو اُس کے گھر کا صفایا کر جاتے اور نسیمہ کو بھی ساتھ لے جاتے ..... لیکن چوہدری! تم تو اُس کے گھر جاتے رہتے ہو۔"

"وہ میرا احسان تو مانتی ہے" — منیر نے کہا — "لیکن اُس کی وہ قیمت نہیں دیتی جو میں مانگتا ہوں۔ میں نے بات کی۔ شادی سے پہلے والی محبت یاد دلائی مگر اُس نے میری بے عزتی کر دی۔ میں اُسے تارے دکھانا چاہتا ہوں۔"

"وہ کس طرح؟" — جیراں نے پوچھا۔

"تم اُس کے گھر جاؤ" — منیر نے کہا — "اور اُسے کہو کہ میرے پاس فوٹو ہے جس میں تم میری گود میں بیٹھی ہو۔ میں یہ فوٹو تمہارے خاوند کو دکھاؤں گا اور اُسے کہوں گا کہ یہ فوٹو تمہاری شادی کے بعد کا ہے۔ پھر اُسے یہ کہنا کہ عدالت میں مستانے اور اُس کے ایک ساتھی کے خلاف عمر حیات کے گھر ڈاکہ ڈالنے کا کیس چل رہا ہے۔ میری ابھی گواہی نہیں ہوئی۔

جب میری گواہی ہوگی تو ملزموں کا وکیل مجھ سے ضرور پوچھے گا کہ میں اتنی رات گئے عمر حیات کے گھر کیا کر رہا تھا؟ میں کہہ دوں گا کہ نسیمہ مجھے کبھی کبھی رات کو اپنے گھر بلایا کرتی تھی۔ اُس رات وہ اپنے خاوند کو شربت یا دُودھ میں افیم پلا دیا کرتی تھی۔ اُس رات بھی اُس نے مجھے بلایا تھا۔ میں وقت سے پہلے چلا گیا تھا۔ ڈیوڑھی کا دروازہ ابھی کھلا نہیں تھا۔ میں دیوار پر چڑھ گیا اور اندر گیا تو آگے ڈاکو مل گئے۔"

"تم اُسے ڈرا کر زیر کرنا چاہتے ہو" — جیراں نے کہا — "کیوں اُس کے پیچھے سر کھپا رہے ہو؟"

"ہاں" — منیر نے کہا — "میں اُسے ڈرا کر زیر کرنا چاہتا ہوں۔ پہلے میں کہتا تھا کہ خاوند سے طلاق لے لے اور میری بیوی بن جائے۔ اب میں اُسے بے نکاحی بیوی بنا کے رکھوں گا۔ میں اُسے جال میں لا رہا ہوں کہ وہ میرے اشاروں پہ ناچے گی۔ تم بات سمجھ گئی ہو۔ اُس تک میرا پیغام پہنچا دو۔ تم خود عقل والی ہو۔ کچھ باتیں اپنے پاس سے بھی کہہ دینا" — اُس نے جیب سے کچھ پیسے نکال کر جیراں کو دیئے۔

"ایک بات کہوں گی منیر چوہدری!" — جیراں نے کہا — "پیسے چاہے نہ دو، میری ایک بات مان لو۔ میری بیٹی کو بُری نظر سے نہ دیکھا کرو۔ میں اُسے کنواری رخصت کرنا چاہتی ہوں۔"

"تمہاری بیٹی تو مجھے نسیمہ سے زیادہ اچھی لگتی ہے" — منیر نے ہنستے ہوئے کہا — "یہ ذات پات کا معاملہ نہ ہوتا تو میں تیری بیٹی کے ساتھ شادی کر لیتا۔"

"رحم کرو منیر چوہدری!" — جیراں نے کہا — "تم کسی کے ساتھ بھی شادی نہیں کرو گے۔ میری بیٹی سے نظریں ہٹا لو۔ میں تمہاری نظریں پہچانتی ہوں۔"

"تم اپنے خاوند کے گھر کنواری آئی تھیں؟" — منیر نے پوچھا — "بیٹی کو اتنا پاکباز کیوں بنا رہی ہو؟"

"غربت اور چھوٹی ذات!" — جیراں نے آہ بھر کر کہا — "خدا مجھے بھی اپنے خاوند جیسی شکل و صورت اور ویسا ہی جسم دیتا تو میں سکھی رہتی۔ تم اُس وقت بہت چھوٹے تھے جب مجھ پر جوانی آئی تھی۔ تم جیسے چوہدری مجھ پہ منڈلانے لگے تھے۔ نیچ ذات کی بیٹی کو اونچی ذاتوں کے مرد بن بیاہی دلہن سمجھتے ہیں لیکن میں نے اپنا دامن بچائے رکھا۔ کسی نے مجھے سبق نہیں دیا تھا کہ ان مردوں سے یوں بچا جا سکتا ہے۔ یہ میرا اپنا دماغ تھا جس نے مجھے چالاک اور ہوشیار

بنا دیا۔ میں ایک بہشتی کی بیٹی تھی۔ میں بھی اُونچی ذاتوں کے گھڑے بھرتی تھی۔ میرے کانوں میں مردوں کی سرگوشیاں پڑتی رہتی تھیں — جیراں .... جیراں، — اور میں ہنس کھیل کر پلّو بچاتی پھرتی تھی ....

"میں نے ان لوگوں کو انگلیوں پہ نچا دیا۔ جھلک دکھا کر اِدھر اُدھر ہو گئی۔ تم جیسے چوہدری مجھے ریشمی سوٹ اور نوٹ دکھاتے تھے۔ تمہیں کیا بتاؤں منیر چوہدری! اُنہوں نے مجھ پر کیسے کیسے جال پھینکے۔ میرا باپ ان اُونچی ذاتوں کا محتاج اور غلام تھا۔ ایک ہی بھائی تھا۔ وہ بھی تمہاری برادری کے گھروں میں نوکری کرتا تھا۔ میرے سر پہ ہاتھ رکھنے والا اللہ ہی تھا۔ اُسی نے مجھے پاک صاف رکھا۔ جن کا کوئی نہیں ہوتا اُن کا خدا ہوتا ہے۔"

"تم نے یہ بک بک کیوں شروع کر دی ہے؟" — منیر نے اُکتاتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔

"اپنی بیٹی کی خاطر!" — جیراں نے کہا — "میں تم سے اپنی بیٹی کے کنوارپن کی بھیک مانگتی ہوں۔ بیٹی کو دیکھ کر اپنی جوانی یاد آ گئی ہے۔ میری پوری بات سُن لے منیر چوہدری! تم نہیں سنو گے تو اور کس کو سناؤں .... میری شادی اس آدمی کے ساتھ ہو گئی۔ شکل و صورت، رنگ رُوپ اور جسم دیکھو تو کیا میری شادی اس آدمی کے ساتھ ہونی چاہیئے تھی؟ مجھے تو دو تم جیسے شہزادے ملے تھے جو کہتے تھے کہ آجاؤ، نکاح پڑھا کر رانی بنا کے رکھیں گے۔"

"کون تھے وہ؟"

"کیا کرو گے پوچھ کر؟" — جیراں نے کہا — "ایک بڑی دُور کا رہنے والا تھا .... تم میری بات سنو نا! میں نے اسی خاوند کو دل سے قبول کر لیا لیکن اس نے مجھ پر سوائے الزام تھوپنے کے اور کچھ نہ کیا۔ جس کسی کی بات کرتا تو کہتا تھا — 'وہ تیرا یار' — بات یہ تھی کہ اس پر یہ وہم سوار تھا کہ میں اسے پسند نہیں کرتی۔ اسے اپنی بدصورتی وہم میں ڈالے رکھتی تھی۔ یہ کبھی رات کو چرس پی آتا۔ کبھی سکھوں سے دیسی شراب چڑھا آتا اور میری شامت آجاتی۔ یہ شخص مجھ پر اپنی طاقت کا رعب جمانا چاہتا تھا اور اس کے لئے یہ

چرس اور شراب کا سہارا لیتا تھا ...

"ایک اس کے جسم کی بدبُو، اس کے ساتھ چرس اور شراب کی بدبُو، اس پر طعنے اور بدچلنی کے الزام۔ میرے دل میں اُس کی جو قدر رہتی وہ ختم ہوگئی پھر اُسے دیکھ کر ہی مجھے گھن آنے لگی۔ میں نے اُسے کہا کہ عورت صرف یہ نہیں چاہتی جو تم سمجھتے ہو لیکن یہ پورا جانگلی بن چکا تھا۔ میری یہ بچّی پیدا ہوئی۔ اس بچّی پر خُدا نے یہ ظلم کیا کہ اسے میرا چہرہ، میرا رنگ روپ اور میرا جسم دے دیا۔ اس کا ایک بال بھی اپنے باپ پر نہ گیا۔ باپ نے کہنا شروع کر دیا کہ یہ بچّی اس کی ہے ہی نہیں۔ آج بھی اُسے یہ شخص حرام کی اولاد کہتا ہے۔ یہاں سے میرا دماغ پھرنا شروع ہوگیا....

"تم جانتے ہو منیر چوہدری! اس شخص کی آمدنی کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں۔ تم لوگ جو دیتے ہو، وہی چند ٹکے آمدنی ہے نا! میرے سامنے اب بچّی تھی اور یہ خیال بھی کہ اور بچے بھی ہوں گے۔ میں نے سوچا کہ آج بچّی کے لئے تنکا تنکا بناؤں گی تو اس کی شادی کی عمر تک اس کا جہیز پورا ہوگا۔ ہماری کون سی زمین جائیداد ہے جس سے ایک ہی بار جہیز بنالیں۔ اس کے باپ کو بچّی کا ذرا سا بھی خیال نہ تھا۔ الزام الگ تھے۔ میرے اندر وہی چالاکی اور فریب کاری جاگ اُٹھی جس سے میں نے اپنا کنوارپن بچاتے رکھا تھا۔ تم جیسے شہزادے تو اب بھی میرے پیچھے پھرتے تھے۔ میں نے اب انہیں دوسرے طریقے سے خوش کرنا شروع کر دیا۔"

"دوسرا طریقہ کون سا؟"

"یہی جو تمہارے لئے کر رہی ہوں"۔۔۔جیراں نے کہا۔۔۔"اِدھر کا پیغام اُدھر، اُدھر کا اِدھر۔ کئی دل جوڑے، کئی توڑے اور جو چیز مجھے اپنے خاوند سے نہیں مل رہی تھی وہ میں نے اپنی پسند کے ایک آدمی سے حاصل کر لی۔ میرا خاوند تو جوانی میں ہی اس حال کو پہنچ گیا تھا جس حال میں آج ہے۔ اس پر جوانی تو آئی ہی نہیں تھی۔ اگر یہ مجھے انسان سمجھتا تو میں اپنا من مار لیتی۔ چرس اور شراب نے اس کا بیڑہ غرق کر دیا۔ گھر میں جو پیسہ آتا وہ چرس

اور شراب میں نکل جاتا تھا۔ میں نے خاوند پر بھی اپنا جادو چلا لیا اور اسے اپنے پاؤں میں بٹھا لیا....

"پھر میں لومڑی کی طرح چالاک ہوگئی۔ کسی کو ہنس کر اپنا بنا لیا، کسی کے دل میں رو کر اپنا درد پیدا کر لیا، لیکن میں کسی کے ہاتھ مشکل سے ہی آتی تھی۔ خدا کی قسم منیر چوہدری! میں اگر آج اس شہر میں کہیں کھڑی ہو کر اعلان کر دوں کہ آؤ لوگو، میں تمہیں بتاتی ہوں کون کیا ہے اور فلاں نتھے خان کتنے پانی میں ہے تو یہاں کے بڑے بڑے چوہدری، ٹھاکر اور ایک دو عالم فاضل بھی گھروں میں چھپ کر بیٹھ جائیں۔ اب کہو تو آسمان سے تارے توڑ لاؤں .... تمہاری برادری کے تین گھر ہیں۔ وہ چوہدرانیاں اب میری عمر کی ہیں۔ مجھے دیکھ کر گھبرا جاتی ہیں۔ اپنے ساتھ چارپائی پر بٹھاتی ہیں۔ عزت کرتی ہیں۔ کیوں نہ کریں؟ اُن کی جوانی کے بھید میرے سینے میں ہیں۔"

"کون کون سا گھر ہے؟"

"یہ بے ایمانی کبھی نہیں کی"۔۔۔جیراں نے کہا۔۔۔"تمہارا اور نسیمہ کا بھید اللہ کے سوا اور میرے سوا کوئی نہیں جانتا۔ تم مجھے مُنہ مانگی قیمت دیتے ہو۔ میں تمہیں اور نسیمہ کو دھوکہ نہیں دوں گی .... منیر چوہدری! میں اپنی بیٹی کو پاک صاف اس کے خاوند کے حوالے کرنا چاہتی ہوں۔"

"اس کا خاوند کون ہوگا؟"۔۔۔منیر نے پوچھا۔۔۔"تمہارے خاوند جیسا تو نہیں؟"

"لڑکا دیکھ کر بات پکّی کروں گی"۔۔۔جیراں نے کہا۔۔۔"تم مجھ پر یہ رحم کر دو کہ میری بیٹی سے نظریں ہٹا لو۔"

"چلو مان لیا"۔۔۔منیر نے کہا۔۔۔"میں اُس کی طرف دیکھوں گا بھی نہیں۔"

❖

منیر کو اچانک ایک خیال آ گیا۔

"جیراں!"۔۔۔اُس نے کہا۔۔۔"تمہاری بیٹی سے ایک کام لینا ہے۔

وہ کنواری رہے گی۔ میں جانتا ہوں وہ سیدھی سادی لڑکی نہیں۔ تمہاری چالاکی اُس میں بھی آگئی ہے۔ مُنہ سے جو مانگو گی دوں گا۔"

"بات کرو، بات کرو" — جیراں نے کہا — "کام کیا ہے؟"

"اپنی بیٹی کو ملک عمر حیات کی گود میں اس طرح بٹھا دو جس طرح اس تصویر میں نسیمہ میری گود میں بیٹھی ہوئی ہے" — منیر نے کہا — "اور اُس حالت میں نسیمہ کو دکھا دو۔ بس، اتنا سا کام ہے۔ اس کے بعد تمہاری بیٹی وہاں سے بھاگ آئے۔ اُس کا پلّو پاک رہے گا۔"

"کر سکتی ہوں" — جیراں نے کہا — "کروں گی نہیں۔ اپنی بیٹی کو اس راستے پر نہیں ڈالوں گی۔"

"مُنہ سے بولو، کیا مانگتی ہو؟"

"ساری زمین میرے نام کر دو، اپنی بیٹی کو اس طرح استعمال نہیں کروں گی" — جیراں نے کہا — "اس سے تمہیں حاصل کیا ہوگا منیر چوہدری؟ .... اس کا نتیجہ اُلٹ بھی ہو سکتا ہے۔ میں عمر حیات کو جانتی ہوں۔ وہ اس پھندے میں آئے گا بھی نہیں۔ میں تمہارا کام اس کے بغیر کرا دوں گی۔"

"پھر مجھے نسیمہ کی ماں سے بات کرنی پڑے گی" — منیر نے کہا — "وہ کہتی تھی کہ بڑی پکّی عورت کا بندوبست کر دے گی۔"

"اُس سے کرا لو" — جیراں نے کہا — "لیکن وہ تمہیں عین وقت پر دھوکہ دے گی۔ وہ کسی کی بھی سگی نہیں۔ اپنی بیٹی کی بھی سگی نہیں۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ مجھے معلوم نہیں کہ وہ اپنی بیٹی کی دشمن ہو گئی ہے؟ عمر حیات نے دس دس کے دو نوٹ اُسے دکھا دیئے تو اُس کے سامنے وہ تمہیں ننگا کر دے گی۔ وہ تو اللہ کی بددعا تی ہوئی عورت ہے منیر چوہدری! میرے دل میں جو کچھ ہے وہ تمہیں معلوم ہے۔ نسیمہ کی ماں کے دل کا تمہیں کبھی پتہ نہیں چلے گا کہ اُس میں کیا ہے۔ آگے تمہاری مرضی ہے۔"

"چلو، پھر تم ہی کام کر دو" — منیر نے کہا — "نسیمہ کو میرا پیغام دے دو اور اُسے اپنی طرف سے بھی ڈرانا۔"

❖

جیراں اُسی روز نسیمہ کے گھر بیٹھی تھی۔ نسیمہ کا رنگ پیلا پڑ گیا تھا۔ جیراں اُسے منیر کا پیغام دے چکی تھی۔

"تم شادی شُدہ عورت ہو نسیمہ!" — جیراں نے اُسے کہا — "منیر تمہیں کھا تو نہیں جائے گا۔ وہی منیر ہے جس کے پاس تم راتوں کو بھی چلی جایا کرتی تھیں۔ وہ تمہاری محبت میں پاگل ہو رہا ہے۔ تمہارے گھر کو اُس نے ڈاکوؤں سے بچایا ہے۔ اپنی جان کو اُس نے خطرے میں ڈالا ہے۔"

"اُس نے میرے گھر میں پتھر پڑوائے ہیں" — نسیمہ نے کہا — "میرے گھر میں آگ لگائی ہے۔"

"منیر چوہدری نے؟" — جیراں نے حیرت سے کہا — "وہ جو اتنے دن تمہارے گھر میں پتھر گرتے رہے ہیں وہ ...."

"وہ اس منیر کی کارستانی تھی" — نسیمہ نے کہا — "مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ اُس نے یہ کام کس سے کرایا تھا۔ میں اُسے جتا چکی ہوں اور وہ مان گیا تھا .... اور یہ جو ڈاکوؤں کو پکڑوانے والا معاملہ ہے، اس میں بھی اُس کی کوئی اُستادی ہے۔ میں تو اُس کی صورت بھی نہیں دیکھنی چاہتی۔ وہ کمینہ آدمی ہے۔"

"پھر وہ پوری کمینگی کرے گا" — جیراں نے کہا — "اُس کے پاس جو تصویر ہے وہ میں نے بھی دیکھی ہے۔ اگر وہ تصویر اُس نے تمہارے خاوند کو دکھا دی تو تمہارا خاوند اکھڑ مزاج آدمی ہے، طلاق سے کم بات نہیں کرے گا۔ منیر عدالت میں بھی یہ تصویر پیش کر سکتا ہے۔ سارے شہر کو یہ تصویر دکھائے گا .... ایک بار اُسے مل ہی لو۔"

"جیراں!" — نسیمہ نے کہا — "ایک کام کر دو۔ وہ فوٹو کسی طرح مجھے لا دو۔ میں اپنا زیور تمہارے آگے رکھ دوں گی۔ جو چیز تمہیں اچھی لگے گی لے لینا چاہے وہ کتنی ہی وزنی اور قیمتی ہو۔"

"یہ کام نہیں کر دوں گی" — جیراں نے کہا — "تم مجھ سے ناراض ہو گی تو میرا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکو گی۔ منیر کی ناراضگی مجھے بہت مہنگی پڑے گی۔ اُسے

پتہ چل گیا کہ تصویر میں نے چُرا کر تمہیں دے دی ہے تو وہ مجھے قتل کرا سکتا ہے، میری کنواری بیٹی کو اغوا کرا سکتا ہے، اُسے خراب کر سکتا ہے۔ وہ بہت کچھ کر سکتا ہے نسیمہ! وہ کینہ رکھنے والا آدمی ہے ..... اور نسیمہ! تمہاری اپنی ماں تمہاری دشمن بنی ہوئی ہے۔ ذرا سوچ لو، پھر جواب دے دینا۔"

"یہ لو جیراں!" ــــ نسیمہ نے جیراں کو پانچ روپے دے کر کہا ــــ "زبان بند رکھنا۔ کسی اور کے ساتھ اس تصویر کا ذکر نہ کرنا۔"

"نہ نسیمہ بی بی!" ــــ جیراں نے کہا ــــ "میں دھوکہ نہیں دیا کرتی۔ کسی کا بھید کسی کے آگے نہیں کھولا کرتی۔ تم تو جانتی ہو۔ پہلے تم نے مجھے آزمایا نہیں؟ مجھے کچھ دو یا نہ دو، میں کسی اور کے آگے زبان نہیں کھولوں گی.... منیر کو میں کیا جواب دوں؟"

"اس کمینے سے کہنا کہ تین چار دن سوچنے کی مہلت دو" ــــ نسیمہ نے کہا ــــ "اور جیراں!" ــــ نسیمہ نے منت کے لہجے میں کہا ــــ "تم بھی اُسے کہنا کہ یہ فوٹو کسی اور کو نہ دکھاتے۔"

"وہ تو میں کہوں گی ہی!" ــــ جیراں نے کہا ــــ "لیکن اس کے آگے انکار نہ کرنا۔ تباہ ہو جاؤ گی نسیمہ بی بی!"

◆◆◆

اُس تباہی کے تصور سے ہی نسیمہ کانپ اُٹھی جس کی طرف جیراں کا اشارہ تھا۔ وہ طلاق سے ڈرتی تھی۔ طلاق اور بدنامی لازم وملزوم ہیں۔ کسی بیوی کو خاوند کی زیادتی سے طلاق ہو جاتے، بیوی خواہ بے گناہ ہی ہو، بدنامی بیوی کی ہوتی ہے۔ خاوند کی اتنی سی بات کہ بیوی بدچلن ہے، بیوی کی ساری زندگی تاریک کر دیتی ہے۔ جوانی کی طلاق تو اور زیادہ اذیت ناک ہوتی ہے۔ یہی تو شادی کی عمر ہوتی ہے لیکن دوسری شادی مخدوش ہو جاتی ہے۔ مطلقہ لڑکی کو مشتبہ اور مشکوک سمجھا جاتا ہے۔ اُس کی قسمت میں بچوں والا اور بڑی عمر والا کوئی رنڈوا لکھا ہوتا ہے۔

نسیمہ کی صورت تو اور زیادہ مخدوش تھی۔ وہ ملک عمر حیات جیسے اچھے

اور روپے پیسے والے خاوند کو نہیں چھوڑ سکتی تھی۔ بے شک وہ جوان اور خوبصورت تھی لیکن اس قسم کے خاوند کم ہی ملا کرتے ہیں۔ اُس کے لئے دوسری مشکل یہ تھی کہ ماں کے ساتھ بھی اُس نے دشمنی مول لے لی تھی۔ اس کے علاوہ وہ ماں کی وجہ سے بدنام گھرانے کی لڑکی تھی۔ اُس کی دوسری شادی اس لئے بھی مخدوش تھی کہ اُس کے گھر پتھر پڑتے رہے اور آگ لگتی رہی تھی۔ لوگوں نے جو قصے گھڑ لئے تھے، ان میں ایک یہ بھی تھا کہ نسیمہ پیروں فقیروں کی بددعائی ہوتی ہے اور اُس پہ آسیبی سایہ ہے۔

نسیمہ کو ابھی معلوم نہیں ہُوا تھا کہ اُسے طلاق دلوانے کی کوشش میں اُس کی ماں بھی شامل ہے اور اُس نے منیر سے وعدہ کیا ہے کہ وہ عمر حیات سے نسیمہ کو طلاق دلوا دے گی اور اگر وہ عمر حیات کو قتل کر دے تو وہ نسیمہ کی شادی منیر کے ساتھ کر دے گی۔

جیراں چلی گئی اور نسیمہ کے لئے قیامت آگئی۔ اُس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا۔ اس فوٹو کا خوف تو اُس نے پہلے ہی اپنے اُوپر طاری کر رکھا تھا۔ اُس نے حسنین کاظمی کو اپنے ماضی کے واقعات سناتے ہوئے اُس فوٹو کا ذکر بھی کیا تھا کہ منیر اُسے اس فوٹو سے بلیک میل کر سکتا ہے۔ حسنین کاظمی نے اُسے تسلی دیتے ہوئے کہا تھا کہ منیر نے ایسی حرکت کی تو وہ اس سے یہ فوٹو لینے کی کوشش کرے گا۔

نسیمہ اب حسنین کاظمی کو ہی اپنا سہارا سمجھتی تھی لیکن حسنین کاظمی تک پہنچنا اُس کے لئے آسان نہیں تھا۔ وہ پانچ میل دُور گاؤں میں رہتا تھا جہاں وہ اکیلی نہیں جا سکتی تھی۔ وہاں تک تانگہ یا یکہ جاتا تھا۔ نسیمہ کے لئے جانا مشکل تو نہ تھا، مشکل یہ تھی کہ وہ خاوند کو بتائے بغیر نہیں جا سکتی تھی۔ بتانے کی صورت میں اُسے جانے کی وجہ بھی بتانی پڑتی تھی اور یوں بھی ہو سکتا تھا کہ عمر حیات اُسے کہتا کہ وہ خود اُسے وہاں لے جائے گا۔ اس صورت حسنین کاظمی کے ساتھ فوٹو کا ذکر نہیں کر سکتی تھی۔

وہ دل ہی دل میں دعائیں کرنے لگی کہ حسنین کاظمی خود ہی اِدھر آنکلے۔

ایک دوبارہ وہ آیا تھا۔

نسیمہ کا دوسرا سہارا اپنا خاوند تھا۔

"کیا عمر حیات کو بتا دوں؟" — اُس کے ذہن میں سوال اُٹھا۔

"نہیں، نہیں" — اُس کے سینے سے آوازیں اُٹھیں — "کیا تم عمر حیات کو یہ بھی بتا دو گی کہ قابلِ اعتراض حالت میں تمہارا ایک فوٹو منیر کے پاس ہے؟"

"اگر اس نے فوٹو عدالت میں پیش کر دیا تو کیا ہوگا؟"

"میں خودکشی کر لوں گی" — اُسے اپنی آواز سنائی دی — "یہی ایک راستہ ہے۔ طلاق سے تو خودکشی بہتر ہے۔"

"اپنا آپ منیر کے حوالے کر دوں؟" — ذہن سے ایک اور سوال اُبھرا۔

اس سوال پر وہ غور کرنے لگی۔ اُسے وہ دن یاد آئے جب وہ منیر سے ملا کرتی تھی۔ وہ خواب بھی منیر کے ہی دیکھا کرتی تھی۔ اس خوبرو جوان کو اُس نے ایک مقدس دیوتا کی طرح اپنے دل میں بسا لیا تھا۔ اُسے اپنی سوچوں پر اور اپنے اعصاب پر سوار کر لیا تھا۔ اُس کا جینا مرنا منیر کے لئے تھا۔ خطرے مول لے کر بھی اُسے ملا کرتی تھی۔ اُسے دو چار وہ راتیں بھی یاد آئیں جب وہ آدھی رات کو منیر کے باغ والے کمرے میں چلی گئی تھی۔ محلے سے نکل کر اور کھیتوں میں سے گزر کر ایک نوجوان لڑکی کا چوری چھپے باغ تک جانا آسان نہیں تھا لیکن محبت ایک نشہ بن گئی تھی، جیسے منیر نے اُسے ہپناٹائز کر دیا تھا کہ وہ پکڑے جانے کے خوف سے آزاد ہو گئی تھی۔ اُسے اس کا بھی ڈر محسوس نہیں ہوتا تھا کہ اُس کے نکل جانے کے بعد گھر کا کوئی فرد جاگ اُٹھا تو اُسے پتہ چل جائے گا کہ نسیمہ گھر سے غائب ہے۔

جیراں اُسے بہت اچھی لگا کرتی تھی۔ وہ منیر کے پیغام لایا کرتی تھی۔ منیر کے منع کرنے کے باوجود وہ جیراں کو پیسے دیا کرتی تھی۔

نسیمہ کو ایک ایک لمحہ جو اُس نے منیر کے ساتھ گزارا تھا یاد آرہا تھا۔ اُسے کچھ سکون سا اور سرور سا محسوس ہو رہا تھا۔ منیر نے شروع میں اُس کے ساتھ وہی تعلق قائم کرنا چاہا تھا جو اُس نے دوسری لڑکیوں کے ساتھ

قائم کر رکھا تھا لیکن نسیمہ نے اُس کے دل میں محبت کی پاکیزگی پیدا کر دی تھی۔

نسیمہ شریف ماں کی بیٹی نہیں تھی۔ ماں نے اُس میں نمائش کا رجحان پیدا کر دیا تھا جس میں اوچھا پن بھی تھا، پھر بھی نسیمہ کے کردار میں ایک رمق سی باقی رہ گئی تھی جس نے اُس کی توجہ جسمانی لذت کی طرف نہیں آنے دی تھی۔ یہ جذبہ اتنا شدید تھا جو اس نے منیر جیسے کھوکھلے اور آوارہ آدمی پر بھی غالب کر دیا تھا۔

نسیمہ کو وہ دن یاد آیا جب اُس نے منیر کی گود میں بیٹھ کر فوٹو اُتروایا تھا۔ اس یاد نے نسیمہ کا سکون تہہ و بالا کر دیا اور وہ جو سرور سا محسوس کر رہی تھی وہ اُڑ گیا۔ اُس کی سانسوں کا تسلسل درہم برہم ہونے لگا۔

"کمینہ .... اوچھا" — اُسے اپنی غصیلی آواز سنائی دی — "کم ذات ... اُسے میری محبت کی قدر ہوتی تو اس فوٹو کو محبت کی یادگار سمجھ کر اپنے پاس پیار سے رکھتا .... اُس کی دلچسپی میرے جسم کے ساتھ ہے۔"

اُسے یوں لگا جیسے اُس کے اِردگرد پتھر گِر رہے ہوں اور اُس کے سینے میں آگ بھڑک اُٹھی ہو۔

"تم شادی شدہ ہو" — اُسے جیراں کی آواز سنائی دی — "ہرج ہی کیا ہے۔ تھوڑی دیر کے لئے اُس کے پاس چلی جایا کرو۔"

نسیمہ کا خون اُبلنے لگا۔ وہ عمر حیات جیسے خاوند کو دھوکہ دینے پر اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر سکتی تھی۔

"پھر کیا کرو گی؟" — یہ سوال اُس کے ذہن میں زہریلے ناگ کی طرح رینگنے لگا۔

غصے کی ایک لہر آئی۔ اُسے یوں لگا جیسے وہ بگولہ بن گئی ہو یا ہر چیز اُس کے گرد تیزی سے گھوم رہی ہو۔ غصے کی شدت سے اُس کے دانت بجنے لگے۔ اُسے وہی دورہ پڑ گیا جس میں اُس نے منیر کی شہ رگ پکڑ لی اور اُسے جان سے مارنے لگی تھی۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور بڑی تیزی سے کمرے میں چلنے لگی۔ ایک بار وہ اتنی تیز چلتی گئی کہ دوسرے کمرے کے دروازے

سے ٹکرا گئی۔ اُس نے بڑی زور سے کواڑ کو گھونسہ مارا اور واپس آگئی۔

برآمدے میں بلّی بولی۔ نسیمہ کمرے میں رُک گئی اور اُس نے باہر دیکھا۔ اُس کے چہرے پر قہر اُترا ہُوا تھا۔ بلّی جب دوسری مرتبہ بولی تو نسیمہ اس طرح باہر کو دوڑی جیسے بلّی کو کھا جائے گی۔ اُسے دیکھ کر بلّی دوڑ پڑی۔ برآمدے میں ایک دیگچی پڑی تھی۔ نسیمہ نے دیگچی اُٹھا کر بلّی پر پھینکی بلّی دیگچی کے پہنچنے تک سیڑھیاں چڑھ گئی تھی۔

دیگچی کے دھماکے سے ایک دھماکہ نسیمہ کے سر کے اندر ہُوا جس نے اُسے قہر وغضب کی اس کیفیت سے نکال لیا۔ غصّے کی لہر گزر گئی۔ نسیمہ کمرے میں چلی گئی اور پلنگ پر اوندھے مُنہ گر کر پھُوٹ پھُوٹ کر رونے لگی۔ وہ تنہا تھی۔ یہ ایسا مسئلہ تھا جس کا ذکر وہ کسی کے ساتھ بھی نہیں کر سکتی تھی۔ کسی سے مشورہ نہیں لے سکتی تھی۔ کسی کو مدد کے لئے نہیں پکار سکتی تھی۔ وہ بہت دیر روتی رہی مگر آنسوؤں نے بھی اُسے سکون نہ دیا۔ اُس نے اپنے آپ کو آہستہ آہستہ سنبھال لیا۔ اتنی دیر میں شوکت سکول سے آگیا اور وہ شوکت کے ساتھ مصروف ہو گئی۔

"امّی جان!" — شوکت نے اُس سے پوچھا — "آپ رو رہی ہیں؟"

شوکت اُسے اتنا پیارا لگا کہ اُس نے بیساختگی سے اُسے بازوؤں میں لے لیا اور اپنے سینے سے لگا لیا۔ اس سے پہلے اُس نے اس بچّے کے ساتھ کبھی اس وارفتگی سے پیار نہیں کیا تھا۔ اُس روز اُسے یوں لگا جیسے ڈوبتے کو تنکے کا سہارا مل گیا ہو۔

"نہیں شوکی!" — نسیمہ نے بڑے پیارے سے لہجے میں کہا — "میں تو نہیں روتی۔ میں کیوں روؤں! خدا نے مجھے تم جیسا پیارا بچّہ دیا ہے۔"

❖

رات کو عمر حیات گھر آیا تو اُس نے بھی محسوس کیا کہ نسیمہ اپنے آپ

میں نہیں۔ اُس نے نسیمہ سے پوچھا بھی، لیکن نسیمہ نے اُسے پھیکی سی مسکراہٹ سے ٹال دیا۔ رات جب عمر حیات خرّاٹے لے رہا تھا نسیمہ جاگ رہی تھی۔ نیند کا نام و نشان نہ تھا۔

"عمر حیات کو بتا دوں کہ ہم پر کالا جادو منیر نے کرایا تھا؟" — نسیمہ کے ذہن سے بار بار یہ سوال اُٹھ رہا تھا۔

"نہیں" — وہ خود ہی اپنے آپ کو جواب دے رہی تھی — "اگر عمر حیات کو پتہ چل گیا تو معلوم نہیں اس کا ردِّعمل کیا ہو۔ اگر یہ منیر کو کچھ کہہ بیٹھا تو منیر کا ردِّعمل وہی ہو گا جس کی وہ پہلے ہی دھمکی دے چکا ہے۔"

نسیمہ کا ذہن تلخیوں سے بھرتا جا رہا تھا۔ رات کے پچھلے پہر اُس کی ذرا سی آنکھ لگی تو اُس نے خواب میں منیر کو دیکھا۔ منیر آہستہ آہستہ اُس کی طرف بڑھتا آ رہا تھا۔ نسیمہ اُس کے راستے سے ہٹتی جا رہی تھی، لیکن منیر اُس کے قریب پہنچ گیا۔ اچانک منیر کا چہرہ بھیڑیئے جیسا ہو گیا اور اُس کے دانت باہر نکل آئے۔ اُس نے جب نسیمہ کو پکڑنے کے لئے دونوں ہاتھ آگے کئے تو اُس کے ناخن بھیڑیئے کے پنجوں جیسے تھے۔ نسیمہ پیچھے ہٹی تو پیچھے ایک دیوار تھی جس نے نسیمہ کو روک لیا۔ نسیمہ نے اپنا دایاں ہاتھ آگے کیا اور منیر کی شہ رگ اپنے پنجے میں لے لی۔ منیر نے اُس کے چہرے اور بازوؤں پر اپنے پنجے مارے۔ نسیمہ کا خون بہنے لگا۔ نسیمہ کی انگلیاں منیر کی شہ رگ میں اُتر گئیں اور اُس کی شہ رگ سے خون کا فوارہ پھُوٹا۔

نسیمہ کی آنکھ کھل گئی۔ نسیمہ نے دیکھا کہ اُس نے دائیں ہاتھ میں اپنے بائیں ہاتھ کی کلائی اتنی زور سے پکڑ رکھی تھی کہ تین چار چوڑیاں ٹوٹ گئی تھیں۔ خوف سے اُس کا دل ڈوب رہا تھا۔ کمرے میں اُسے منیر کا چہرہ ابھی تک نظر آ رہا تھا جو بھیڑیئے جیسا تھا۔ خوف جو نسیمہ پہ طاری ہو گیا تھا، وہ غصّے اور حقارت میں بدل گیا۔ اُس کے ذہن میں یہی ایک خیال اٹک گیا کہ منیر کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں۔

"اس مردود کو قتل کر دوں گی" — اُس کے ذہن سے بڑا بھیانک خیال

عزم بن کر اُٹھا — "یا اپنے آپ کو ختم کر لوں گی۔"

غصّے اور حقارت کی کیفیت میں اسے اس خیال نے سکون سا دیا جیسے اُسے مسئلے کا حل مل گیا ہو، لیکن ایک سوال نے اُسے پریشان کر دیا — "اسے کس سے قتل کرواؤں گی؟"

"زہر دے سکتی ہوں" — اُس نے سوچا — "لیکن کیسے؟ کہاں .... پکڑی جاؤں گی.... حسنین کاظمی سے کہوں گی کہ مجھ سے جو قیمت مانگو گے دوں گی، اپنا کالا جادو چلاؤ جس سے یہ مردود گھر بیٹھے بیٹھے مر جاتے۔"

باقی رات وہ سو نہ سکی۔ اُس کے دماغ کو خون چڑھ گیا تھا۔ صبح وقت پر اُٹھی، ناشتہ تیار کیا اور عمر حیات اور اُس کے بیٹے شوکت کو ناشتے کے لئے بلایا۔ چینی دان سے وہ پیالیوں میں چینی ڈالنے لگی تو چمچے سے آدھی چینی پرچ میں گری۔

"نسیمہ!" — عمر حیات نے اُس کی ایک دو بدحواسیاں دیکھ کر پوچھا — "میں کل رات سے دیکھ رہا ہوں کہ تم صحیح حالت میں نہیں ہو۔ اپنی ماں سے ملاقات یا ٹکر تو نہیں ہو گئی؟"

"ابّو!" — شوکت بول پڑا — "مجھے شک ہے کل امّی رو رہی تھیں۔"

"کیوں نسیمہ!" — عمر حیات نے پوچھا — "شوکی ٹھیک کہہ رہا ہے؟"

نسیمہ ہنس پڑی۔ اتنی سی ہنسی کے پیچھے اُس کی بہت بڑی کاوش اور جسم کی تمام تر قوتیں کارفرما تھیں۔

"کل شوکی جب سکول سے آیا اُس وقت میں سو کر اُٹھی تھی" — نسیمہ نے ہنسنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا — "میری آنکھیں شاید کچھ سرخ تھیں۔ یہ سمجھا شاید میں رو رہی ہوں۔"

"نسیمہ!" — عمر حیات نے کہا — "مجھ سے کچھ چھپانا نہیں۔ ہم ایک چکر میں آتے ہوتے ہیں۔ پہلے پتھروں اور آگ کی مصیبت رہی، پھر ڈاکو ہمارے گھر میں آ گئے۔ میرا خیال ہے کہ کوئی دشمن ہمیں پریشان کر رہا ہے۔ یہ دونوں وارداتیں ایک ہی سازش کی دو کڑیاں معلوم ہوتی ہیں۔"

"کاظمی صاحب نہیں ملے کبھی آپ کو؟" — نسیمہ نے پوچھا۔

"نہیں" — عمر حیات نے جواب دیا — "وہ اپنے رنگ میں مست رہنے والے آدمی ہیں۔ ان کی دنیا ہم سے الگ تھلگ ہے .... تم چاہو تو کسی روز اُن کے گاؤں چلے چلیں گے۔"

"کیا اُن کے ہاتھ میں واقعی کوئی علم ہے؟" — نسیمہ نے پوچھا۔

"کچھ نہ کچھ اُن کے ہاتھ میں ضرور ہے" — عمر حیات نے جواب دیا — "لیکن وہ اتنے لمبے چوڑے دعوے نہیں کیا کرتے۔"

شوکت سکول کے لئے اور عمر حیات اپنے کام پہ جانے کے لئے تیار تھے۔

دونوں چلے گئے اور نسیمہ اکیلی رہ گئی۔ اُن کے جانے کے بعد نسیمہ پہ پھر ہول طاری ہونے لگا۔ وہ باورچی خانے میں گئی تو اُس نے محسوس کیا جیسے منیر باورچی خانے میں کھڑا ہو۔ اُس کا چہرہ بھیڑئیے جیسا تھا۔ یہ ایک واہمہ تھا۔ نسیمہ بھی سمجھتی تھی کہ یہ رات کے خواب کا اثر ہے، لیکن وہ اس طرح ڈر گئی جیسے اُس نے مجسم منیر کو دیکھا ہو۔ اُس پر ایک بار پھر غصّے اور حقارت کی کیفیت طاری ہونے لگی۔ گھر میں کام کرنے والی مائی آ گئی جس نے اُسے باتوں میں لگا لیا۔ نسیمہ کے کرنے کے کچھ کام تھے، لیکن کسی کام میں اُس کا دل نہ لگتا تھا۔

"حسنین کاظمی تک پہنچنا ضروری ہے" — یہی ایک سوال تھا جو اُسے کہیں ٹکنے نہیں دے رہا تھا — "اُس تک کس طرح پہنچوں؟"

اچانک اُسے اُصلے کا خیال آ گیا۔ اُصلے پہ اُسے بھروسہ تھا۔ وہ کھری بات کہنے والا دیانت دار آدمی تھا۔ پہلے بھی اُصلے نے اُن لوگوں کا ساتھ دیا تھا۔

"اماں!" — اُس نے اپنی نوکرانی سے پوچھا — "اُصلے کو جانتی ہو؟"

"اُسے کون نہیں جانتا بی بی!"

"کام ختم کر چکو گی تو اُصلے کو میرے پاس بھیج دینا" — نسیمہ نے کہا — "ملک صاحب اُس کے لئے کام بتا گئے تھے۔"

نوکرانی اپنا کام کرتی رہی اور نسیمہ حسنین کاظمی کے لئے رقعہ لکھنے بیٹھ گئی۔ اُس نے لکھا کہ اس نے جس فوٹو کا ذکر کیا تھا وہ فوٹو بہت بڑا خطرہ بن کر سامنے آگیا ہے۔ اُس نے پوری تفصیل سے لکھا کہ منیر نے اُسے کیا پیغام بھیجا ہے۔

"خدا کے لئے کچھ کریں"۔۔۔ اُس نے آخر میں لکھا ۔۔۔ "آپ نے وعدہ کیا تھا کہ کبھی ایسی صورت پیدا ہوگئی تو آپ میری مدد کریں گے۔ یہ ایسا مسئلہ ہے جس کا میں ملک صاحب کے ساتھ اشارتاً بھی ذکر نہیں کر سکتی۔ اللہ کی ذات اور آپ کے سوا میری مدد کرنے والا کوئی نہیں میری اپنی ماں میری دشمن ہوگئی ہے۔ اُس نے ملک صاحب سے روپیہ پیسہ کھینچنے کے لئے اُن کے ساتھ میری شادی کی تھی لیکن اُس نے میری ازدواجی زندگی تباہ کرنے کی بڑی گھناؤنی کوشش کی ہے۔ ملک صاحب نے اور میں نے بھی اُسے کہہ دیا ہے کہ ہمارے ہاں نہ آیا کرے نہ ہم اُس کے گھر کبھی جائیں گے۔ کاظمی صاحب! خدا کے لئے کچھ کریں۔ اگر ملک نے مجھے طلاق دے دی تو میرا کیا بنے گا۔ یہ خیال بھی رکھیے گا کہ ملک صاحب یا بھائی اُصلے کو پتہ نہ چلے کہ میں اس مسئلے سے دوچار ہوں"۔

اُس نے اتنا طویل رقعہ لکھ کر سادے لفافے میں بند کیا اور اُصلے کو دینے کے لئے رکھ لیا۔

نوکرانی کام کرکے گئی تو تھوڑی دیر بعد اُصلا آگیا۔

"ایک تکلیف دے رہی ہوں بھائی!"۔۔۔ نسیمہ نے کہا ۔۔۔ "کاظمی صاحب سے ملے بہت دن ہوگئے ہیں۔ ایک رقعہ اُن تک پہنچانا ہے"۔

"پہنچا دوں گا بھابی!"۔۔۔ اُصلے نے کہا۔

"لیکن ایک احتیاط ضروری ہے میرے عزیز بھائی!"۔۔۔ نسیمہ نے کہا ۔۔۔ "کسی کو پتہ نہ چلے۔ ملک صاحب کو بھی پتہ نہیں چلنا چاہیئے"۔

"کوئی خاص بات ہے؟"

"اپنے گھر کی ہی بات ہے"۔۔۔ نسیمہ نے کہا ۔۔۔ "دل بہت گھبراتا

ہے۔ خوف سا رہتا ہے دل پر۔ پہلے وہ ہُوا جو سارے شہر نے دیکھا، پھر ڈاکو آگئے۔ کاظمی صاحب کو لکھا ہے کہ اُن کے پاس کوئی علم یا طاقت ہے تو کچھ کریں۔ ملک صاحب نہیں مانتے۔ میں کہتی ہوں چلو کاظمی صاحب کے ہاں چلیں۔ بس کہہ دیتے ہیں کبھی چلیں گے"۔

"میرے ساتھ چلی چلو بھابی!"

"تم میرے بھائی ہو اُصلے!"۔۔۔ نسیمہ نے کہا ۔۔۔ "لیکن ملک صاحب سے بالا بالا جانا اچھا نہیں لگتا۔ تم انہیں یہ رقعہ پہنچا دو"۔۔۔ اُس نے اُصلے کو کچھ پیسے دے کر کہا ۔۔۔ "سالم تانگہ کر لینا۔ یہ لو آنے جانے کا کرایہ"۔

"دیکھو بھابی!"۔۔۔ اُصلے نے کہا ۔۔۔ "کوئی پریشانی ہے تو مجھے بتا دو۔ جو کچھ مجھ سے ہُوا میں کروں گا"۔

"نہیں"۔۔۔ نسیمہ نے جھوٹ بولا ۔۔۔ "ایسی کوئی پریشانی نہیں ہوتی تو تمہیں ہی بتاؤں گی۔ بہنیں اپنے دُکھ بھائیوں کو ہی بتایا کرتی ہیں"۔

"میں ابھی چلا جاتا ہوں"۔۔۔ اُصلے نے کہا اور چلا گیا۔

نسیمہ کو اطمینان سا ہونے لگا۔ یہ سہارا اُسے تسکین دے رہا تھا۔

⬥⬥⬥

اُصلا دو اڑھائی گھنٹوں بعد واپس آگیا۔

"بھابی!"۔۔۔ اُس نے کہا ۔۔۔ "آج چوتھا دن ہے کاظمی صاحب بخار میں جل رہے ہیں۔ بڑا ہی تیز بخار ہے۔ وہ تو ملنے کے قابل نہیں رہے"۔

"اُنہوں نے میرا رقعہ نہیں پڑھا؟"

"پڑھا ہے بھابی!"۔۔۔ اُصلے نے جواب دیا ۔۔۔ "پوری دلچسپی سے پڑھا ہے۔ اُنہوں نے کہا ہے کہ فکر نہ کرو۔ اللہ کو یاد کرو۔ میں جلدی کچھ کروں گا۔۔۔ اُنہوں نے رقعہ پھاڑ کر پُرزے پُرزے کر کے کہا تھا کہ نسیمہ کو تسلی دینا"۔

"وہ کب تک کچھ کرنے کے قابل ہوں گے؟"۔۔۔ نسیمہ نے کہا ۔۔۔ "تم نے اُن کی حالت دیکھ کر کچھ تو اندازہ لگایا ہوگا"۔

"تین چار دن تو وہ اُٹھ نہیں سکیں گے"۔۔۔ اصلے نے جواب دیا ۔۔۔ "میں پھر کسی دن انہیں دیکھنے جاؤں گا۔"

جب اصلا چلا گیا تو نسیمہ کی حالت بگڑنے لگی۔ یہ کام تو جلدی ہونا چاہیئے تھا۔ حسنین کاظمی ابھی کچھ کرنے کے قابل نہیں تھا۔ نسیمہ کو ڈر تھا کہ حسنین کاظمی کے ٹھیک ہونے تک منیر اپنا وار کر جائے گا۔ نسیمہ پر گزشتہ رات نیند نہ آنے کا اثر بھی تھا۔ اُس کے جذبات ویسے ہی اُبلے ہوتے تھے۔ گھر میں ہر طرف اُسے منیر ہی منیر نظر آنے لگا۔

عمر حیات شام کو ذرا جلدی آ گیا۔ اُس کے ساتھ منیر تھا۔ عمر حیات نے اُسے پکا دوست بنا لیا تھا۔ نسیمہ اُسے دیکھ کر جل بھُن گئی۔ منیر اُسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ یہ شیطانی اور فاتحانہ مسکراہٹ تھی۔

"چوہدری منیر آج ہمارے ساتھ کھانا کھائے گا"۔۔۔ عمر حیات نے کہا ۔۔۔ "میں نہا لوں۔ آج تو گرمی بہت ہی زیادہ ہے۔ ساون کا حبس اتنا ہے کہ دم گھٹ رہا ہے۔"

وہ غسل خانے میں چلا گیا اور نسیمہ باورچی خانے میں چلی گئی۔

"نسیمہ!"۔۔۔ منیر نے نسیمہ کو آہستہ سے بلایا ۔۔۔ "یہاں آؤ ذرا۔"

"کیا ہے؟"۔۔۔ نسیمہ نے اُس کے پاس آکر ترش سے لہجے میں کہا۔

"یہ دیکھ لو"۔۔۔ منیر نے جیب سے فوٹو نکال کر نسیمہ کو دکھایا اور فوٹو جیب میں رکھ کر کہنے لگا ۔۔۔ "میرا پیغام تمہیں مل گیا ہے۔ میں نے تمہیں مہلت دے دی ہے۔ اپنے آپ کو مصیبت میں نہ ڈالو نسیمہ! معلوم نہیں تم ضد میں کیوں آگئی ہو؟"

نسیمہ کہنے لگی تھی کہ مجھے تمہاری صورت سے نفرت ہے، لیکن ایسی بات کہنے کا یہ موقع نہیں تھا۔ اُس نے غصّے اور حقارت کو دبا لیا۔ وہ اُس سے فوٹو لینا چاہتی تھی۔

"کسی روز آ جاؤں گی"۔۔۔ نسیمہ نے مسکرا کر کہا ۔۔۔ "اس فوٹو کی میرے پاس کوئی کاپی نہیں۔ یہ مجھے دے دو۔"

"دے دوں گا"۔۔۔ منیر نے کہا ۔۔۔ "باغ میں آ جانا۔۔۔۔ کب آؤ گی؟"

"پہلے فوٹو دو پھر بتاؤں گی"۔۔۔ نسیمہ نے کہا۔

"کیا مجھے اتنا کچا سمجھتی ہو؟"۔۔۔ منیر نے کہا ۔۔۔ "اب مجھ پر ہاتھ اُٹھا کر دیکھو۔ ابھی تمہیں اس گھر سے نکلوا دوں۔"

"تم جیسے کمینوں سے اور امید ہی کیا ہو سکتی ہے"۔۔۔ نسیمہ نے کہا۔

منیر ہنس پڑا۔ نسیمہ کو منیر کے اتنے اچھے اور چمکتے ہوتے دانت یوں لگے جیسے یہ بھیڑیئے کے دانت ہوں۔ حقارت اور غصّے کا طوفان اُٹھنے لگا لیکن نسیمہ نے اُسے سینے میں ہی روک لیا۔ اُس نے اس احساس کو زندہ رکھا کہ اس وقت غصّہ نقصان دے گا۔ اگر منیر اکیلا ہوتا تو نسیمہ کا ردِ عمل اور اُس کا جوابی وار بڑا ہی شدید ہوتا۔

"تم ابھی تک سمجھیں نہیں کہ مجھے کورا جواب دینے کا نتیجہ کیا ہوگا"۔۔۔ منیر نے مسکراتے ہوتے کہا ۔۔۔ "میں چاہوں تو گواہی دینے سے انکار کر دوں میں کہوں گا کہ میں نے ان کے گھر سے کسی ڈاکو کو نہیں پکڑا۔ پھر جانتی ہو کیا ہوگا؟ ۔۔۔۔ ملزم بری ہو جائیں گے اور وہ تمہارے گھر میں پھر واردات کریں گے اور وہ تمہیں بھی اُٹھا لے جائیں گے۔"

نسیمہ کا چہرہ سُرخ ہو گیا تھا۔ وہ قہر اور غضب کو اپنے وجود میں روکے رکھنے کی سر توڑ کوشش کر رہی تھی۔ وہ کچھ کہنے لگی تو اُس کی زبان بولنے کی بجائے کانپنے لگی۔ وہ کچھ بھی نہ کہہ سکی۔

"میں جانتی ہوں تم میرے گھر میں ڈاکوؤں کو پکڑنے نہیں آتے تھے" ۔۔۔ نسیمہ نے کہا ۔۔۔ "تم میں نہ اتنی عقل ہے نہ اتنی جرأت ہے۔ تم بزدل اور کمینے ہو۔ جس نے کالے جادو کا سہارا لیا تھا وہ دلیر ہو ہی نہیں سکتا۔ ایک عورت کو اوچھے ہتھکنڈوں سے پریشان کرنے والا آدمی مرد ہو ہی نہیں سکتا۔"

منیر کے ہاتھ میں نسیمہ کی رگ آ گئی ہوتی تھی اس لئے اُس کا ردِ عمل بالکل سرد تھا۔ اُس نے نسیمہ کی اتنی تلخ طنز ہنسی میں ٹال دی۔

"تم نے تین چار دنوں کی مہلت مانگی تھی، وہ میں نے دے دی ہے۔"
منیر نے شگفتہ سے لہجے میں کہا ـــ "دو دن اور باقی ہیں۔ پھر خود ہی آجانا۔ میری محبت کو یوں بے دردی سے لات نہ مارو تسنیمہ! تم اپنی ضد کی پکی ہو، میں اپنی ہٹ کا پکا ہوں.... تم آؤ تو سہی، میری محبت کی دیوانگی دیکھنا۔"

غسل خانے کا دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔

"آؤں گی" ـــ تسنیمہ نے کہا ـــ "یہ دو دن گزر جانے دو۔"

"یہ بھی یاد رکھنا، پانچ روز بعد عدالت میں پیشی ہے" ـــ منیر نے کہا ـــ "اس پیشی پر میری گواہی ہو گی۔"

"لاؤ بھئی!" ـــ عمر حیات نے آکر کہا ـــ "کھانا رکھو۔ آج تو بہت ہی بھوک لگی ہے۔"

تسنیمہ باورچی خانے میں چلی گئی۔

تسنیمہ کی وہ رات ایسی گزری جیسے اُسے کسی نے کانٹوں پر پھینک دیا ہو۔ کانٹے اس کے دل تک اترتے رہے۔ عمر حیات اور اُس کا بچہ بے فکری کی نیند سو رہے تھے اور تسنیمہ نے تڑپتے کانپتے رات گزار دی۔ پچھلی رات بھی جاگتے گزری تھی۔ دن بھی اسی کیفیت میں گزر رہا تھا۔

صبح ہوئی۔ تسنیمہ کی ذہنی کیفیت دگرگوں ہو گئی تھی۔ کبھی اس کی آنکھوں کے آگے اندھیرا سا آجاتا کبھی ایسی چمک کہ اُس کی آنکھیں چندھیا جائیں۔ یہ اندھیرا اور یہ چمک اس کے اپنے ذہن کی تھی۔ وہ اب عقل کی بجائے ذہن کے قبضے میں تھی اور ذہن آسیب زدہ مکان کی مانند ہو گیا تھا۔ اس میں بد رُوحیں اور آسیبی سائے گھومتے پھرتے نظر آتے تھے۔

حالات اُس کے قابو میں آنے والے نہیں تھے۔ شب بیداری نے اُس کی عقل کو ماؤف کر دیا تھا۔ وہ اب سہارے اور فرار کے راستے دیکھ رہی تھی۔

عمر حیات اور شوکت چلے گئے۔ ماسی نے آکر اپنا کام شروع کر دیا۔ تسنیمہ سونے کے کمرے میں چلی گئی اور پلنگ پر جا گری۔ اُسے حسنین کی غلطی پر غصہ آیا جو غلط موقعہ پر بیمار ہو گیا تھا۔ سوچتے سوچتے وہ اُٹھ بیٹھی اور خلاء میں یوں گھورنے لگی

جیسے اُسے کچھ نظر آیا ہو یا کچھ یاد آگیا ہو۔

"خانقاہ بیبیاں والی" ـــ اُسے ایک خانقاہ یاد آگئی۔ اُس کے ہونٹوں سے سرگوشی پھسل گئی ـــ "خانقاہ بیبیاں والی۔"

یہ خانقاہ جو قصبے سے کوئی دو میل دُور تھی، عورتوں میں اتنی مقبول تھی کہ عورتیں اُسے آخری سہارا سمجھا کرتی تھیں۔ وہاں کوئی مرد مجاور نہیں تھا۔ ایک ضعیف العمر بڑھیا دن رات خانقاہ میں موجود رہتی تھی۔ کوئی اس کی عمر ایک سو سال بتاتا تھا کوئی دو سو سال اور ایک روایت یہ بھی تھی کہ یہ عورت صدیوں سے زندہ ہے اور تا قیامت زندہ رہے گی۔ اُس کے بال دُودھ کی طرح سفید تھے۔ مُنہ میں ایک بھی دانت نہیں تھا۔ چہرے پر گہری جھریوں کا جال تھا۔ اُس کی کمر جھک گئی تھی۔

وہ خانقاہ میں جھاڑو دیتی رہتی تھی۔ یہ ایک قبر تھی جس کے اِرد گرد مٹی کی چار دیواری اور اوپر درخت کے ٹہنوں، مٹی اور سرکنڈوں کی چھت تھی۔ دروازہ بغیر کواڑوں کے تھا۔ اس خانقاہ پر صرف عورتیں مرادیں لے کر جاتی تھیں۔ وہ خانقاہ کی دیواروں پر اندر اور باہر لیپ کر دیا کرتی تھیں۔ بڑھیا وہاں اپنا کھانا خود پکاتی تھی۔ عورتیں اُس کے پاس دالوں، سبزیوں، مرچ مسالے، گھی وغیرہ کا انبار لگائے رکھتی تھیں۔

قبر پر رنگارنگ دوپٹے پڑے رہتے تھے۔ یہ بے اولاد عورتوں کے دوپٹے تھے۔ خانقاہ کے باہر ایک درخت تھا جس کے پتے کبھی ہرے نہیں ہوتے تھے۔ اُس کی خشک ٹہنیاں تھیں اور ٹہنیوں کے ساتھ کانٹے تھے۔ ہر ٹہنی کے ساتھ دوپٹے بندھے ہوتے تھے۔ ان میں نئے بھی تھے اور پُرانے بھی جو پھٹتے جا رہے تھے۔ ان میں بہت پُرانے دوپٹوں کے چیتھڑے بھی تھے۔ مشہور تھا کہ جو عورت اپنا دوپٹہ اس درخت پہ ڈال دے اُس کی مراد پوری ہو جاتی تھی۔ اولاد کی طلب گار عورتوں کے لئے حکم تھا کہ قبر پر دوپٹہ ڈالیں۔

اس خانقاہ کے وجود میں آنے کی روایت یہ بیان کی جاتی تھی کہ یہ

بُڑھیا جب جوان تھی تو اسے ایک جواں سال آدمی سے محبت ہو گئی۔ ایسی ہی محبت اُس آدمی کے دل میں بھی پیدا ہو گئی۔ ان کی محبت آسمان پر چمکتے ستاروں کی طرح پاک اور شفاف تھی۔ وہ لوگوں کی نظریں بچا کر ملتے تھے یا دُور دُور سے ایک دوسرے کو دیکھتے رہتے تھے۔ ان کے متعلق کسی کو شک نہیں تھا کہ بدی کا ارتکاب کرتے ہیں لیکن کون برداشت کرتا ہے کہ اُس کی بیٹی یا بہن غیر مرد کے ساتھ نزدیک یا دُور کا تعلق رکھے۔

لڑکی کے بھائیوں نے بہن کو منع کیا۔ لڑکی نے کہا کہ اُس نے اس آدمی کے ساتھ مسجد کے سامنے میں کھڑے ہو کر قرآن پر ہاتھ رکھ کے قسم کھائی ہے کہ محبت کو قرآن کا حرف سمجھ کر پاک رکھیں گے اور ہم شادی کریں گے۔ بھائیوں نے اُسے مارا پیٹا۔ پھر بھی وہ باز نہ آئی۔ آخر ایک روز وہ غائب ہو گئی۔ کسی نے اُسے اس آدمی کے ساتھ جسے وہ چاہتی تھی، جاتے دیکھ لیا اور اس کے بھائیوں کو جا بتایا۔

بھائی گھوڑوں پر سوار ہو کر پیچھے گئے اور دونوں کو راستے میں جا لیا۔ وہ ایک ویرانے میں جا رہے تھے۔ لڑکی کے بھائیوں نے اس جواں سال آدمی کو قتل کر دیا اور بہن کو گھر لے گئے۔ دونوں بھائی پکڑے گئے۔ ثبوت مل گیا۔ شہادت مل گئی۔ دونوں بھائیوں کا پھانسی چڑھ جانا یقینی تھا۔ بہن کو اپنے بھائیوں سے پیار تھا۔ اُس نے کہا کہ جس قرآن پر اُس نے محبت کو پاک رکھنے اور اس آدمی کے ساتھ شادی کرنے کی قسم کھائی تھی، وہی قرآن میرے بھائیوں کو زندہ رکھے گا۔ گناہ میرا تھا، سزا بھائیوں کو کیوں ملے!

کہتے تھے کہ اس لڑکی نے راتیں جاگ جاگ کر اور رو رو کر خدا سے بھائیوں کی زندگی مانگی۔ خدا نے دعا سن لی اور دونوں بھائی بری ہو کر گھر آ گئے۔ بہن نے بھائیوں سے کہا کہ میری آہیں اور فریادیں تمہیں پھانسی کے تختے سے اُتار لائی ہیں، اب میری آہوں سے بچو، میرا دل نہ دکھانا، زندہ جل جاؤ گے۔ اُس نے کہا کہ میں شادی نہیں کروں گی۔ میں نے قرآن پاک کی قسم کھائی ہے، مجھے میری حال پہ چھوڑ دو۔

بھائیوں نے اُسے اُس کے حال پہ چھوڑ دیا۔ وہ اُس جگہ گئی جہاں اُس کا محبوب قتل ہوا تھا۔ وہاں اُس نے مٹی کی ڈھیری قبر کی شکل کی بنائی اور اس قبر کی مجاور بن گئی۔ اس آدمی کو گاؤں کے قبرستان میں دفن کیا گیا تھا لیکن لڑکی وہاں کبھی نہیں گئی تھی۔ اُس نے گاؤں سے دُور، نسیمہ کے قصبے سے تقریباً دو میل دُور جو قبر بنائی تھی، اس پر وہ ایک نالے سے پانی لا لا کر چھڑکتی رہتی تھی۔ قبر آہستہ آہستہ خانقاہ بن گئی۔ لڑکی وہیں بوڑھی ہو گئی۔

وہاں جو درخت تھا جس پہ حاجت مند عورتیں دوپٹے ڈالا کرتی تھیں، وہ خشک تھا۔ اس کے متعلق مشہور تھا کہ یہ درخت کبھی ہرا ہوا کرتا تھا۔ اس آدمی کے قتل ہوتے ہی درخت سوکھ گیا اور اُس زمانے سے سوکھا ہوا ہے۔ چونکہ اس خانقاہ پہ صرف عورتیں جاتی تھیں اس لئے اُسے خانقاہ بیبیاں والی کہتے تھے۔

نسیمہ کو یہ خانقاہ یاد آئی۔ عمر حیات کے ساتھ شادی سے پہلے ماں اُسے اس خانقاہ پہ یہ مراد لے کر گئی تھی کہ نسیمہ کی شادی عمر حیات کے ساتھ ہو جائے۔ ماں نے اپنا اور نسیمہ نے اپنا دوپٹہ درخت پر ڈالا تھا۔ تھوڑے ہی دنوں بعد ماں بیٹی کی مراد پوری ہو گئی تھی۔

نسیمہ نے اس خانقاہ پہ جانے کا ارادہ کر لیا۔

شوکت سکول سے آیا۔ نسیمہ نے اُسے کھانا کھلایا اور سُلا دیا۔ شوکت دوپہر کے وقت کم از کم تین گھنٹے سویا کرتا تھا۔ نسیمہ نوکرانی کو گھر سے بلا لائی اور اُسے کہا کہ وہ خانقاہ پہ جا رہی ہے اور نوکرانی اس کے گھر میں رہے۔

"اتنی گرمی میں بی بی؟" — نوکرانی نے کہا — "صبح سویرے جانا یا میرے ساتھ شام کو چلی چلنا۔"

"میرے لئے یہی وقت بہتر رہتا ہے" — نسیمہ نے کہا — "پھیرا مانا ہُوا تھا۔ یہ پورا کر آؤں۔"

"دھیان سے جانا بی بی!" — نوکرانی نے کہا — "وہ بنجر ویرانہ ہے۔ کھڈ نالے ہیں۔ ساون کا مہینہ ہے۔ بارش کا بھی کچھ پتہ نہیں ہوتا کس وقت

آجاتے ہیں۔"

نسیمہ کو معلوم تھا کہ خانقاہ کیسے ڈراؤنے علاقے میں ہے۔ وہاں صرف کھڈ ہی نہیں تھے، چٹانیں بھی تھیں۔ ایک جگہ اونچی تھی۔ وہاں سے بارشوں کا پانی آبشار کی طرح نیچے گرتا تھا۔ نیچے دو چٹانیں پہلو بہ پہلو آگے کو چلی گئی تھیں۔ نشیب و فراز تھے، ٹیلے اور گھاٹیاں تھیں۔ وہاں سے کوئی راستہ نہیں گزرتا تھا۔ صرف وہ عورتیں اُدھر جاتی تھیں جنہیں خانقاہ تک جانا ہوتا تھا۔

نسیمہ اتنی دُور کبھی اکیلی نہیں گئی تھی لیکن وہ اتنی مجبور اور بے بس ہو گئی تھی کہ اُس نے یہ خطرہ مول لے لیا۔ اُس نے ٹرنک سے اپنا ایک نیا دوپٹہ نکالا۔ اوپر چادر لی اور گھر سے نکل گئی۔ ساون کا جوبن تھا۔ آسمان پر گھرے بادلوں کے ٹکڑے منڈلا رہے تھے۔ نسیمہ قصبے سے نکل گئی۔ وہ اتنے بڑے خطرے میں آئی ہوتی تھی کہ اُس نے اس ویرانے کا کوئی اور خطرہ محسوس ہی نہ کیا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ منیر نے اُسے دیکھ لیا تو وہ اس کے پیچھے آجائے گا۔

وہ چلتی گئی۔ کھڈوں میں سے گزرتی اور گھاٹیاں اُترتی چڑھتی گئی۔

اُس نے اُوپر سے پانی گرتا دیکھا۔ پانی کی دھار سی تھی جو بالائی زمین سے گر رہی تھی۔ نسیمہ اس کے قریب سے گزری۔ خانقاہ تھوڑی ہی دُور رہ گئی تھی۔ دُور اُفق سے گھٹا اُٹھ رہی تھی۔ نسیمہ نے قدم اور تیز کر لئے۔

وہ خانقاہ تک جا پہنچی۔ گرمیوں کی دوپہر وہاں کون جاتا تھا، عورتیں صبح سویرے یا شام کو جایا کرتی تھیں۔ نسیمہ نے پہلے دوپٹہ درخت کی ایک شاخ پر ڈالا اور وہ درخت پر پڑے ہوئے دوپٹوں کو دیکھنے لگی۔ ان نئے اور پرانے دوپٹوں اور بہت پرانے دوپٹوں کے چیتھڑوں میں اپنا وہ دوپٹہ ڈھونڈ رہی تھی جو اُس نے شادی سے پہلے اپنی ماں کے ساتھ آکر ڈالا تھا۔ وہ کوئی بہت پرانی بات نہیں تھی۔ جیسے کل پرسوں کا واقعہ ہو۔ شادی کو عرصہ ہی کتنا گزرا تھا۔ یہی چند مہینے گزرے تھے۔

اُسے اپنا وہ دوپٹہ کہاں نظر آتا۔ دھوپ اور بارشوں نے اُس کا رنگ اُڑا دیا اور تیز ہواؤں سے ہلتی خاردار شاخوں نے اُسے چیتھڑے بنا دیا

تھا۔ نسیمہ پر وہم سا طاری ہو گیا کہ اُس کے دوپٹے کے غائب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا سہاگ پھل پھول نہیں سکے گا۔

وہ تیزی سے خانقاہ کے اندر چلی گئی اور مٹی کی کچی ڈھیری پر گر کر بلکنے لگی جیسے یہی اس کے دکھ درد اور مصائب کو ختم کر دے گی وہ دل ہی دل میں مٹی کی اس ڈھیری کو اپنی مراد سناتی رہی۔ روتے روتے اُس کی ہچکی بندھ گئی۔

اُس نے اپنے کندھے پر لرزتا ہُوا ایک ہاتھ محسوس کیا۔ اُس نے چونک کر دیکھا۔ ضعیف العمر بڑھیا اُس پر جُھکی ہوئی تھی۔ اُس کا برف جیسا سفید سر ہل رہا تھا۔ نسیمہ کے کندھے پر اُس نے جو ہاتھ رکھا وہ بڑھاپے کے رعشہ سے کانپ رہا تھا۔

"کیا دکھ ہے تجھے کہ تُو رو رو کر ہلکان ہو رہی ہے؟"— بڑھیا نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا — "کیا دل میں کسی کا پیار بسا رکھا ہے؟.... کیا تیرا خاوند کسی اور کے جال میں آگیا ہے؟.... اپنے بھائیوں کو پھانسی کے تختے سے اُتارنا ہے؟.... کیا دُکھ لے کے آئی ہے یہاں؟ کیا روگ لگ گیا ہے تجھے اسی عمر میں؟"

"ایسا روگ لگ گیا ہے جس کا کوئی علاج نہیں"— نسیمہ نے کہا — "انسانوں سے بھاگ کر مٹی کی ڈھیریوں کے آگے روتی پھرتی ہوں"

"بول.... بول!"— بڑھیا نے کہا — "مُنہ سے بول.... مٹی کی ڈھیری کے آگے روتی ہے تو کیا بُرا کرتی ہے۔ انسان بھی آخر مٹی کی ڈھیری ہے۔ آج جو سر پر تاج سجاتے سونے چاندی کے تخت پر بیٹھا ہے اور جو میری طرح ننگی زمین کے تختے پر بھوکا ننگا بیٹھا ہے، ان دونوں کی منزل ایک ہے.... مٹی کی ڈھیری.... جو مانگنا ہے وہ اس مٹی سے مانگ جس سے تیرا وجود بنا ہے"

نسیمہ کی ہچکیاں تھم گئیں اور اُس کی نظریں بڑھیا کی جُھریوں کے جال میں اُلجھ گئیں۔

"کیا مانگنے آئی ہو جو تمہیں اور کوئی نہیں دے سکا؟"۔۔۔بڑھیا نے پوچھا۔

"سہاگ کی سلامتی اور سکون!"۔۔۔نسیمہ نے سسکی لے کر جواب دیا ۔۔۔"دشمن میرا سہاگ اُجاڑنا چاہتے ہیں۔ میری عصمت کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں۔ میرے اور میرے خاوند کے درمیان آگ کی دیوار کھڑی کر رہے ہیں۔"

"شادی کو بہت عرصہ ہوگیا ہے؟"

"نہیں"۔۔۔نسیمہ نے جواب دیا۔۔۔"ابھی تو میں نے اپنے خاوند کا ایک بچہ بھی نہیں جنا۔ یہ دیکھ میرے ہاتھ اماں! تجھے دکھائی نہیں دے گا۔ میرے ہاتھوں سے ابھی مہندی بھی پوری طرح نہیں اُتری۔"

"میں تجھ سے اور کچھ نہیں پوچھوں گی"۔۔۔اس بڑھیا نے کہا جس کی آنکھیں بے نور ہوچکی تھیں۔۔۔"کچھ کہوں گی ۔۔۔۔ اُس خاوند سے بے وفائی نہ کرنا جس کا تُو بچہ جنے گی۔ جان دے دینا جان لے لینا، اُس سے بے وفائی نہ کرنا جو بڑے پیار سے تجھے اپنے سینے سے لگاتا ہے اور تجھے کہتا ہے کہ تُو نہیں تو کچھ بھی نہیں۔"

"ہاں!"۔۔۔نسیمہ نے کہا۔۔۔"وہ مجھے یوں ہی کہا کرتا ہے۔ میرے ہونے والے بچوں کا باپ مجھ سے بہت پیار کرتا ہے۔"

"اور تُو اُس کے پیار پر قربان ہوجا!"۔۔۔بڑھیا نے کہا۔۔۔"ماں اُلٹی سیدھی بات کہے تو مت سُن۔ باپ ایسی ویسی کہے تو اُسے عزت سے کہہ کہ تُو میرا باپ ہے پر میرے سہاگ کے پودے سے پاؤں اُٹھالے، اسے ہرا ہونے دے ۔۔۔۔ پر ایک بات بتا۔ کبھی اللہ کو یاد کیا ہے؟ ۔۔۔۔ نہیں ۔۔۔۔ تیری چپ بتا رہی ہے کہ تُو نے اپنے اللہ کو کبھی یاد نہیں کیا۔ حُسن، جوانی اور دولت آتی ہے تو دل سے اللہ کا نام نکل جاتا ہے۔ اللہ اُس وقت یاد آتا ہے جب حُسن اور جوانی پر بڑھاپے کی پہلی لکیر پھرتی ہے اور جب دولت ہاتھ سے نکل جاتی ہے ۔۔۔۔ کر، اللہ کو بھی یاد کر۔ اس ڈھیری میں کیا رکھا ہے! یہ تو تجھے صرف یہ یاد دلاتی ہے کہ ایک روز تجھے بھی اسی طرح کی ڈھیری بن جانا ہے۔"

بڑھیا کے بے دانت مُنہ سے ہنسی نکل گئی۔ وہ اُٹھ کھڑی ہوئی۔ اُس کی ہنسی خراٹہ نما قہقہہ بن گئی اور وہ باہر نکل گئی۔ اُس کی ہنسی سنائی دیتی رہی۔ نسیمہ ڈر سی گئی۔ اپنے آپ ہی اُس کے ہاتھ دُعا کے لئے اُٹھے۔

خانقاہ کے اندر اندھیرا ہوگیا۔ نسیمہ نے باہر دیکھا اور وہ سمجھ گئی۔ سورج اُس گھٹا کے پیچھے ہوگیا تھا جو خانقاہ کی طرف آتے آتے اُسے اُفق سے اُٹھتی نظر آئی تھی۔ اُسے گھٹا کی گرج بھی سنائی دی۔ وہ اُٹھی اور خانقاہ کے دروازے پر پہنچی تو ایک ہی بار موسلا دھار بارش شروع ہوگئی۔ بڑھیا تیز تیز چلتی آئی۔

"اندر ہی رہ!"۔۔۔اُس نے نسیمہ سے کہا۔۔۔"مینہ تھم جانے دے۔"

نسیمہ کو شوکت کا خیال آگیا۔ بچّہ ڈر رہا ہوگا۔ نسیمہ کو ویسے بھی گھر پہنچنا تھا۔ بارش تھمنے کے انتظار میں شام بھی ہوسکتی تھی۔ بڑھیا اُسے خانقاہ کے اندر بلا رہی تھی لیکن وہ چل پڑی۔

❖

ساون کی بارش اتنی تیز تھی کہ دس قدم آگے کچھ نظر نہیں آتا تھا۔ قطرے اتنے موٹے کہ کنکریوں کی طرح پڑتے تھے۔ ہوا تیز نہیں تھی۔ گھٹا کی گرج غصیلی تھی جیسے اعلان کر رہی ہو کہ سب کچھ بہا لے جانے کے لئے آئی ہوں۔ نسیمہ کو حیرت اس پر ہو رہی تھی کہ وہ ڈر نہیں رہی تھی۔ اُسے شوکت کا خیال آرہا تھا۔ اتنی تیز بارش اور اس گرج سے وہ ڈر رہا ہوگا۔

وہ اندازے سے چلی جا رہی تھی۔ وہاں کوئی راستہ، کوئی پگڈنڈی اور کوئی سڑک نہیں تھی جس پر وہ بے فکر ہو کر چلتی جاتی۔ وہاں کھڈ تھے۔ زمین کی اُونچ نیچ تھی۔ پاؤں بار بار پھسلتا تھا۔ گھاٹی اُترنا محال، چڑھنا محال۔ قدم قدم پر گرنے کا خطرہ۔ وہ سنبھل سنبھل کر قدم رکھتی چلتی گئی۔

اُسے بے پناہ شور سنائی دینے لگا۔ بارش کے شور کے ساتھ یہ شور مل کر دل کو دہلا رہا تھا۔ اب نسیمہ کو ڈر سا محسوس ہونے لگا۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُسے شک ہونے لگا جیسے بہت سی ریل گاڑیاں اُس کی طرف بڑی تیز رفتار سے آرہی ہوں یا اس کے قریب سے

گزر رہی ہوں۔

اُس کی نظر جب دائیں طرف گئی تو اُدھر زمین نہیں تھی۔ اُسے ایسے لگا جیسے کسی اُونچے مکان کی منڈیر پہ جارہی ہو۔ اُس کے پاؤں کے نیچے کیچڑ نہیں بڑی پکی زمین تھی۔ یہ پتھریلی یا چٹانی زمین تھی۔ اُس نے آنکھیں سکیڑ کر نیچے دیکھا۔ نیچے سیلاب آگیا تھا۔ یہ وہ جگہ تھی جہاں دو چٹانوں کے درمیان سے پانی گزرتا تھا۔ یہ پانی بلندی سے آبشار کی طرح گرتا تھا۔ نسیمہ کو خیال آگیا کہ اُوپر کا سیلاب نیچے گر رہا ہے اور نیچے جگہ تنگ اور سیلاب زیادہ ہے۔ یہ سیلاب اتنے جوش میں تھا جیسے دائیں بائیں کی چٹانوں کو اپنے ساتھ بہالے جائے گا۔

نسیمہ کو یہ اطمینان ہوگیا کہ وہ بھٹک نہیں گئی۔ اُسے یاد تھا کہ آگے وہ جگہ آئے گی جہاں سے آبشار گرتی ہے اور اس سے آگے ایک میل فاصلہ سیدھا اور ہموار ہے۔ وہ اور زیادہ سنبھل کر چلنے لگی۔ وہاں پاؤں پھسلنا بہت ہی خطرناک تھا۔ وہ سیدھی نیچے سیلاب میں جاتی اور سیلاب اُسے چٹانوں کے ساتھ پٹخ پٹخ کر مار ڈالتا۔

شور بڑھتا جارہا تھا جیسے ریل گاڑیوں کی رفتار زیادہ ہوگئی ہو۔ آبشار قریب آرہی تھی۔

❖

نسیمہ آبشار کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ آتے وقت جہاں سے اُس نے پانی کی ایک دھار سی گرتی دیکھی تھی وہاں سے اب ایک دریا گر رہا تھا۔ اوپر کے علاقے کی ڈھلان اِدھر کو ہی تھی اور اُوپر ایک نالہ سا بنا ہُوا تھا۔ اتنی تیز بارش کا سیلاب اس نالے میں آرہا تھا اور نالہ آبشار کی طرح گر رہا تھا۔ نسیمہ نے کچھ اور آگے ہو کر دیکھا۔ وہ جب اِدھر آئی تھی تو یہ ساری جگہ خشک تھی۔ اب وہاں سیلابی دریا بہتا آرہا تھا۔ وہ آبشار کو دیکھنے کے لئے رُک گئی۔

وہ جب وہاں سے چلنے لگی تو اُسے بائیں طرف سے ایک گھوڑسوار

آتا نظر آیا۔ وہ قصبے کی طرف مُڑ گیا تھا لیکن اُس نے نسیمہ کو دیکھا تو وہ اِدھر آگیا۔ نسیمہ نے چادر اپنے ماتھے سے اور آگے سرکا لی اور آگے کو چل پڑی۔

گھوڑا اُس کے بالکل قریب آگیا۔ نسیمہ نے سر اور نیچے کر لیا۔

"کون ہو؟" — گھوڑسوار نے پوچھا — "کہاں جارہی ہو؟"

نسیمہ نہ بولی نہ رُکی۔ خوف کی لہر اُس کے وجود میں بھر گئی۔

"شہر کو جارہی ہو تو میں تمہیں گھوڑے پہ اپنے پیچھے بٹھا کر پہنچا دوں گا" — گھوڑسوار نے کہا۔

نسیمہ کے جی میں آئی کہ دوڑ پڑے لیکن وہاں ذرا تیز چلنا بھی محال تھا۔

گھوڑا اُس کے آگے اس طرح رُکا کہ گھوڑے کا پہلو اُس کے آگے آگیا۔ نسیمہ نے اُوپر دیکھا اور اُس کا خون خشک ہوگیا۔

"اوہ...!" — گھوڑسوار بولا — "نسیمہ؟ تم کہاں سے آرہی ہو؟.... ہاں ہاں، بیبیاں والی خانقاہ پہ گئی ہو گی"

"مجھے پریشان نہ کرو منیرا" — نسیمہ نے بے بسی کے عالم میں کہا — "مجھے جانے دو"

"اِدھر آؤ" — اُس نے گھوڑے سے جُھک کر اور بازو نسیمہ کی طرف لمبا کر کے کہا — "آؤ میرے پیچھے بیٹھ جاؤ۔ گھر پہنچا دوں گا"

"تمہارے پیچھے بیٹھ جاؤں اور سارے شہر میں بدنام ہو جاؤں؟" — نسیمہ نے کہا — "میں اپنے قدموں سے پہنچ جاؤں گی"

"شہر سے کچھ دُور اُتر جانا" — منیر نے کہا — "میں دوسری طرف سے چلا جاؤں گا، تم کسی اور طرف سے گھر چلی جانا .... آؤ"

"نہیں منیر نہیں" — نسیمہ نے بڑی زور سے کہا۔

بارش کا زور ابھی تھما نہیں تھا۔ آبشار کا شور پہلے سے زیادہ بلند ہو گیا۔ گھٹائیں گرج رہی تھیں۔

منیر گھوڑے سے اتر آیا۔

"نسیمہ!" اُس نے دونوں ہاتھ نسیمہ کے کندھوں پر رکھ کر کہا۔ "کیا تم میرا مقابلہ کر سکتی ہو؟ .... میں تمہیں زبردستی اُٹھا کر گھوڑے پر بٹھا سکتا ہوں۔ میں کہہ رہا ہوں کہ مجھے اچھا نہیں لگتا کہ میں گھوڑے پر جاؤں اور تم پیدل جاؤ۔"

"میرے جسم کو ہاتھ نہ لگاؤ" نسیمہ نے پیچھے ہٹتے ہوئے کہا۔

نسیمہ کو اچانک خیال آگیا کہ غصّے کی بجائے اس کے ساتھ پیار کی بات کرے اور اسے بیوقوف بنا کر اس سے فوٹو لینے کی کوشش کرے۔

"کیا تمہیں مجھ سے اتنی نفرت ہے نسیمہ؟" منیر نے کہا۔ "میں اس بارش میں تمہیں پیدل چلتے نہیں دیکھ سکتا اور تم ...."

"نفرت کیسی؟" نسیمہ نے سنبھلے ہوئے لہجے میں کہا۔ "جس کے ساتھ کبھی محبت کی تھی اُس سے نفرت تو نہیں ہو سکتی۔ میں نے تمہیں دل سے کبھی بھی اُتارنے کی کوشش نہیں کی لیکن تمہارا دماغ اُلٹ گیا ہے۔"

"نہیں تو" منیر نے کہا۔ "تم خود ہی دُور ہٹ گئی ہو۔"

"کیوں نہ دُور ہٹوں؟" نسیمہ نے روٹھنے کے انداز سے کہا۔ "محبت کی یادگار ایک وہ فوٹو تھا۔ ایک تو اُس پر تم نے مجھے دھمکی دی، پھر میں نے وہ فوٹو مانگا اور تم نے مجھ پر شک کیا کہ میں تمہیں بیوقوف بنا رہی ہوں۔ مجھے معلوم ہے وہ فوٹو اب بھی تمہارے پاس ہے۔"

"ہاں کیوں نہیں" اُس نے کُرتے کی پہلو والی جیب میں ہاتھ ڈالا۔ "اس فوٹو کو تو میں سینے سے لگا کر رکھتا ہوں۔"

وہ چونک پڑا۔ اُس کی مسکراہٹ غائب ہو گئی۔ اپنے آپ سے باتیں کرنے کے لہجے میں بولا۔ "جیب میں نہیں .... اوہ .... کہاں گیا فوٹو"

نسیمہ کی طرف دیکھ کر سنبھل گیا اور بولا۔ "آج گھر بھول آیا ہوں۔"

اُس نے مسکرانے کی کوشش کی لیکن اُس کے چہرے پر گھبراہٹ کا تاثر قائم رہا۔ اتنی تیز بارش بھی اس تاثر کو نہ دھو سکی۔

"تم جھوٹ بولتے ہو" نسیمہ نے کہا۔ "فوٹو دینا نہیں چاہتے۔"

"فوٹو دے دوں تو میرے پاس رہ ہی کیا جاتا ہے؟" منیر نے کہا۔ "پہلے باغ والے کمرے میں آؤ پھر فوٹو لے لینا۔"

"پہلے فوٹو دو۔"

"دیکھو نسیمہ!" منیر نے اُس کے قریب آکر اُس کا بازو پکڑا اور بولا۔ "میں تمہیں یہیں گرا لوں تو تم میرا کیا بگاڑ لو گی؟"

"میرے قریب آکر تو دیکھو" نسیمہ نے کہا۔

منیر بازو پھیلا کر اُس کی طرف بڑھا۔ تب نسیمہ کو اُس کا چہرہ ایسے لگا جیسے یہ بھیڑیئے کا چہرہ ہو۔ وہ پیچھے ہٹ گئی۔ بارش بہت تیز تھی۔ گھٹائیں پہلے کی طرح گرج رہی تھیں۔ تھوڑی دُور سے بھی کوئی انہیں نہیں دیکھ سکتا تھا۔

نسیمہ پیچھے ہٹی تو منیر اُسے بیہودہ سی ایک بات کہہ کر اُس پر لپکا۔

نسیمہ نے پیچھے دیکھا۔ وہ چٹان جیسی اُس پکی جگہ پر پہنچ گئی تھی جہاں سے ڈھلان شروع ہوتی تھی۔ یہ پتھریلی ڈھلان وہاں نیچے جا کر ختم ہوتی تھی جہاں آبشار گر رہی تھی۔ وہ جگہ چالیس پنتالیس فٹ گہری تھی۔ وہاں سے گرنے کا نتیجہ موت تھا۔ اوپر سے آبشار گر رہی تھی۔ نیچے سیلاب میں ڈوبی ہوئی چھوٹی چھوٹی چٹانیں تھیں۔

نسیمہ آگے ہو گئی۔ آگے منیر تھا۔ منیر نے اُسے بازوؤں میں لے لیا۔

نسیمہ کے ذہن سے غصّے، حقارت اور انتقام کا شعلہ اُٹھا جس نے دُورے کی کیفیت اختیار کر لی۔ اُس کا جسم لکڑی کی طرح سخت ہو گیا۔ اپنی عصمت کو بچانے کے لئے اُس کی ساری قوتیں مرکوز ہو گئیں۔ اُس نے اپنے جسم کو ایسا جھٹکا دیا کہ منیر کے بازوؤں سے نکل آئی۔ منیر اس جھٹکے سے سنبھل نہ سکا۔ اب وہ ڈھلان کی منڈیر پر کھڑا تھا۔ اُس کی پیٹھ گہرائی کی طرف تھی۔ نسیمہ نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھ اُس کے سینے پر رکھے اور پوری طاقت سے اُسے دھکا دیا۔ منیر کے پاؤں اُٹھ گئے اور وہ ڈھلان سے لڑھکتا گیا۔ اُس کے مُنہ سے اس طرح خوفناک آوازیں نکلیں جیسے بکرے کو ذبح کیا جا رہا ہو۔

نسیمہ نے آگے ہو کر دیکھا۔ نیچے جا کر ڈھلان ختم ہو کر دیوار کی طرح سیدھی ہو گئی تھی۔ منیر وہاں سے گرا تھا۔ نیچے سیلاب کا تھپڑ تھا۔ اوپر سے آبشار گر رہی تھی۔ منیر کو سیلاب نے ہڑپ کر لیا۔ سوچا بھی نہیں جا سکتا تھا کہ وہ زندہ رہے گا۔ سیلاب نے اُسے چٹانوں کے ساتھ پٹخ پٹخ کر مارنا تھا۔

یہ سب کچھ چند سیکنڈ میں ہو گیا۔ اُدھر منیر غائب ہُوا اِدھر نسیمہ کے دورے کی کیفیت ختم ہو گئی۔ اس کا جسم تھر تھرانے لگا۔

اُس نے منیر کے گھوڑے کو دیکھا۔ بارش میں گھوڑا چپ چاپ کھڑا تھا۔ گھوڑے نے نسیمہ کی طرف دیکھا۔ نسیمہ کو یُوں خوف محسوس ہُوا جیسے گھوڑے کو پتہ چل گیا ہو کہ نسیمہ نے اُس کے مالک کو مار ڈالا ہے۔

نسیمہ دوڑ پڑی۔ چند قدم بعد اُس کا پاؤں پھسلا اور وہ گر پڑی۔ وہ بارش کی ٹھنڈ سے کم، خوف سے زیادہ کانپ رہی تھی۔ وہ اُٹھی اور اُس نے محسوس کیا کہ اسے اپنے آپ کو سنبھالنا چاہیئے، اپنے آپ کو نارمل حالت میں رکھنا چاہیئے ورنہ پکڑی جائے گی۔

"میں نے اپنی عصمت کو ایک بھیڑیئے سے بچایا ہے" — اُس نے اُونچی آواز میں اپنے آپ سے کہا — "جس فوٹو کا مجھے ڈر تھا وہ منیر کے ساتھ ہی گیا۔ اُس کی لاش نہیں ملے گی۔ آگے دریا ہے۔ دریا میں بھی سیلاب ہوگا" — اس کے وجود میں مسرت کی لہر دوڑ گئی۔ اُس نے منہ آسمان کی طرف کر کے فاتحانہ انداز سے نعرہ لگایا — "فوٹو گیا۔ اب مجھے کسی کا ڈر نہیں"

اس طرح اپنے آپ کو بلند آواز سے تسلیاں دیتے اُس کا دِل مضبوط ہو گیا اور وہ تیز چل پڑی۔ گھٹا بڑی زور سے گرجی جیسے دھماکہ ہُوا ہو۔ نسیمہ کا دل دہل گیا۔ اُس پر یوں ہول طاری ہو گیا جیسے اُسے کسی نے منیر کو بلندی سے دھکا دیتے دیکھ لیا ہو۔ دل خوف کی گرفت میں آ گیا۔ وہ اور تیز چل پڑی۔

اُس نے پیچھے دیکھا جیسے کوئی اُس کے تعاقب میں آ رہا ہو۔ دُور

موسلا دھار بارش کی دُھند میں اُسے منیر کا گھوڑا دکھائی دے رہا تھا۔ وہ اور تیز چلنے لگی۔ پھسلن تو تھی لیکن راستہ ہموار تھا۔

اُس نے پیچھے دیکھا۔ گھوڑا دُھند میں چھُپ گیا تھا۔ آبشار دُور رہ گئی تھی اور اس قصبے کے مکان نظر آنے لگے تھے۔ اُس نے چادر کا گھونگھٹ اس طرح لٹکا لیا کہ اس کا چہرہ کسی کو نظر نہیں آ سکتا تھا۔ اُسے بارش یہ فائدہ دے رہی تھی کہ لوگ گھروں میں دبکے ہُوئے تھے۔

وہ قصبے کی ایک گلی میں داخل ہو گئی۔ اُس نے سر جھکا لیا اور گھونگھٹ اور زیادہ آگے کر لیا۔ ان گلیوں سے اُس کے قدم مانوس تھے۔ وہ آنکھیں بند کر کے بھی اپنے گھر پہنچ سکتی تھی۔

وہ گھر میں داخل ہوئی تو شوکت صحن میں کھڑا بارش میں نہا رہا تھا۔ نسیمہ کو دیکھ کر وہ کُود کُود کر قہقہے لگانے لگا۔ نوکرانی برآمدے میں بیٹھی تھی۔ نسیمہ کو دیکھتے ہی وہ اُٹھ کھڑی ہوئی اور بارش میں ہی باہر نکل گئی۔

نسیمہ دوسرے کپڑے نکال کر غسل خانے میں چلی گئی۔ اُس نے جب ٹب میں سے پانی اپنے اُوپر ڈالا تو اُسے ایسے لگا جیسے اُس پہ آبشار گر رہی ہو۔ وہ سخت گھبرائی۔ اُس نے اِدھر اُدھر دیکھا اور اپنے آپ کو یقین دلایا کہ یہ غسل خانہ ہے۔

رات کو وہ سو گئی۔ اُس نے پہلی دو راتوں والی بے چینی اور بے خوابی محسوس نہ کی لیکن اُس نے بڑے ڈراؤنے خواب دیکھے۔ اُس نے منیر کو دیکھا۔ اُس کے جسم سے خون نکل رہا تھا۔ اُس کے جسم پر کوئی کپڑا نہ تھا۔ اُس کا منہ بھیڑیئے جیسا تھا اور وہ اُس کی طرف بڑھا آ رہا تھا۔ اُس کی آنکھ کُھل گئی۔ خوف سے دل ڈوب رہا تھا۔ وہ پھر سو گئی اور اُس نے اپنی لاش دیکھی۔

صبح اُس نے اپنے آپ کو سنبھالے رکھا لیکن عمر حیات اور شوکت چلے گئے تو نسیمہ کو ڈر محسوس ہونے لگا کہ ابھی منیر آ جائے گا، یا عمر حیات واپس آ جائے گا۔ اُس کے ہاتھ میں فوٹو ہوگا اور وہ کہے گا، نسیمہ! میں کہتیں

طلاق دیتا ہوں، تم بدکار ہو، میرے گھر سے نکل جاؤ۔

ان دونوں کی بجائے حسنین کاظمی آگیا۔ اُس کا بخار کم ہو گیا تھا۔ اُسے دیکھ کر نسیمہ کی جان میں جان آئی۔ اُس نے حسنین کاظمی کو اندر بٹھایا۔

"یہ لو نسیمہ!" — حسنین کاظمی نے اپنی جیب سے فوٹو نکالا اور نسیمہ کے ہاتھ میں دے کر بولا — "یہ لو فوٹو۔"

نسیمہ نے فوٹو دیکھا۔ وہی فوٹو تھا۔ نسیمہ منیر کی آغوش میں بیٹھی ہوئی تھی۔ اسی فوٹو کی خاطر اُس نے منیر کو قتل کر دیا تھا۔

"آپ کو یہ فوٹو کس طرح ملا ہے؟" — نسیمہ نے پوچھا۔

"کل منیر کو اپنے علم کے زور سے اپنے گھر بلایا تھا" — حسنین کاظمی نے کہا — "اور اُس سے فوٹو لے لیا۔ وہ بڑی تیز بارش میں میرے گھر سے نکلا تھا۔"

نسیمہ کو چکر آگیا اور وہ سوچنے لگی کہ حسنین کاظمی کو بتا دے کہ اُس نے اس فوٹو کے پیچھے منیر کی جان لے لی ہے۔

نسیمہ نے ہونٹ سی لئے کہ اُس کے مُنہ سے نکل ہی نہ جائے کہ اُس نے منیر کو موت کے مُنہ میں دھکیل دیا ہے۔

"اسے میرے سامنے چُولہے میں ڈال دو" — حسنین کاظمی نے کہا — "اس کی راکھ بھی باقی نہ رہنے دو۔"

چُولہا ٹھنڈا پڑا تھا۔ نسیمہ نے ماچس لی، دیا سلائی جلائی اور فوٹو کو آگ لگا دی۔ جس ہاتھ میں اُس نے جلتا ہُوا فوٹو پکڑ رکھا تھا وہ ہاتھ کانپ رہا تھا۔ اُس کا تو دل بھی کانپ رہا تھا۔ اس فوٹو کو جلتا دیکھ کر اُسے خوشی تو ہو رہی تھی لیکن اس خوشی پر ایک بھیانک آسیب طاری تھا۔

فوٹو جل چکا تو نسیمہ نے فوٹو کا وہ کونہ چھوڑ دیا جسے اُس نے شہادت کی انگلی اور انگوٹھے سے پکڑ رکھا تھا۔ زمین پر گرنے سے پہلے ہی یہ کونہ بھی جل گیا۔ نسیمہ جھاڑو لے آئی اور راکھ کو وہاں پہنچا دیا جہاں گھر کا کوڑا کرکٹ پھینکا جاتا تھا۔

"اب تمہیں کسی سے نہیں ڈرنا چاہیئے نسیمہ!" — حسنین کاظمی نے کہا — "اب تم منیر کا سامنا کر سکتی ہو .... لیکن نسیمہ! وہ کبھی سامنے آ بھی جائے تو اُس سے مُنہ نہ لگانا۔ ان لوگوں کی نہ اپنی عزت اور آبرو ہے نہ انہیں کسی کی عزت اور آبرو کا خیال ہے۔"

"کیا وہ میرے سامنے آئے گا؟" — نسیمہ نے حیرت زدہ لہجے میں پوچھا جس میں گھبراہٹ کی جھلک بھی تھی۔

نسیمہ کے مُنہ سے یہ الفاظ نکل تو گئے لیکن وہ ایسی چونکی کہ اُس کا پسینہ نکل آیا۔ حسنین کاظمی نے اُس کا یہ رَدِّ عمل محسوس ہی نہ کیا۔

"ہو سکتا ہے نسیمہ!" — حسنین کاظمی نے نارمل لہجے میں کہا — "ایک

ہی شہر اور ایک ہی محلے میں رہتے ہُوئے آمنا سامنا ہو ہی جاتا ہے۔ تم پردہ
بھی نہیں کرتیں۔ کبھی سامنے آجائے، بلکہ چلتے چلتے کچھ کہہ بھی بیٹھے تو توجہ نہ
دینا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ ملک صاحب اور منیر کی آپس میں کوئی بے مزگی یا
تُو تکار نہ ہو۔ اسی لئے میں تمہیں بار بار کہتا ہوں کہ ملک صاحب کو نہ بتانا کہ
تمہارے گھر پر منیر نے کالا جادو کروایا تھا۔"

"اب تو اِن دونوں کی دوستی ہوگئی ہے"۔۔۔ نسیمہ نے کہا ۔۔۔"کل
رات اُس نے یہیں ملک صاحب کے ساتھ کھانا کھایا تھا۔"

"مجھے سمجھ نہیں آتی کہ ملک صاحب کو میں کیسے سمجھاؤں!"۔۔۔ حسنین کاظمی
نے کہا ۔۔۔"اس شخص کی دوستی بھی خطرناک ہے۔"

"میرے معاملے میں تو اُس کی نیّت صاف نہیں تھی"۔۔۔ نسیمہ نے کہا
اور گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی ۔۔۔"میرا مطلب ہے کہ اُس کی نیّت
صاف نہیں .... میں نے بھی ایسے کہہ دیا ہے جیسے مرُدود مر گیا ہے۔"

"نسیمہ!"۔۔۔ حسنین کاظمی نے کہا اور سوچ میں پڑ گیا۔ ذرا توقف سے بولا
۔۔۔"تمہیں راز کی ایک بات بتاؤں؟ .... لیکن راز اپنے تک رکھنا ....
میرے پیر اُستاد خواجہ صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ منیر کسی کے ہاتھوں قتل ہو
جائے گا یا بہت بُری زندگی گزارے گا۔"

"بہت بُری؟"۔۔۔ نسیمہ نے پوچھا ۔۔۔"یعنی اُس کی زندگی بُرے
کاموں میں گزرے گی؟"

"نہیں"۔۔۔ حسنین کاظمی نے کہا ۔۔۔"ہوسکتا ہے وہ اپاہج ہوجائے،
اندھا ہوجائے، پاگل ہوجائے، جو کچھ بھی ہُوا وہ جیتے جی مرجائے گا جیسے چلتی
پھرتی لاش ہو۔"

"کیا آپ کو یقین ہے کہ ایسے ہی ہوگا؟"

"خواجہ صاحب کو اُن کے علم نے کبھی دھوکہ نہیں دیا"۔۔۔ حسنین کاظمی
نے جواب دیا ۔۔۔"میں نے اُس کا ہاتھ دیکھا تھا اور اپنے علم کی روشنی میں
بھی حساب کتاب جوڑا تھا۔ مجھے بھی کچھ ایسے ہی نظر آیا تھا لیکن میں ابھی

تجربہ کار نہیں ہوں۔ خواجہ صاحب کا نکالا ہُوا حساب ہمیشہ صحیح ہوتا ہے۔"

"فرض کریں وہ قتل ہوجاتا ہے"۔۔۔ نسیمہ نے پوچھا ۔۔۔"تو یہ پتہ چل جائے
گا کہ اُسے کس نے قتل کیا ہے؟"

"یہ نہیں دیکھا"۔۔۔ حسنین کاظمی نے کہا ۔۔۔"یہ پولیس کا کام ہے۔ پولیس
پتہ چلا لیا کرتی ہے۔ کوئی نہ کوئی سراغ مل ہی جاتا ہے۔"

نسیمہ کو یُوں دھکا سا لگا جیسے پولیس نے اُس کا پتہ چلا لیا ہے۔ اُس پر
ڈوبنے کی کیفیت طاری ہونے لگی۔

"میں چلتا ہوں نسیمہ!"۔۔۔ حسنین کاظمی اُٹھ کھڑا ہُوا اور بولا ۔۔۔"میں
نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے۔"

"کاظمی صاحب!"۔۔۔ نسیمہ نے کہا ۔۔۔"میں آپ کی کچھ خدمت کرنا چاہتی
ہوں۔ خود ہی بتائیں کیا پیش کروں۔ آپ نے میرے لئے معجزہ کر دکھایا ہے۔"

"میں نے کہا ہے کہ میں نے اپنا فرض ادا کر دیا ہے"۔۔۔ حسنین کاظمی نے
کہا ۔۔۔"یہ میرا کاروبار نہیں۔ میں منیر جیسے شیطان فطرت انسانوں سے نفرت
کرتا ہوں۔ میری ہمدردیاں اُن کے ساتھ ہیں جو ان شیطانوں کا شکار ہوتے
ہیں۔ میری نیکی برباد نہ کرو نسیمہ! میں اب اس شخص کا انجام دیکھنا چاہتا ہوں....
اب مجھے اجازت دو نسیمہ!"

"آپ آتے رہا کریں نا، کاظمی صاحب!"۔۔۔ نسیمہ نے کہا ۔۔۔"آپ کی
باتوں سے میرا دل مضبوط ہوجاتا ہے۔"

"آؤں گا.... آؤں گا"۔۔۔ حسنین کاظمی نے کہا اور چلا گیا۔

◆◆◆

حسنین کاظمی نسیمہ کے گھر سے نکلا ہی تھا کہ نسیمہ کی ذہنی حالت بگڑنے
لگی۔ اُس کی آنکھوں کے آگے وہ منظر آگیا کہ منیر گہرے نالے کے کنارے پر
کھڑا ہے اور نسیمہ نے اُسے دھکا دیا ہے، پھر وہ تصوّر میں دیکھنے لگی کہ منیر اتنے
اُونچے چٹانی کنارے سے کس طرح لڑھکتا نیچے گیا ہوگا اور اتنے گہرے اور
تیز سیلاب نے اُسے کس طرح اُٹھا اُٹھا کر چٹانوں سے پٹخا ہوگا۔

نسیمہ کا دم یوں گھٹنے لگا جیسے وہ آبشار کے ساتھ اُوپر سے گری ہو اور سیلابی موجیں اُسے کبھی اُوپر کو اُچھال دیتی ہوں کبھی ڈبو دیتی ہوں .... نسیمہ کے جی میں آئی کہ گھر سے بھاگ جائے اور اتنی دُور چلی جائے جہاں اُس کے تعاقب میں کوئی پہنچ نہ سکے۔

وہ عورت تھی اور وہ بدکردار عورت نہیں تھی۔ اگر بدکردار ہوتی بھی تو وہ طبعاً قاتل نہیں ہو سکتی تھی اور وہ پیشہ ور قاتل بھی نہیں تھی۔ قتل ایسا جُرم ہے جو پیشہ ور قاتل کرے تو وہ اس جُرم کا رَدِّعمل برداشت کرنے کے لئے چرس اور شراب کے نشے میں ڈوب جاتا ہے۔ قتل اور خودکشی ایک لمحے کے پاگل پن کا نتیجہ ہوتا ہے۔ وہ لمحہ نسیمہ کی زندگی میں آگیا اور اُس نے ایک خوبصورت اور جوان آدمی کو قتل کر دیا۔ اب وہ اپنے ضمیر کے رَدِّعمل سے بھاگ رہی تھی مگر اُس کی کوئی پناہ نہیں تھی، کوئی راہِ فرار نہیں تھی۔ اُسے ایسا روگ لگ گیا تھا جس کا وہ کسی کے ساتھ ذکر بھی نہیں کر سکتی تھی۔ وہ اپنے آپ کو دھوکے اور فریب دینے لگی۔

"مرا نہیں ہوگا" ___ اُس نے اپنے آپ سے کہا ___ "واپس آگیا ہوگا .... کیا وہ مجھ سے انتقام لے گا؟ .... عمرحیات کو بتائے گا؟ .... مجھ سے ڈر جائے گا؟ .... اتنا تو ضرور سوچے گا کہ اس لڑکی سے بچ کے رہنا چاہیئے۔"

اُس کے ذہن میں سوال اس طرح ایک دوسرے کے پیچھے آرہے تھے جیسے طوفان کے تھپیڑے اُس کے وجود کو جھنجھوڑ رہے ہوں۔ اُس نے صاف طور پر محسوس کیا کہ اُس کا جسم سُکڑ گیا ہے اور قد بھی چھوٹا ہو گیا ہے۔

"باہر نکل کے دیکھوں؟" ___ طوفان بار بار اس کے تھپیڑے چلے آرہے تھے ___ "کسی سے پوچھوں منیر کہاں ہے؟ .... نہیں .... ایسی غلطی نہ کرنا۔ شک ہوگا کہ یہ منیر کا کیوں پوچھ رہی ہے" ___ اُس نے اپنے آپ کو حوصلہ دیا ___ "کوئی نہیں مانے گا کہ اِس کمزور سی لڑکی نے اتنے طاقتور مرد کو چٹانی نالے میں پھینک دیا ہے" ___ اُسے حوصلہ مل گیا لیکن اچانک خیالوں کا ایک اور طوفانی تھپیڑا آیا اور اُس کے حوصلے کو اُڑا لے گیا ___ "کسی نے دیکھ لیا ہوگا۔ جس طرح منیر نے بارش میں مجھے دیکھ لیا تھا اور میرے راستے میں آن کھڑا ہُوا تھا اسی طرح ہم دونوں کو کسی اور نے دیکھ لیا ہوگا۔"

اُس نے ذہن پر زور دیا اور یاد کرنے کی کوشش کرنے لگی کہ منیر کو دھکا دے کر وہ جب واپس آرہی تھی تو اُسے کسی نے دیکھا تھا؟ اُس کے قریب سے کوئی گزرا تھا؟ وہ جب شہر میں داخل ہوئی تو اُسے کسی نے ضرور دیکھا ہوگا۔

اُسے ایسا کوئی آدمی یاد نہ آیا جس نے اُسے دیکھا ہو مگر ایک وہم تھا جو اپنا پنجہ اُس کے ذہن پر گہرا اُتارتا گیا کہ اُسے کسی نہ کسی نے ضرور دیکھا تھا ___ "منیر کا گھوڑا دیکھ رہا تھا" ___ اس خیال نے نسیمہ کا خون خشک کر دیا ___ "کیا گھوڑا گواہی دے سکتا ہے؟"

"نہیں" ___ اُس نے سرگوشی سے ذرا بلند آواز میں کہا ___ "جانور گواہی نہیں دے سکتے۔"

اپنی آواز پہ وہ چونک اُٹھی۔ کمرے میں کوئی ہوتا تو وہ سُن لیتا اور اُس سے پوچھتا کہ اُس نے کیا کہا ہے۔ اُس پر گھبراہٹ طاری ہوگئی اور اُس نے محسوس کیا کہ یہ ذہنی کیفیت اُس کے لئے اچھی نہیں اور اُسے اپنے آپ کو قابو میں رکھنا چاہیئے۔

پھر ایک اور ریلا آیا ___ "وہ حسنین کاظمی کے گھر سے آرہا تھا۔ وہ سب کو بتا دے گا کہ منیر اُس کے گھر گیا تھا اور وہاں سے واپس آتے غائب ہُوا ہے .... اوہ .... خانقاہ والی بُڑھیا نے مجھے بڑی اچھی طرح دیکھا تھا۔ اُس سے کسی نے پوچھا تو وہ بتا دے گی کہ یہ لڑکی اُس کے پاس گئی تھی اور بارش میں وہاں سے نکلی تھی .... پولیس کڑیاں ملالے گی، سراغ لگالے گی۔"

اُس نے یُوں محسوس کیا جیسے اُس کا قد بہت چھوٹا ہو گیا ہو۔

"باغ والے کمرے میں آجانا" ___ نسیمہ کو آواز سنائی دی ___ "شادی شدہ ہو، کنواری تو نہیں ہو۔"

اُس کا خون کھولنے لگا اور اُس کا جسم جو سُکڑ گیا تھا اور قد جو چھوٹا ہو گیا تھا، اصلی حالت میں آگیا اور اُس میں جرأت سی عود کر آئی۔

"کسی کو پتہ چل بھی گیا تو کہوں گی اُس نے میری عصمت پہ ہاتھ ڈالا تھا"

—اُس نے بڑی جرأت سے اپنے آپ سے کہا —"میرا خاوند خوش ہوگا کہ اُس کی بیوی عزت والی ہے۔"

"بی بی جی!"—اُس کی نوکرانی کام کاج سے فارغ ہو چکی تھی—"پیسے دو، بازار سے ہو آؤں۔ کیا منگوانا ہے؟"

نسیمہ کو احساس ہی نہیں تھا کہ اُس کی نوکرانی صبح سے آئی ہوئی ہے اور اپنا کام ختم بھی کر چکی ہے۔ اُس نے سر کو دائیں بائیں زور زور سے ہلایا جیسے وہم اور خوف سے آزاد ہونے کی کوشش کی ہو۔ اُسے یاد آگیا کہ دوپہر کی ہانڈی روٹی کا وقت ہو گیا ہے۔ اُس نے نوکرانی کو پیسے دے کر بتایا کہ بازار سے کیا لانا ہے۔

"مجھے اپنے آپ کو صحیح رکھنا چاہیئے"—اُس نے نوکرانی کو بازار بھیج کر اپنے آپ سے کہا—"خدا میرے ساتھ ہے۔ میں نے اپنی عزت کی حفاظت کی ہے۔"

❖

"نسیمہ!"—اُسے صحن میں ایک عورت کی آواز سنائی دی—"کہاں ہو نسیمہ!"

نسیمہ کمرے سے نکلی۔ وہ اُس کے محلے کی ایک جواں سال عورت تھی۔ خوبصورت اور زندہ دل عورت تھی۔ نسیمہ کے ساتھ اُس کی خاصی بے تکلفی تھی۔ اُس کا خاوند بھی شگفتہ مزاج آدمی تھا۔

"نسیمہ!"—اُس نے سنسنی پیدا کرنے والے لہجے میں کہا—"سُنا نہیں تم نے؟ .... وہ منیر امرُود ہے نا! وہ کل سے غائب ہے۔"

"بدمعاش آدمی ہے"—نسیمہ نے اپنے ہیجان کو دباتے ہوئے کہا—"ماں باپ کو بتائے بغیر کہیں سیر سپاٹے کے لئے ...."

"اری نہیں"—اس عورت نے کمرے میں پلنگ پر بیٹھتے ہوئے کہا—"کل گھوڑے پر کہیں گیا، پھر بارش آگئی۔ وہ شام تک نہ آیا .... میں اُس کے گھر سے آ رہی ہوں۔ مجھے کسی نے بتایا تھا تو میں وہاں چلی گئی۔ وہاں محلے کی چار پانچ

اور عورتیں بیٹھی ہوئی تھیں اور منیرے کی ماں رو رہی تھی .... ہاں تو، وہ رات کو بھی نہ آیا لیکن اُس کا گھوڑا شام کو خالی واپس آگیا تھا۔"

"اری نہیں تاجی!"—نسیمہ نے انجان بنتے ہوئے کہا—"اُس کا کوئی دوست ...."

"اُس کی ماں رو رو کر بُرا حال کر رہی ہے کہ گھوڑا اکیلا واپس آیا تو منیر خیریت سے نہیں"—تاجی نے کہا—"گھوڑے اور کتے میں یہ وصف ہوتا ہے کہ اپنے گھر سے خواہ سو میل دُور ہوں اور ان کے مالک کو کچھ ہو جاتے، وہ مارا جاتے یا کہیں لاپتہ ہو جاتے تو گھوڑا ہو یا کتا، وہ گھر واپس آجاتا ہے۔ اس سے یہ مطلب لیا جاتا ہے کہ مالک جہاں کہیں بھی ہے وہ خیریت سے نہیں۔ اسی طرح منیرے کا گھوڑا خالی واپس آگیا۔ رات کو پھر بارش برسی۔ منیرا ابھی تک نہیں آیا۔"

"یہ پتہ نہیں چلا وہ گیا کہاں تھا؟"

"نہیں"—تاجی نے جواب دیا—"یہ بھی پتہ نہیں چلا کہ گھوڑا آیا کس طرف سے ہے۔"

"پھر اُس کے ماں باپ کیا کر رہے ہیں؟"—نسیمہ نے پوچھا—"اُسے کہاں ڈھونڈیں گے؟"

"اُس کے باپ کے پاس اُس کے رشتہ دار اور محلے کے دو تین آدمی بیٹھے ہیں"—تاجی نے کہا—"وہ اُسے کہہ رہے ہیں کہ تھانے رپٹ لکھوا دو۔ اگر گھوڑا اکیلا نہ آتا تو اور بات تھی۔ یہ تو صاف خطرے والی بات لگتی ہے کہ گھوڑا اُس کے بغیر آیا ہے۔"

"کہیں ندی نالے میں نہ ڈوب گیا ہو"—نسیمہ نے کہا—"اور گھوڑا نکل آیا ہو۔"

"میرا تو خیال ہے کسی نے اُسے پار کر دیا ہے"—تاجی نے سرگوشی میں کہا۔

"قتل؟"

"تو اور کیا؟" ۔۔۔ تاجی نے کہا ۔۔۔ "کسی کی لڑکی سے دست درازی کی ہوگی۔ لڑکی نے گھر جا بتایا ہوگا۔ گھر کے مردوں نے موقع دیکھ کر منیرے کو قتل کر دیا ہوگا اور لاش کسی نالے میں پھینک دی ہوگی۔ کل ندی نالے چڑھے ہوئے تھے ۔۔۔۔ مر ہی گیا ہو تو اچھا ہے۔ کہنا تو نہیں چاہیئے، میں بھی دو بچوں کی ماں ہوں لیکن جو کام میں نہیں کر سکی وہ کسی اور نے کر دیا۔"

"کیا تمہارے ساتھ ۔۔۔۔"

"لو! ایک مدت میرے پیچھے پڑا رہا تھا" ۔۔۔ تاجی نے کہا ۔۔۔ "اس نے جتنا پریشان مجھے کیا تھا، میں دن رات دعائیں کرتی تھی کہ خدایا، اسے اسی دنیا میں خوار کر ۔۔۔۔ میں اپنے خاوند اور بھائیوں کو نہیں بتاتی تھی۔ اس ڈر سے چپ رہتی تھی کہ لڑائی جھگڑا ہوگا۔ منیرے کا تو پولیس کے ساتھ بھی دوستانہ ہے، میرے خاوند اور بھائیوں پر مصیبت آجاتی۔ میں تو کہتی ہوں کہ اسے میری بددعا لگی ہے ۔۔۔۔ اور دیکھو نسیمہ! میرا تمہارا آپس میں کوئی پردہ نہیں۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ جب سے تمہارے گھر میں ڈاکو پکڑے گئے ہیں منیرا تمہارے گھر آنے لگا ہے۔ مجھے پتہ چلا ہے کہ ملک صاحب اسے گھر لے آتے ہیں۔ وہ تو اپنی ماں کا بھی سگا نہیں۔ میں مان ہی نہیں سکتی کہ تمہارے متعلق اس کی نیت صاف ہوگی ۔۔۔۔ اور دیکھ نسیمہ! جیراں بہشتن کو جانتی ہو نا! اس سے ہوشیار رہنا۔ وہ منیرے کی خاص عورت ہے ۔۔۔۔ پہلے تو یہ دعا کرو کہ کافر واپس ہی نہ آئے۔"

"ہائے ایسی بددعا نہ دو تاجی!"

"بددعا نہ دوں؟" ۔۔۔ تاجی نے کہا ۔۔۔ "میرا بس چلے تو اپنے ہاتھوں اس کا گلا دبا دوں۔ ایک بار اس نے مجھے راستے میں روک لیا اور لگا بکواس کرنے۔ میں نے کہا، دیکھ منیرے! میں سکھنی یا ہندوانی نہیں ہوں۔ یہیں گلی میں تیرے منہ پر جوتی ماروں گی ۔۔۔۔ بے غیرت کی اولاد ایسی ڈھیٹ مٹی کا بنا ہوا ہے کہ ہنس پڑا اور کہنے لگا کہ میرے باغ میں آجاؤ۔ ایک کی بجائے دو جوتیاں مار لینا۔ خدا کی قسم، اف نہیں کروں گا۔ بتا نسیمہ! میں اسے کیا کہتی؟"

"کہاں ہو نسیمہ!" ۔۔۔ صحن سے ایک اور عورت کی آواز آئی جو کمرے کی طرف بڑھتی آئی ۔۔۔ "ہائے ظلم ہو گیا ہے۔ اتنا جوان اور خوبصورت لڑکا کھو گیا ہے" ۔۔۔ یہ اسی محلے کی ادھیڑ عمر عورت تھی۔ کمرے میں آکر بیٹھ گئی ۔۔۔ "سنا تم نے؟"

"اسے سنا چکی ہوں" ۔۔۔ تاجی نے کہا ۔۔۔ "اللہ اسے خیریت سے رکھے۔ ماں باپ کا اکیلا بیٹا ہے۔"

"مجھے تو خیریت نظر نہیں آتی" ۔۔۔ عورت نے کہا ۔۔۔ "گھوڑے کا خالی واپس آجانا ۔۔۔۔ معاملہ گڑبڑ لگتا ہے۔"

تاجی کو ذرا سا بھی افسوس نہیں تھا لیکن وہ اس عورت کے آگے افسوس کا اظہار کرتی رہی۔

"اس کا باپ اب کیا کرے گا؟" ۔۔۔ نسیمہ نے پوچھا ۔۔۔ "تھانے جائے گا؟"

"وہ کہتا ہے کہ شام تک دیکھ لیتے ہیں" ۔۔۔ عورت نے جواب دیا ۔۔۔ "میرے بیٹے پر کوئی مائی کا لال ہاتھ نہیں اٹھا سکتا۔ اس کے عزیز رشتہ دار اسے کہہ رہے ہیں کہ تھانے اطلاع کر دو، پچھتاؤ گے ۔۔۔۔ ان لوگوں کو تو ان کی ڈھینگیں لے بیٹھی ہیں۔ لڑکے کا تو یہ حال تھا جیسے زمین پر تو اس کا پاؤں پڑتا ہی نہیں، آسمان پر چلتا ہے ۔۔۔۔ میرا خیال ہے کسی دشمن کے ہاتھ چڑھ گیا ہے اور یہ بھی مانو کہ بارش میں آرہا ہوگا یا کہیں جا رہا ہوگا۔ بجلی کڑک رہی تھی۔ گھوڑا بدک کر بے لگام ہوگیا اور لڑکے کو کہیں گرا کر گھر آگیا ہوگا۔"

"ایسا ہوتا تو وہ بھی گھر آجاتا" ۔۔۔ نسیمہ نے کہا۔

"معلوم نہیں گھوڑے نے اسے کہاں جا گرایا ہے" ۔۔۔ عورت نے کہا ۔۔۔ "کہیں دریا میں ہی نہ پھینک آیا ہو۔"

نسیمہ پر جو گزر رہی تھی، اسے نہ تاجی سمجھتی تھی نہ یہ عورت۔ تاجی نے نسیمہ سے کہا کہ وہ بھی منیر کی ماں کے پاس افسوس اور ہمدردی کے اظہار کے لئے جائے۔ محلے کی عورتیں جا رہی ہیں۔

"جاؤ، ابھی ہو آؤ" ۔۔۔ تاجی نے کہا اور جانے کے لئے اٹھی۔

نسیمہ کو جیسے اپنے جسم اور اپنی روح کی تمام تر قوتیں بیدار کر کے منیر کے گھر جانے کی ہمت ہوئی۔ منیر کی ماں کے آنسو بہہ رہے تھے۔ محلے کی چند عورتیں اُس کے پاس بیٹھی اُسے تسلیاں دے رہی تھیں۔ نسیمہ نے بھی اُس کے پاس بیٹھ کر ہمدردی اور تسلی کی دو باتیں کیں لیکن وہ محسوس کرنے لگی کہ اُس کی ہمت اور جرأت جواب دے رہی ہے۔ وہ اپنے مقتول کی ماں کا سامنا کرنے سے گھبرانے لگی۔

"دشمنوں کی نظر کھا گئی ہے میرے شہزادے بیٹے کو!" — ماں نے بین کے انداز سے کہا — "اُسے تو تھانیدار بھی سلام کرتے تھے" — وہ کہتی کم اور روتی زیادہ تھی — "دیکھ نسیمہ بیٹی! تیرے گھر سے اُس نے کس طرح ڈاکوؤں کو پکڑا ہے۔ ہے کوئی جو اکیلے ڈاکوؤں کو پکڑ لے" — اور ماں نے اپنے سینے پر ہاتھ مارنے شروع کر دیئے۔

نسیمہ کو یوں لگا جیسے منیر کی ماں کے ہاتھ اُس کے سر پر ہتھوڑوں کی طرح پڑ رہے ہوں۔ نسیمہ کی ہمت جواب دے گئی۔ وہ جانے کے لئے اُٹھی۔ منیر کی ماں نے اُس کا بازو پکڑ لیا۔

"نہ جا نسیمہ! نہ جا!" — منیر کی ماں نے کہا — "تیرے گھر پر تو میرے شہزادے نے اپنی جان کی بازی لگا دی تھی"

نسیمہ کو ایسے لگا جیسے منیر کی ماں نے کہا ہو — "منیر نے تیرے گھر پر اپنی جان کی بازی لگا دی تھی اور تُو نے اُس کی جان لے لی ہے"

نسیمہ کو منیر کی ماں نے زبردستی بٹھا لیا۔

"قرآن ختم کرا چوہدرانی!" — ایک بوڑھی عورت نے کہا — "دعا کر کہ تیرے بیٹے کو گم کرنے والے اسی دُنیا میں سزا پائیں اور ذلیل و خوار ہوتے پھریں"

"بُوا!" — ایک عورت نے بڑھیا سے کہا — "ایسی بات کیوں مُنہ سے نکالتی ہو کہ اُسے کسی نے گم کر دیا ہے۔ دعا کرو کہ وہ جہاں بھی ہو، زندہ اور سلامت ہو"

"کہیں ڈھونڈا بھی ہے یا نہیں؟" — نسیمہ نے پوچھا۔

"کہاں ڈھونڈیں!" — منیر کی ماں نے کہا — "گھوڑا نہ آتا تو ہم کہتے کہ کسی دوست کے پاس کسی گاؤں میں چلا گیا ہوگا۔ جہاں جہاں وہ جایا کرتا تھا وہاں سے معلوم کیا ہے۔ وہ کہیں بھی نہیں گیا.... اب اُس کا باپ تین چار آدمیوں کے ساتھ تھانے گیا ہے"

نسیمہ وہاں سے اُٹھ آئی۔ گھر تک وہ اس طرح پہنچی جیسے نیند میں یا بے ہوشی کی حالت میں چلتی آئی ہو۔ منیر کی ماں کی سسکیاں اور اُس کے دھیمے دھیمے بین اُس کے ساتھ ساتھ یوں چلے آ رہے تھے جیسے شہد کی بیشمار مکھیاں اُس کے اُوپر، دائیں، بائیں، آگے اور پیچھے بھنبھناتی آ رہی ہوں اور یہ سب اُسے ایک ہی بار ڈس لیں گی۔ ایک بار تو اُس نے اپنے سر کے اُوپر یوں ہاتھ گھمایا جیسے مکھیوں سے بچنے کی کوشش کی ہو۔

وہ جب اپنے گھر میں ایک کمرے میں داخل ہوئی تو اُسے کمرے میں ہنسی کی آواز سنائی دی۔ وہ ڈر کر رُک گئی اور کمرے میں ہر طرف دیکھا۔ یہ ہنسی منیر کی تھی۔ نسیمہ ایک دومنٹ دروازے میں رُکی رہی۔ اُسے اپنے پیچھے ایسی آہٹ سنائی دی جیسے کوئی دبے پاؤں چل رہا ہو۔ اُس نے بدک کر پیچھے دیکھا۔ برآمدے میں بلی جا رہی تھی۔ نسیمہ نے سکون کی آہ لی اور اُس نے اپنے آپ کو یقین دلایا کہ ہنسی کی آواز بھی کوئی ایسی ہی آواز تھی۔ شاید اپنے ذہن سے ہی اُٹھی ہوگی۔

❖

"چوہدری صاحب!" — تھانے میں تھانیدار منیر کے باپ سے منیر کی گمشدگی کی رپورٹ سُن کر کہہ رہا تھا — "اپنے بیٹے کو آپ جانتے ہیں۔ معاف رکھنا، تھانے میں ہر بات بڑی صاف کی جاتی ہے۔ میں نے آپ سے پوچھا ہے کہ آپ کو کسی پر شک ہے کہ اُس نے آپ کے بیٹے کو قتل کر دیا ہو گا تو آپ کہتے ہیں کہ آپ کو کسی پر شک نہیں۔ آپ کو یہ بھی معلوم نہیں کہ وہ گیا کہاں تھا۔ وہ دن کے وقت گھر سے نکلا اور ابھی تک نہیں آیا۔ آپ کو

شاید معلوم ہوگا کہ اُس کا چال چلن صحیح نہیں۔ وہ کونسا بدمعاش ہے جس کے ساتھ اُس کی یاری نہیں۔ مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ لوگوں کی بہو بیٹیوں کے پیچھے پھرتا رہتا ہے اور آپ اپنے بیٹے کی اِن حرکتوں پر فخر کرتے ہیں....

"میرے پاس شک والی صرف ایک بات ہے۔ اُس نے دو عادی مجرموں کو پکڑوایا ہے۔ ان کے گروہ کے دو چار آدمی باہر ہوں گے۔ ہو سکتا ہے اُنہوں نے آپ کے بیٹے پر وار کیا ہو۔ یہ وار انتقامی بھی ہو سکتا ہے اور اس لئے بھی آپ کا بیٹا اُن ڈاکوؤں کے مقدمے میں اہم گواہ ہے جنہیں اُس نے پکڑوایا ہے۔ آپ کے بیٹے کے اُڑ جانے سے مقدمہ اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ مجرم بری ہو سکتے ہیں .... میں اس بنا پر منیر کی گمشدگی کی رپورٹ لکھ لیتا ہوں۔ اگر اُس کے ذاتی چال چلن اور بدمعاشوں جیسی حرکتوں کو دیکھوں تو یہ معاملہ کچھ اور بن جاتا ہے۔"

"حضور!" — منیر کے باپ نے التجا کے لہجے میں کہا — "مجھے اپنا بیٹا چاہیئے۔ میں باپ ہوں۔ اُس کی ماں کی حالت دیکھیں۔"

"ہم بھی اسی شک پر چوہدری صاحب کے ساتھ آئے ہیں جس کا ذکر آپ نے خود ہی کر دیا" — منیر کے باپ کے ساتھ جو آدمی تھانے گئے تھے، اِن میں سے ایک نے کہا — "لڑکا بدمعاش ہے یا جیسا کیسا بھی ہے، وہ اتنا سیدھا اور کمزور نہیں کہ اُسے اتنی آسانی سے کسی نے غائب کر دیا ہوگا۔ اُس پر مستانے کے کسی آدمی نے جوابی وار کیا ہے۔ اگر ہماری طرف سے آپ نے کوئی شک لکھنا ہے تو یہی لکھیں۔"

"رپورٹ تو میں لکھ رہا ہوں" — تھانیدار نے کہا — "شک بھی یہی لکھوں گا۔ تفتیش بڑی محنت سے کروں گا۔ آپ صاحبان سے اور چوہدری صاحب سے میں یہ کہہ رہا ہوں کہ لڑکے کو آپ جانتے ہیں کیسا ہے۔ آپ خود بھی اِدھر اُدھر ہاتھ پاؤں ماریں اور تفتیش میں میری مدد کریں۔ آپ دیہاتی نہیں شہری صاحبان ہیں اور پڑھے لکھے بھی ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ لڑکے پر وار ہوا ہے۔ گھوڑے کا اُس کے بغیر گھر آنا ایک ثبوت ہے کہ معاملہ مشکوک ہے اور

خطرناک بھی ہے ... میں کچھ باتیں معلوم کرنا چاہتا ہوں۔ آپ میں سے کوئی ایک صاحب میرے پاس بیٹھے رہیں، باقی باہر تشریف لے جائیں۔ میں سب کو باری باری بلاؤں گا۔ آپ کو زحمت تو ہوگی لیکن یہ بہت ضروری ہے۔"

ایک آدمی بیٹھا رہا، باقی باہر چلے گئے۔ تھانیدار نے اُس سے کچھ معلومات لیں اور اُسے الگ بٹھا کر دوسرے آدمی کو بلایا۔ اس طرح اُس نے سب سے باری باری پوچھ گچھ کی۔ کسی ایک نے بھی نہیں کہا کہ منیر شریف آدمی تھا۔ تھانیدار کو پختہ شک یہی تھا کہ منیر مستانے کے گروہ کی لپیٹ میں آگیا ہے لیکن وہ دوسرے امکانات کو بھی سامنے رکھنا ضروری سمجھتا تھا۔ اُس کے لئے یہ مشکل پیدا ہوگئی تھی کہ مستانہ اور اُس کا ساتھی اُس کی حوالات میں نہیں تھے۔ اُن کے خلاف مقدمے کی سماعت شروع ہوگئی تھی اور وہ جیل کی حوالات میں تھے۔ وہاں وہ اُن سے تفتیش نہیں کر سکتا تھا۔ کر سکتا بھی تھا تو وہ کیوں تسلیم کرتے کہ منیر کو اُن کے کسی ساتھی نے اغوا یا قتل کیا ہے۔ بہرحال اِس الزام سے وہ بری تھے کیونکہ وہ جیل میں تھے۔

تھانیدار کو منیر کے لاپتہ ہو جانے کا یہی غم تھا کہ مستانے اور گنجے کے خلاف اُس کا کیس منیر کی گمشدگی کی وجہ سے تباہ ہو رہا تھا۔ منیر ہی اہم گواہ تھا۔ تین روز بعد پیشی تھی اور اُس روز منیر نے گواہی دینی تھی۔

اِن آدمیوں نے جو منیر کے باپ کے ساتھ تھانے گئے تھے، تھانیدار کو بتایا کہ منیر کا سبزیوں کا جو باغ ہے، یہ اُس کی بدکاریوں کا اڈہ ہے۔ اُنہوں نے دو ہندو لڑکیوں کے نام بتائے جن کے متعلق سب جانتے تھے کہ اُن کی منیر کے ساتھ درپردہ دوستی ہے۔ اُن سب نے کہا کہ باغ کا مالی اور اُس کی بیوی بتا سکتی ہے کہ وہاں کون کون آتا تھا۔ اُنہوں نے اس شک کا اظہار کیا کہ مستانے کے کسی آدمی نے اگر منیر کو غائب نہیں کیا تو اُسے کسی ایسی لڑکی کے بھائیوں وغیرہ نے قتل کر دیا ہوگا جسے اُس نے چھیڑا ہوگا۔ ان آدمیوں سے یہ بھی پتہ چل گیا کہ منیر کی گہری دوستی کس کے ساتھ تھی۔

تھانیدار نے ان سب کو بھیج دیا اور منیر کے مالی اور اُس کی

بیوی کو تھانے بلوایا۔

◆◆

مالی ادھیڑ عمر تھا۔ اُس کی بیوی کی بھی جوانی ڈھل گئی تھی۔ تھانیدار نے مالی کو الگ کر لیا اور اُسے کہا کہ وہ صاف صاف بتا دے کہ منیر باغ میں کیا کرتا تھا، اور وہ ایک بھی بات چھپانے کی کوشش نہ کرے ورنہ وہ پکڑا جائے گا۔

مالی نے بتایا کہ وہاں لڑکیاں آتی تھیں۔ وہ اتنا ہی بتا سکا کہ وہ ہندو لڑکیاں ہیں۔ دن کو بھی کبھی کبھی ایک لڑکی آجاتی تھی۔ کبھی کبھی منیر رات باغیچے کے کمرے میں گزارتا تھا۔ مالی کو معلوم نہیں تھا کہ رات کو وہ کیا کرتا تھا۔

"تم اُن لڑکیوں کو پہچانتے ہو؟" — تھانیدار نے اُس سے پوچھا۔

"سامنے آئیں تو پہچان لوں گا" — مالی نے جواب دیا — "جناب عالی! ہم غریب لوگ ہیں۔ بات کرتے ڈرتے ہیں۔ چھوٹے چوہدری نے تو اپنے دل سے خُدا اور رسولؐ کا ڈر خوف بھی نکال دیا تھا۔ سوائے بدکاری اور بدمعاشی کے وہ کچھ اور سوچتا ہی نہیں تھا۔"

"کوئی مسلمان عورت بھی باغ میں جاتی تھی؟"

"کوئی نہ کوئی آہی جاتی تھی" — مالی نے جواب دیا — "چند مہینے گزرے ایک لڑکی کی شادی ہوگئی ہے۔ شادی سے پہلے کبھی کبھی وہ باغ میں چھوٹے چوہدری کے پاس آیا کرتی تھی۔ اُس کا نام نسیمہ ہے۔ اب وہ ملک عمر حیات کی بیوی ہے۔"

"شادی کے بعد بھی آتی رہی ہے؟"

"نہ جی!" — مالی نے جواب دیا — "شادی کے بعد کبھی نہیں آئی۔"

مالی کی بیوی نے بھی یہی کچھ بتایا۔

تھانیدار نے اپنے مخبروں سے کہا کہ وہ منیر کی دوستیوں اور دشمنیوں کے متعلق معلومات لائیں۔ اُس کا ذہن مستانے پہ اٹکا ہُوا تھا۔ اُس نے اپنے علاقے کے نمبرداروں وغیرہ کو بھی اطلاع بھجوا دی کہ شہر کا ایک جوان

آدمی لاپتہ ہے۔ اپنے اپنے علاقے کے کھڈ نالوں اور ویرانوں میں دیکھیں کہیں لاش پڑی ہوگی یا وہ اپنے طور پر کھوج لگانے کی کوشش کریں۔

نمبردار اپنے کام سے واقف تھے۔ یہ اطلاع اگلے روز جانی شروع ہوئی تھی۔ وہ پیدل چلنے کا زمانہ تھا۔ اطلاع ہر طرف اسی رفتار سے جا رہی تھی۔

◆◆

رات کو عمر حیات معمول سے ذرا دیر سے گھر آیا۔ اُس پر ہیجانی کیفیت طاری تھی۔

"میں منیر کے باپ سے ملنے چلا گیا تھا" — اُس نے نسیمہ سے کہا — "اُن کے گھر تو ماتم ہو رہا ہے۔ تمہیں معلوم ہو گیا ہے نا، منیر...؟"

"مجھے صبح ہی پتہ چل گیا تھا" — نسیمہ نے کہا — "میں وہاں گئی تھی۔ اُس کی ماں کی حالت بہت بُری ہو رہی تھی.... آپ کا کیا خیال ہے کہاں کھو گیا ہے؟"

"مستانے کے آدمیوں نے اُسے غائب کر دیا ہے" — عمر حیات نے کہا — "تمہاری ماں نے کِسے اپنا پیر بنا رکھا تھا! دیکھ لو نسیمہ! اتنے خطرناک مُجرم عامل اور پیر بنے ہُوتے ہیں اور لوگ ان کے آگے سجدے کرتے ہیں۔ اگر ہم لوگ خُدا کو یاد کریں اور اُسی سے مدد مانگیں تو ہماری اور کوئی مراد پوری ہو نہ ہو، کم از کم ان نوسر بازوں سے تو بچے رہیں اور خدا کی خوشنودی بھی حاصل کر لیں۔"

"لوگ مجبور ہیں" — نسیمہ نے کہا — "ہم بھی مجبور ہو گئے تھے نا!"

"مجبوری ہی انسان کو کم عقل بنا دیتی ہے" — عمر حیات نے کہا — "اب دیکھو نا! منیر لاپتہ ہو گیا ہے۔ اس کے ماں باپ کیا کریں گے؟ بیٹے کو کہاں سے لائیں گے! خانقاہوں اور مزاروں پر جا ماتھے رگڑیں گے۔ پیروں اور عاملوں کے آگے جا روئیں گے اور اُن کے گھر بھریں گے وہ کبھی نہیں سمجھیں گے کہ یہ سب ڈھکوسلے ہیں۔"

"میں نے سُنا ہے بعض عامل بتا دیتے ہیں کہ گمشدہ آدمی کہاں ہے"۔

نسیمہ نے پوچھا —— "ہیں کوئی ایسے عامل؟"

"میں نے بھی سُنا ہے"—عمر حیات نے کہا —— "حسنین کاظمی سے پوچھوں گا .... لیکن میں سوچتا یہ ہوں کہ مستانے کا گروہ بڑا خطرناک ہے۔ یہ کوئی منظم گروہ معلوم ہوتا ہے۔ مستانہ جیل میں ہے اور اُس کے آدمیوں نے جو باہر ہیں منیر کو غائب کر کے انتقام بھی لے لیا ہے اور اپنے کیس کے سب سے بڑے گواہ کو اُڑا دیا ہے۔ ہمیں بھی ہوشیار رہنا پڑے گا۔ چوکیدار بیکار ثابت ہُوا ہے، میں گھر میں سلانے کے لئے ایک آدمی کا انتظام کر لوں گا۔"

"اللہ مالک ہے"—نسیمہ نے بڑے اطمینان سے کہا۔

نسیمہ کو تو ڈر جانا چاہیئے تھا لیکن اُسے معلوم تھا کہ منیر کو غائب کرنے والے مستانے کے آدمی نہیں۔ وہ عمر حیات سے کہہ نہیں سکتی تھی کہ نہ ڈرو، مستانہ اب ہمارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔

"منیر نیک نام آدمی تو نہیں"—عمر حیات نے کہا —— "لیکن ہمارے ساتھ اُس نے جو نیکی کی ہے، اسے میں ساری عمر نہیں بھول سکوں گا۔"

نسیمہ نے اپنا نیچے والا ہونٹ دانتوں میں دبا لیا کہ مُنہ سے کوئی ایسی بات نہ نکل جائے جو اُس کا راز فاش کر دے۔

رات عمر حیات کا بیٹا شوکت سب سے پہلے سو گیا۔ اس کے بعد عمر حیات بھی سو گیا مگر نسیمہ کو نیند نہیں آ رہی تھی۔ رات گزرنے کے ساتھ ساتھ نسیمہ بیدار ہوتی چلی جا رہی تھی۔

آدھی رات گزر گئی۔ کمرے میں زیرو نمبر کا بلب روشن تھا۔ نسیمہ یوں محسوس کرنے لگی جیسے کمرے میں کوئی اور بھی موجود ہو۔ وہ جو کوئی بھی تھا، یا جو کچھ بھی تھا، نسیمہ کے احساس کے مطابق کمرے کی فضا میں تھا۔ چھت پر نہ فرش پر۔ ایک دیوار میں دو روشندان تھے۔ ایک کے شیشے میں زیرو کے بلب کا عکس نظر آ رہا تھا۔ شیشے سے اس عکس کی شعاعیں منعکس ہو

رہی تھیں۔

نسیمہ کا ذہن اُس کے قابو میں نہیں رہا تھا۔ اُلٹے پُلٹے اور ڈراؤنے خیالوں اور تصوروں نے اُس کے ذہن کو تھکا دیا تھا۔ بار بار منیر اُس کے سامنے آتا تھا۔ اُس نے جب محسوس کرنا شروع کیا کہ کمرے میں کوئی پُراسرار چیز موجود ہے تو اُس کی نظریں کمرے کی نیم تاریک فضا میں یوں بھٹکنے لگیں جیسے کوئی ڈراؤنے سے ویرانے میں یا آسیب زدہ کھنڈروں میں ڈرا سہا ہُوا گھوم پھر رہا ہو۔

اُس کی نظریں اُس روشندان کے شیشے پر جا رُکیں جس سے شعاعیں منعکس ہو رہی تھیں۔ نظریں شیشے پر جم کے رہ گئیں اور یہ چمک اور اُس کی کرنیں پھیلتے پھیلتے آبشار بن گئیں، پھر آبشار کا شور سنائی دینے لگا۔ نسیمہ دیکھتی رہی۔ اچانک ایک آدمی اُوپر سے گرا اور چٹانی ڈھلان سے لڑھکتا وہاں جا گرا جہاں آبشار گر رہی تھی۔ وہ آدمی اُچھلتے اور غرق ہوتے ہوئے سیلاب میں غائب ہو گیا۔

نسیمہ کا جسم بڑی زور سے کانپا۔ اُس نے اپنے کپڑوں کے اندر پسینے کی نمی محسوس کی۔ اُوپر پنکھا آہستہ آہستہ چل رہا تھا۔ نسیمہ نے روشندان کی طرف دیکھا۔ وہاں سے کوئی آبشار نہیں گر رہی تھی۔ نسیمہ کا دل خوف کی گرفت میں آیا ہُوا تھا۔ وہ سوچنے لگی کہ اُس کی آنکھ لگ گئی تھی اور اُس نے خواب دیکھا ہے لیکن اُسے یاد نہیں آ رہا تھا کہ اُس کی آنکھ لگی تھی۔ اُس نے تو آنکھ جھپکی بھی نہیں تھی۔

"یہ وہم تھا"—اُس نے اپنے آپ سے کہا —— "اپنے آپ کو سنبھالو نسیمہ! جو ہونا تھا وہ ہو چکا ہے۔"

اُس کا حوصلہ ذرا مضبوط ہو گیا۔ اُس نے اس امید پر آنکھیں بند کیں کہ نیند آ جائے گی لیکن آنکھیں بند ہوتے ہی پلکوں کی تاریکی میں اُسے منیر کی ماں دکھائی دی۔ وہ سِسک رہی تھی۔ نسیمہ نے آنکھیں کھول دیں۔ اُس کا دل اتنی زور سے دھڑک رہا تھا کہ اُسے یوں محسوس ہُوا جیسے اُس کے دل کی دھک دھک عمر حیات کے کانوں تک پہنچ رہی ہو۔ اُس نے آیت کریمہ کا

ورد شروع کر دیا۔

قتل کے بعد کا ردِ عمل شروع ہو چکا تھا۔ نسیمہ ایک کمزور دل لڑکی تھی۔ نفسیاتی طور پر وہ اتنی توانا نہیں تھی کہ اس ردِ عمل پر قابو پا سکتی۔

◆◆◆

مستانے اور گنجے کے کیس کی پیشی تھی۔ تھانیدار نے مجسٹریٹ کے ریڈر اور پراسیکیوٹنگ سب انسپکٹر سے کہا کہ وہ اس کیس کو فہرست کے آخر میں رکھے کیونکہ آج کا گواہ جو اس کیس کا ستون ہے لاپتہ ہے۔

"جب ہمارے کیس کی باری آئے تو کسی بہانے تاریخ دے دینا" — تھانیدار نے ریڈر اور پی۔ایس۔آئی سے کہا — "میں اسی دوران مستانے سے بات کروں گا۔"

"اب تو تمہیں اُس کے ساتھ کوئی سودا ہی کرنا پڑے گا" — پی۔ایس۔آئی نے تھانیدار سے کہا — "کیا تمہارے اس گواہ منیر کے ملنے کی کوئی اُمید نہیں؟"

"جلدی ملنے کی امید نہیں" — تھانیدار نے جواب دیا — "یہ بھی ضروری نہیں کہ اُسے مستانے کے آدمیوں نے ہی غائب کیا ہو۔ وہ عورتوں کا شکاری تھا۔ یہ شک بھی ہے کہ وہ کسی لڑکی کا شکار کھیلتے کھیلتے خود شکار ہو گیا ہے۔"

"مستانے کو سامنے رکھو" — پی۔ایس۔آئی نے کہا — "اس کی ہسٹری تمہیں مل گئی ہے۔ اس کے ہاتھ لمبے معلوم ہوتے ہیں۔ اسی کو گھیرنے کی کوشش کرو۔ میں جو مدد کر سکتا ہوں مجھے بتانا.... وہ دیکھو، ملزم آ گئے ہیں۔ اُن سے بات کر لو۔"

جیل سے ملزموں کو پولیس لایا کرتی اور عدالت میں پیش کیا کرتی تھی — ملزموں کا متعلقہ تھانیدار کے ساتھ تفتیش والا تعلق ختم سمجھا جاتا تھا۔ بعض پختہ کار ملزم عدالت کے باہر اپنے علاقے کے تھانیداروں کا مذاق اُڑایا کرتے اور عادی مجرم گالیاں بھی دیا کرتے تھے۔

مستانہ اور گنجا ایک ہی ہتھکڑی میں بندھے ہوئے تھے۔ اُن کا ایک ایک ہاتھ آزاد تھا۔ انہیں جب عدالت کے برآمدے کی طرف لایا جا رہا تھا تو

تھانیدار اُن کی طرف گیا اور دونوں سے ہاتھ ملایا۔ اُس نے ان دو کانسٹیبلوں کے ساتھ بھی ہاتھ ملایا جو اُن کے ساتھ تھے۔ ایک نے اُس ہتھکڑی کی زنجیر پکڑ رکھی تھی جس میں مستانہ اور گنجا بندھے ہوئے تھے۔

کچہری کے احاطے میں دو ہوٹل تھے جو آج کل کی بڑی کینٹینوں کی طرح تھے۔ تھانیدار نے کانسٹیبلوں سے کہا کہ وہ اِن دونوں ملزموں کو ہوٹل میں لے چلیں، وہ انہیں اور کانسٹیبلوں کو کھانا کھلانا چاہتا تھا۔

"کیوں داروغے؟" — مستانے نے مسکراتے ہوئے پوچھا — "تیرے گھر کا کھُوا ہے؟"

"چل مستانے!" — تھانیدار نے کہا اور اُس کے کندھے پر بے تکلف دوستوں کی طرح ہاتھ رکھ کر بولا — "تُو میرا دشمن تو نہیں۔ وہ گھر میرا نہیں تھا جہاں تم واردات کرنے گئے تھے۔"

مستانہ اور گنجا گھاگھ وارداتیئے تھے۔ مستانہ عامل جو بنا تھا اور لوگ اُس کے مرید ہو گئے تھے، یہ اُس کے اِس وصف کا ثبوت تھا کہ وہ نفسیات کا علم پڑھے بغیر اس علم کا ماہر تھا۔ پیر، شاہ اور عامل دراصل اسی علم کے ماہر ہوتے ہیں۔ وہ لوگوں کی نفسیاتی کمزوریوں کو سمجھتے ہیں۔ مستانہ تھانیدار کے سلام اور ہوٹل کی دعوت سے سمجھ گیا کہ تھانیدار کسی مشکل میں پھنس گیا ہے۔

"پہلے بتا کام کیا ہے!" — مستانے نے پوچھا۔

"ہاں ملک صاحب!" — مستانے کے ساتھی گنجے نے کہا — "کیوں پیسے ضائع کرتے ہو۔ ہمیں بتا دو کیا بات کرنی ہے۔"

"اوئے گنجے!" — مستانے نے گنجے سے کہا — "تیری ملک (تھانیدار) کے ساتھ کیا رشتہ داری ہے؟ پہلے تُو نے اقبالِ جرم کر کے مجھے بھی پھنسایا ہے، اب تمہیں اس کے پیسے ضائع ہونے کا غم لگ گیا ہے۔ چل اس کا کھانا کھاتے ہیں۔ ملک ہم پر جو پیسے خرچ کرے گا وہ کسی مشتبہ سے پورے کرے گا۔"

تھانیدار نے بڑی زور سے قہقہہ لگایا۔ دونوں کانسٹیبل بھی ہنس پڑے۔ کھانے کی دعوت پر وہ دونوں بہت خوش تھے۔ ان ملزموں کو عدالت کے سوا

کہیں اور لے جانا جُرم تھا۔ یہ ملزم تھانیدار کی تحویل میں نہیں تھے، لیکن وہ تھانیدار تھا، سب انسپکٹر تھا۔ کانسٹیبلوں کی ہمدردی سب انسپکٹر کے ساتھ تھی اور اپنے پیٹ کے ساتھ بھی۔ وہ جانتے تھے کہ پولیس کو جرائم پیشہ لوگوں سے بھی مدد لینی پڑ جاتی ہے اور اِس سب انسپکٹر کو ان ملزموں سے کوئی مطلب آ پڑا ہے۔

وہ سب ہنسی مذاق کرتے ہوٹل میں جا بیٹھے۔ تھانیدار نے کھانے کا خاصا مہنگا آرڈر دیا اور ملزموں پر ایک کرم یہ بھی کیا کہ اُن کی ہتھکڑی کھلوا دی تاکہ وہ آرام سے کھانا کھا سکیں۔ یہ کرم نوازی بھی قانون کے خلاف تھی۔ وہ دونوں تجربہ کار مجرم تھے۔ اُن کے بھاگ نکلنے کا خطرہ تھا۔ تھانیدار نے انہیں ہوٹل کے کونے والی میز پر بٹھایا تھا، اور دونوں ملزموں کو اُس طرف بٹھایا جہاں دو طرف دیوار تھی۔ دونوں کانسٹیبل ان کے ساتھ والی کرسیوں پر بیٹھے اور سامنے والی کُرسی پر تھانیدار بیٹھا۔ اس سے ملزموں کے فرار کا امکان نہ رہا۔

❖

"تمہارا اصل گواہ آگیا ہے؟" — مستانے نے تھانیدار سے منیر کے متعلق پوچھا۔

"تم آنے دو گے تو آجائے گا" — تھانیدار نے کہا — "بھائی مستانے! آ سیدھی سیدھی بات کریں۔ تم اناڑی نہیں ہو۔ پولیس کے ساتھ دشمنی رکھ کر تم اپنے کسب میں نہیں چل سکتے۔"

"ملک بھائی!" — گنجا بولا — "تم بات کرو نا! دیکھو، میں نے اقبالِ جرم کر لیا تھا۔ کہو گے تو کورٹ میں اس پر قائم رہوں گا۔ کہو گے تو پھر جاؤں گا۔ اپنے مطلب کی بات کرو۔"

"مطلب کی بات یہ ہے کہ منیر آج چار پانچ روز ہو گئے ہیں لاپتہ ہے" — تھانیدار نے کہا۔

"اُس کے بغیر تمہارا مقدمہ چوپٹ ہوتا ہے" — مستانے نے کہا — "ہم صاف بری ہو سکتے ہیں۔ موقعہ کا گواہ وہی تھا۔"

"نہ مستانے!" — تھانیدار نے اپنا رُعب رکھنے کے لئے کہا — "یہ

دماغ سے نکال دو کہ موقعہ کا گواہ نہ ہونے سے تم بری ہو جاؤ گے۔ چوکیدار موقعہ کا گواہ ہے۔ پولیس موقعہ کی گواہ ہے۔ ہم نے تمہیں جاتے وقوعہ پر جا کر پکڑا تھا .... اور تم دونوں یہ بھی سن لو کہ میں اب بھی موقعہ کے آدھی درجن جھوٹے گواہ کیس میں ڈال سکتا ہوں۔ تمہارے پچھلے تھانے سے میں نے تمہاری پوری ہسٹری لے لی ہے۔ تمہارے اس یار گنجے کا اقبالِ جُرم موجود ہے جو اِس نے مجسٹریٹ کو قلمبند کرایا تھا۔ یہ اس بیان سے پھرتا ہے تو پھر جائے۔ میرا مقدمہ مضبوط ہے۔"

"پھر تم چاہتے کیا ہو؟" — مستانے نے پوچھا۔

"میں چاہتا یہ ہوں کہ منیر کو برآمد کرا دو" — تھانیدار نے کہا — "اگر اُسے قتل کرا دیا ہے تو لاش برآمد کرا دو۔"

"ملک مختار!" — مستانے نے حیران ہو کر تھانیدار سے کہا — "میں برآمد کرا دوں؟ تمہارا دماغ پھر تو نہیں گیا؟"

"میرا پکا شک تم پر ہے" — تھانیدار نے کہا — "اپنے خلاف یہ مقدمہ کمزور کرنے کے لئے تم نے سب سے بڑے گواہ کو غائب کرا دیا ہے۔ یہ تمہارے کسی آدمی کا کام ہے۔"

"نہ ملک!" — مستانے نے کہا — "باہر میرا ایسا کوئی آدمی نہیں۔ اغوا اور قتل جیسی وارداتیں کرنے والے ہم دو ہی ہیں جو ہتھکڑیوں میں بندھے ہوئے ہیں۔"

"مان لے ملک!" — گنجے نے کہا — "باہر ہمارے آدمی ہیں لیکن وہ چھوٹی موٹی وارداتیں اور زبان کی ہیرا پھیری کرنے والے ہیں۔ وہ تم جانتے ہو، کسی کے یار نہیں ہوتے۔ مستانے کا کاروبار چل رہا تھا تو وہ ہمارے بالکے تھے۔ پیٹ بھر کر روٹی کھاتے تھے۔ چرس کا کش اور شراب کا گھونٹ مل جاتا تھا۔ ہم اندر ہو گئے تو وہ کسی اور کے ہو گئے۔ اُن سے اتنی بڑی واردات نہیں کرائی جا سکتی۔"

"یہ صاف سُن لو ملک مختار!" — مستانے نے کہا — "ہم دونوں نے

قسم کھائی ہے کہ سزا دو سال ملے دس سال ملے، جب جیل سے نکلیں گے منیر کو صاف کر دیں گے۔ اُس کی عمر اتنی ہی رہ گئی ہے جتنی ہمیں سزا ملے گی۔"

"اگر صحیح بات بتا دو تو میں سزا بہت تھوڑی کرا سکتا ہوں" — تھانیدار نے کہا — "مقدمے کی کوئی چُول ڈھیلی کر دوں گا۔ اپیل میں بری ہو جاؤ گے۔"

"مان لو یار!" — ایک کانسٹیبل نے کہا — "تمہارا بھی بھلا ہے، ملک صاحب کا بھی کام ہو جائے گا۔"

"مجھے منیر اپنا مقدمہ مضبوط کرنے کے لئے نہیں چاہیئے" — تھانیدار نے کہا — "میں اُس کی گمشدگی کی رپٹ درج کر بیٹھا ہوں۔ تم جانتے ہو کہ یہ میری ڈیوٹی ہے کہ اس شخص کو زندہ یا مُردہ برآمد کروں۔ اُس کی خواہ لاش ہی ملے۔"

"میں تمہیں کس طرح یقین دلاؤں ملک مختار!" — مستانے نے کہا — "میرا ہاتھ جیل سے باہر نہیں جا سکتا۔"

"دیکھ مستانے!" — تھانیدار نے کہا — "جیل سے باہر آ کر تم شریف آدمی تو نہیں بن جاؤ گے۔ تمہیں اس جُرم میں پھانسی یا عمر قید تو نہیں ملے گی۔ یہی دو چار سال .... یہ سوچو کہ پھر بھی کبھی میرا تمہارا آمنا سامنا ہو گا۔ خدا کی قسم، احسان کی وہ قیمت دوں گا کہ حیران رہ جاؤ گے۔"

"اُس کی گمشدگی کی تفتیش جاری رکھو ملک مختار!" — گنجے نے کہا — "محنت کرو۔ تمہیں کھُرا کھوج مل جائے گا۔ اُس کی گمشدگی میں ہمارا ہاتھ نہیں۔"

تھانیدار نے اپنی چالاکی، زبان اور تجربے کے بہت داؤ آزمائے۔ دونوں کانسٹیبلوں نے بھی دونوں ملزموں کو بہت کچھ کہا لیکن وہ دونوں انکار کرتے رہے۔ اُن کا انکار ایسے انداز کا تھا کہ تھانیدار کو ماننا پڑا کہ منیر کی گمشدگی کے ساتھ ان دونوں کا تعلق نہیں۔ کھانا آ چکا تھا جو وہ کھاتے ہے

"میں تمہاری کچھ مدد کر سکتا ہوں ملک!" — مستانے نے کہا — "ایک راستہ دکھاتا ہوں۔ اِس پہ غور کرو۔ مجھے امید ہے کہ تمہیں کوئی نہ کوئی کھُرا کھوج مل جائے گا۔"

"ملک صاحب!" — ایک کانسٹیبل نے تھانیدار سے کہا — "بہت دیر ہو گئی ہے۔ اُدھر آواز نہ پڑ جائے۔ انہیں عدالت میں ...."

"فکر نہ کرو" — تھانیدار نے کہا — "جب تک میں نہیں جاؤں گا آواز نہیں پڑے گی۔ میں نے بندوبست کر رکھا ہے ... ہاں مستانے! تم کیا کہہ رہے تھے؟"

"تمہارے علاقے میں ایک اور اُستاد بیٹھا ہے" — مستانے نے کہا — "وہ جوگی بنا ہُوا ہے۔ ہندو بھی اُسے مانتے ہیں اور مسلمان بھی اُس کے پاس جاتے ہیں۔ وہ جوگی مہاراج کہلاتا ہے لیکن وہ شاہدرہ دِلّی کے علاقے کا ہسٹری شیٹر ہے۔ اُس کا اصلی نام عبدالحق ہے اور اُس علاقے میں عبدا کے نام سے مشہور تھا۔"

"اُس کا منیر کے ساتھ کیا تعلق ہے؟" — تھانیدار نے پوچھا۔

"وہی تمہیں بتا رہا ہوں" — مستانے نے کہا — "یہ شخص منیر اُس کے پاس جایا کرتا تھا۔ شہر کی ایک عورت میری مرید بنی ہوئی تھی۔ اُس کی بیٹی جس کا نام نسیمہ ہے شہر کے ایک کاروباری آدمی ملک عمر حیات کی بیوی ہے۔ اُن کی شادی کو ابھی پورا ایک سال بھی نہیں ہُوا۔ شاید چار پانچ مہینے ہوتے ہیں۔ میں نے اس لڑکی کو دیکھا ہے۔ ہیروں میں ہیرا ہے ملک بھائی! چُنا ہُوا دانہ ہے.... تمہیں معلوم ہو گا کہ شہر میں ایک گھر میں پتھر پڑتے تھے اور کپڑوں اور نوٹوں کو آگ لگتی تھی۔ وہ یہی گھر تھا۔ ملک عمر حیات اور نسیمہ کا!"

"ہاں ہاں!" — تھانیدار نے کہا — "ملک عمر اُن دِنوں میرے پاس آیا تھا۔ میں نے اُسے چلتا کیا تھا۔"

"وہ پتھر کیسے تھے؟" — مستانے نے کہا — "وہ آگ کیسی تھی؟ کوئی جن بھوت نہیں تھا۔ کسی نے کالا جادو چلایا تھا۔"

"کس نے؟" — تھانیدار نے پوچھا — "تمہیں معلوم ہے؟"

"نہیں" — متانے نے جواب دیا — "میں تمہیں ایک واردات اور چکر بازی سُنا رہا ہوں۔ تھانیدار ہو میرے بھائی! خود غور کر لینا... ملک عمر حیات کی ساس مجھے اُس کے گھر لے گئی تھی۔ میرے وہاں ہوتے پتھر گرے۔ میں تو خاک بھی نہیں جانتا تھا کہ اِس جادو کا توڑ کیا ہوتا ہے۔ میں اِدھر اُدھر کی باتیں بنا کر وہاں سے کھسکا۔ میں ڈرتا تھا کہ کوئی پتھر میرے سر پر ہی نہ آ پڑے ....

"ان لمبی باتوں کو چھوڑو۔ ہُوا یہ کہ ملک عمر حیات کی ساس مجھے کہتی تھی کہ میں ملک عمر حیات کے بچے کو اپنے علم کے زور سے غائب کر دوں۔ یہ بچّہ ملک کی پہلی بیوی سے ہے۔ دراصل ملک کی ساس ملک کی جائیداد کے اس وارث کو غائب کرا رہی تھی۔ چاہتی تھی کہ اُس کی بیٹی کی اولاد جائیداد کی وارث بنے۔ میرے پاس بچّے کو غائب کرنے والا کوئی علم نہیں تھا۔ میں نے اُس پر تو یہی ظاہر کیا کہ میں علم کے زور سے بچّے کو غائب کر دوں گا لیکن میں نے گھنے سے کہا کہ ایک بچّہ اغوا کر کے غائب کرنا ہے۔ اس کے ساتھ میں نے سودا کر لیا لیکن حالات نے بہت بُرا پلٹا کھایا۔ میری اُستادی اُلٹی ہو کر مجھ پر آ پڑی ....

"میں ملک عمر حیات کی بیوی نسیمہ کے جال میں آ گیا۔ اُس نے مجھے ایک رات اپنے گھر بلایا۔ اُس کا پیغام تھا کہ آج رات ملک گھر نہیں۔ میں اس نشے میں چلا گیا کہ وہ بھی ملک کے بچّے کو غائب کرانا چاہتی ہے اس لئے میں آج رات اتنی خوبصورت لڑکی کے ساتھ عیش موج کروں گا مگر میں اُس گھر میں داخل ہُوا تو ملک عمر گھر میں تھا اور وہاں چار پانچ آدمی تھے۔ انہوں نے مجھے مار مار کر میری ہڈیاں توڑ دیں۔ ملک عمر نے مجھے کہا کہ کل شام تک اس شہر سے نکل جاؤ۔ میں شام سے پہلے ہی بھاگ گیا۔ معلوم نہیں اُسے اور اُس کی بیوی کو کس طرح پتہ چل گیا تھا کہ میں نوسر باز ہوں۔ میں ملک کے گھر انتقامی طور پر واردات کرنے گیا تھا۔ شاید میں اُسے قتل کر دیتا ....

"اس سے پہلے ایک اور بات ہوئی۔ ملک عمر کی ساس اس جوگی مہاراج عبدے کے پاس گئی۔ عبدے سے لے اُسے کہا کہ اپنی بیٹی کو ملک عمر حیات سے طلاق دلاؤ ورنہ تمہاری بیٹی کو بہت نقصان ہو گا۔ ملک کی ساس نے اُسے بھی کہا کہ وہ ملک کے بچّے کو غائب کر دے۔ عبدے نے کہا کہ اس کا کوئی فائدہ نہیں، بیٹی کو طلاق دلواؤ ....

"ملک کی ساس نے مجھے بتایا کہ جوگی نے یوں کہا ہے۔ میں نے اپنے آدمی بھیج کر عبدے کو دھمکی بھیجی کہ وہ میری اسامیوں کو خراب نہ کرے۔ میرے آدمیوں نے اُسے ڈرایا دھمکایا۔ میں جانتا تھا وہ کون ہے اور کیا ہے۔ میں نے اُس کی گُف میں اپنے جاسوس بھیجے۔ پتہ چلا کہ عبدا میرے ساتھ ٹکر لینا چاہتا ہے۔ میں نے زبانی زبانی اُس کے کان کھول دیئے ....

"پتہ چلا کہ منیر اُس کے پاس جاتا ہے اور اُسے کہتا ہے کہ ایسا چکر چلاؤ کہ ملک عمر اپنی بیوی کو طلاق دے دے۔ عبدے نے جعلی جوگی بن کر اُس سے خاصی رقم لے لی۔ عبدا کے پاس بھلا کونسا علم تھا۔ وہ منیر سے پیسے لیتا اور اُسے نچاتا رہا .... غور کرو ملک مختار! منیر ملک عمر حیات کی بیوی کو طلاق دلوانا چاہتا تھا۔ صاف بات ہے کہ وہ اس لڑکی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لڑکی بھی منیر کو چاہتی ہو گی ....

"پھر یہ واقعہ ہو گیا کہ ہم ملک عمر حیات کے گھر میں واردات کرنے گئے اور وہاں منیر پہنچ گیا۔ تم نے بھی مان لیا کہ وہ ہمیں پکڑنے کے لئے اندر آیا تھا۔ ذرا سوچو ملک مختار! اُس نے ہمیں دیوار پر چڑھتے دیکھا تھا تو وہیں کیوں نہ پکڑ لیا؟"

"وہ ہمیں اندر موقعہ پر پکڑنا چاہتا تھا" — تھانیدار نے کہا۔

"وہ ہمیں پکڑنے آیا ہی نہیں تھا" — متانے نے کہا — "وہ کسی اور چکر میں ملک عمر کے گھر میں پہلے ہی موجود تھا لیکن ملک کو معلوم نہیں تھا وہ منیر کو ہمارا ساتھی سمجھ رہا تھا۔ اُس کے کہنے پر ملک کمرے سے باہر نہیں آ رہا تھا۔ مجھے شک ہے کہ منیر ملک عمر کی بیوی کی خاطر وہاں گیا تھا یا وہ کوئی

واردات کرنے گیا تھا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ منیر ٹھیک آدمی نہیں۔ وہ اپنی چکر بازی کا شکار ہو گیا ہے ....عبدے کو پکڑو۔ اُس کے ساتھ منیر کا کوئی حساب کتاب چل رہا تھا۔"

تھانیدار مایوس ہو گیا۔ اُسے صرف اشارہ سا ملا لیکن اس سے اُسے خوشی نہ ہوئی۔ اُسے توقع تھی کہ مستانہ اُس کا مسئلہ حل کر دے گا۔ اُس نے کانسٹیبلوں کو اشارہ کیا کہ ملزموں کو ہتھکڑی لگا لیں، پھر اُس نے بل ادا کیا اور عدالت میں جا کر پی۔ ایس۔ آئی سے کہا کہ وہ تاریخ لے لے۔

◆◆◆

تھانیدار اپنے تھانے میں واپس آیا تو حسنین کاظمی کے گاؤں کا نمبردار آیا بیٹھا تھا۔ تھانیدار نے منیر کی گمشدگی کی جو اطلاع نمبرداروں کو بھیجی تھی، اس میں اُس نے یہ بھی بتایا کہ منیر کس روز لاپتہ ہُوا ہے۔ دن اور تاریخ کے علاوہ اُس نے یہ بھی بتایا تھا کہ اُس روز بہت مینہ برسا تھا۔

"جناب عالی!"— نمبردار نے تھانیدار کو بتایا —"اُس روز منیر میرے گاؤں میں آیا تھا۔ میں نے جناب کی اطلاع ملتے ہی گاؤں میں پوچھنا شروع کر دیا تھا۔ آج صبح ایک آدمی نے بتایا کہ وہ تو کاظمی صاحب کے گھر آیا تھا اور بارش میں گاؤں سے گیا تھا۔ اس آدمی نے اُسے کاظمی صاحب کے گھر سے بڑی تیز بارش میں نکلتے اور گھوڑے پر سوار ہو کر جاتے دیکھا تھا۔"

"کاظمی صاحب کون ہے؟"— تھانیدار نے پوچھا۔

"میں انہیں ساتھ لایا ہوں"— نمبردار نے جواب دیا —"عالم فاضل ہیں۔ ہر کسی کے دُکھ دَرد میں شریک ہوتے ہیں۔ ان کی اپنی اولاد نہیں۔ گاؤں میں ہر کسی کو اپنا بچہ سمجھتے ہیں۔ کسی کو کوئی مشکل پیش آ جاتے، کوئی مسئلہ آ پڑے تو وہ کاظمی صاحب کے پاس جاتا ہے۔ مجھے جب پتہ چلا کہ گمشدہ آدمی ان کے پاس آیا تھا تو میں نے ان سے پوچھا۔ انہوں نے کہا کہ آیا تھا۔ میں نے انہیں کہا کہ آپ کو تھانے سے بلاوا آئے گا تو یہ کہنے لگے کہ میں بلاوے کے بغیر چلا چلتا ہوں۔ آپ حضور، یوں سمجھ لیں کہ انہیں میں تھانے نہیں لایا بلکہ یہ

مجھے لاتے ہیں"

"انہیں اندر بھیج دو"— تھانیدار نے نمبردار سے کہا —"اور تم باہر بیٹھو"

حسنین کاظمی کو اپنے کمرے میں داخل ہوتے دیکھ کر تھانیدار اُٹھ کھڑا ہُوا، اُس سے ہاتھ ملایا اور اُسے بیٹھنے کو کہا۔

"اُس لڑکے کا کوئی سراغ نہیں ملا؟"— حسنین کاظمی نے پوچھا۔

"ابھی تک تو نہیں ملا"— تھانیدار نے جواب دیا اور پوچھا —"آپ کو اس کی گمشدگی کا پتہ کب چلا تھا؟"

"شاید دوسرے ہی دن پتہ چل گیا تھا"— حسنین کاظمی نے کہا —"میں شہر آتا رہتا ہوں"

"وہ آپ کے پاس کس وقت گیا تھا؟"— تھانیدار نے پوچھا —"کیوں گیا تھا؟ کیا آپ ساری بات خود ہی بتائیں گے؟"

"اس سوال کا جواب کہ وہ میرے پاس کیوں آیا تھا، بڑا لمبا ہے"— حسنین کاظمی نے کہا —"اس قسم کے آدمی کے ساتھ میرا کوئی تعلق نہیں ہونا چاہیئے .... میری عمر اتنی زیادہ ہو گئی ہے لیکن میں پہلی بار تھانے میں آیا ہوں۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں کہ پولیس والوں کے ساتھ بات کس طرح کی جاتی ہے اور تفتیش کیسے ہوتی ہے۔ کیا آپ مجھ سے سوال کریں گے؟"

"آپ جو کچھ جانتے ہیں وہ مجھے بتائیں گے"— تھانیدار نے کہا —"اور میں اپنی ضرورت کے مطابق سوال بھی کروں گا۔ مثلاً آپ نے کہا ہے کہ اس قسم کے آدمی کے ساتھ آپ کا تعلق نہیں ہونا چاہیئے، پھر بھی وہ آپ کے ہاں گیا۔ آپ یہ بتائیں کہ وہ کس قسم کا آدمی ہے؟"

"بدطینت ہے"— حسنین کاظمی نے کہا —"انسانوں کو در پردہ نقصان پہنچانے والا شیطان ہوتا ہے۔ آپ تو صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ وہ گیا کہاں! میں آپ کو اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا۔ اس شخص کے متعلق میں آپ کو بہت کچھ بتا سکتا ہوں۔ اس سے آپ کو شاید یہ اندازہ ہو جائے گا کہ اس قسم

کے آدمی کا انجام کیا ہو سکتا ہے۔ وہ ایک شریف گھرانے کو پریشان کر رہا تھا اور ایک شریف اور باعصمت لڑکی کے پیچھے پڑا ہُوا تھا۔"

"وہ کون لوگ ہیں؟"

"آپ ملک عمر حیات کو جانتے ہوں گے"— حسنین کاظمی نے جواب دیا — "میں اُسے اور اُس کی بیوی کو ذاتی طور پر جانتا ہوں۔ یہ میاں بیوی اُن لوگوں میں سے ہیں جو شیطان فطرت انسانوں کا شکار ہو جایا کرتے ہیں۔"

"ملک عمر حیات کو میں بڑی اچھی طرح جانتا ہوں"— تھانیدار نے کہا۔

"آپ پھر یہ بھی جانتے ہوں گے کہ کچھ دن پہلے تک ان کے گھر ...."

"پتھر گرتے رہے ہیں اور کپڑوں کو آگ لگتی رہی ہے"— تھانیدار نے حسنین کاظمی کا فقرہ پورا کر دیا — "پھر کیا ہُوا؟"

"یہ اِسی منیر کی کارستانی تھی"— حسنین کاظمی نے کہا — "اس نے میرے پیر اُستاد سے کالے تعویذ کروائے تھے۔ یہ مجھے اُس وقت معلوم ہُوا تھا جب اِن تعویذوں کی معیاد ختم ہونے والی تھی۔ اِن لوگوں نے مجھے اپنے گھر بلایا تھا۔ میں نے انہیں بتایا تھا کہ یہ کوئی جن نہیں نہ کوئی بد رُوح ہے، یہ کالا علم ہے۔ میں نے اِس کی بندش کر دی تھی۔"

"آپ نے؟"— تھانیدار نے حیران سا ہو کے پوچھا — "کیا آپ اس علم سے واقف ہیں؟"

"یہ میرا شوق ہے"— حسنین کاظمی نے جواب دیا — "کاروبار نہیں۔"

حسنین کاظمی نے تھانیدار کو تفصیل سے بتایا کہ وہ ملک عمر حیات کے گھر کو سفلی عمل سے محفوظ کرنے کے لئے اپنے اُستاد خواجہ صاحب کے پاس گیا تھا۔ وہاں پتہ چلا تھا کہ یہ عمل منیر نے کرایا تھا اور یہ بھی کہ عمل کی معیاد پوری ہو چکی ہے۔

"اچھے اُستاد ہیں آپ کے!"— تھانیدار نے کہا — "وہ اتنا خطرناک عمل کرتے ہیں۔"

"آپ نے ایک بات پر غور نہیں کیا"— حسنین کاظمی نے کہا — "اِس گھر میں پتھر گرتے رہے لیکن کبھی بھی پتھر کسی انسان کو نہیں لگا اور کپڑوں کو آگ لگتی رہی، گھر کو آگ نہیں لگی۔ اگر اس گھر میں لوگوں کا ہجوم ہوتا تو بھی پتھر آتے لیکن لوگوں سے دُور گرتے۔ میرے اُستاد نے پیسے ضرور کمائے ہیں، کسی انسان کو نقصان نہیں پہنچایا۔"

"منیر نے یہ عمل کیوں کرایا تھا؟"

"ملک عمر کی بیوی کو ڈرا کر پھانسنے کے لئے"— حسنین کاظمی نے کہا — "عجیب احمق آدمی ہے۔ مجھے تو معلوم نہیں کہ اُس نے کیا سوچا تھا۔ بعد میں اُس نے کہا کہ ایسا عمل کرو کہ ملک عمر حیات مر جائے یا اُس میں ایسا جسمانی نقص پیدا ہو جائے کہ اُس کی بیوی اُس سے طلاق لے لے۔ خواجہ صاحب نے انکار کر دیا اور اسے ٹالنے کے لئے میرے حوالے کر دیا۔ میں اسے چکر دے رہا تھا۔"

"کیا ملک عمر حیات کو معلوم ہے کہ منیر نے اُن کے خلاف یہ کارروائی کرائی تھی؟"

"نہیں"— حسنین کاظمی نے جواب دیا — "میں نے انہیں نہیں بتایا نہ بتاؤں گا۔"

"میرا خیال تھا کہ ملک عمر کو معلوم ہو گا اور اُس نے انتقامی طور پر منیر کو غائب کرا دیا ہے"— تھانیدار نے کہا۔

"ملک عمر حیات ایسا آدمی نہیں"— حسنین کاظمی نے کہا — "لیکن اُسے تو معلوم ہی نہیں۔ آج کل تو اُن کی دوستی تھی۔ منیر نے ملک عمر کے گھر کو ڈاکوؤں سے بچایا ہے .... منیر بارش والے دن میرے گھر آیا تھا"— حسنین کاظمی نے فوٹو والی بات گول کر دی اور نسیمہ کا پردہ رکھنے کے لئے جھوٹ بولا — "وہ اسی کام کے لئے آیا تھا کہ ملک عمر حیات کا کام تمام کر دو۔ میں نے اُسے صاف جواب دے دیا اور کہا کہ آئندہ وہ میرے پاس نہ آیا کرے۔"

وہ بارش میں ہی میرے گھر سے نکل آیا تھا۔ وہ غصے میں تھا۔"

"اگر آپ کے ہاتھ میں یہ علم ہے تو کیا آپ یہ معلوم نہیں کر سکتے وہ کہاں ہے؟" ــــ تھانیدار نے پوچھا۔

"یہ کسی تجربہ کار اُستاد کا کام ہے" ــــ حسنین کاظمی نے جواب دیا ــــ "میں تو شوقیہ اِس علم کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔ ایک اور بات آپ کو بتا دوں۔ میرے پیر اُستاد خواجہ صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ اس شخص کا انجام بہت بُرا ہوگا۔ یہ قتل ہو جائے گا۔ اگر زندہ رہا تو اس کی باقی عمر اپاہجوں کی طرح گزرے گی۔ وہ جسمانی لحاظ سے بیکار ہو جائے گا۔ ہو سکتا ہے پاگل ہو جائے .... میرا خیال ہے کہ اُس کا انجام شروع ہو چکا ہے۔"

"اُس نے خودکشی نہ کر لی ہو" ــــ تھانیدار نے کہا ــــ "کیا وہ اس لڑکی کو شادی سے پہلے کا چاہتا ہے؟"

"یہ شخص اُس محبت کو نہیں سمجھتا جس کی ناکامی پر لوگ خودکشی کر لیا کرتے ہیں" ــــ حسنین کاظمی نے کہا ــــ "اکلوتا ہونے کی وجہ سے ماں باپ نے اس کا دماغ خراب کر رکھا ہے۔ بچپن میں وہ کھلونوں سے کھیلتا تھا، جوان ہو کر وہ جوان لڑکیوں کو کھلونے سمجھتا ہے۔ اگر آپ میری رائے پوچھتے ہیں تو میں کہوں گا کہ اُس نے کسی اور گھر پر اپنی شیطانیت چلائی ہو گی اور اُن لوگوں نے انتقامی کارروائی کی ہے۔"

تھانیدار حسنین کاظمی سے بہت متاثر ہوا۔ اُس کے بولنے کا انداز ایسا تھا کہ اُس کی ہر بات دل میں اُتر جاتی تھی۔ اُس کی شخصیت میں بھی ایسا ہی تاثر تھا۔

"میں ملک عمر حیات اور اُس کی بیوی کو بھی تھانے بلاؤں گا" ــــ تھانیدار نے کہا ــــ "شاید اُن سے کوئی بات معلوم ہو جائے۔"

"آپ کا وقت ضائع ہوگا" ــــ حسنین کاظمی نے کہا ــــ "وہ دونوں جوابی وار کرنے کی ہمت نہیں رکھتے .... میری نیت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ میں نے پورے خلوص سے آپ کو اس گمشدہ شخص کے متعلق بتا دیا ہے کہ کیسا

آدمی ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ دو تین ہندو لڑکیوں کے ساتھ بھی اُس کے تعلقات ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ ہندو مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے موقعے ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ آپ اُن لڑکیوں کا اتا پتہ معلوم کریں۔"

"کبھی نہیں کروں گا" ــــ تھانیدار نے جھنجھلا کر کہا ــــ "ہر طرف ہندوؤں کا اثر و رسوخ چلتا ہے۔ میں اُن کی لڑکیوں کو تھانے بلا کر اپنی سروس کیوں خراب کروں؟ مجھے اِس بدبخت کی گمشدگی کی اطلاع ملی ہے، قتل کی نہیں۔ مجھے تو یہ خیال بھی آتا ہے کہ کہیں خود ہی غائب ہو گیا ہے۔ مسئلہ جو مجھے تفتیش جاری رکھنے پر مجبور کرتا ہے یہ ہے کہ وہ گھوڑے پر گھر سے نکلا تھا اور گھوڑا اُس کے بغیر واپس آیا .... کاظمی صاحب! ایک کرم کریں۔ آپ اپنے جن پیر اُستاد کا ذکر کرتے ہیں، انہیں کہیں کہ اپنے علم کے ذریعے معلوم کریں کہ وہ کہاں ہے۔ میں نے سُنا ہے کہ بعض عامل گمشدہ آدمی کا اتا پتہ بتا دیتے ہیں۔"

"میں اُن کے پاس جاؤں گا" ــــ حسنین کاظمی نے کہا ــــ "اگر اُن کے اختیار میں ہُوا تو وہ بتا دیں گے .... میں خود ہی آپ کے پاس آجاؤں گا۔"

نسیمہ گھر میں حسبِ معمول اکیلی تھی۔ اُس کے ذہن میں جو کشمکش شروع ہو گئی تھی وہ بڑھتی جا رہی تھی۔ اسے یقین نہیں آ رہا تھا کہ منیر مر گیا ہے۔ وہ اپنے آپ کو یقین دلاتی رہتی تھی کہ اتنی بلند جگہ سے نوکیلی چٹانوں پر گر کر وہ زندہ نہیں رہ سکتا تھا۔ اگر زندہ رہا بھی تھا تو سیلاب کی اتنی خوفناک لہروں نے اُسے مار دیا ہوگا، مگر اُس کی اپنی ذات سے آواز آتی تھی کہ منیر زندہ ہے اور آجائے گا۔

"کوئی نہیں مانے گا کہ میں نے اُسے وہاں سے گرایا تھا" ــــ وہ اپنے آپ کو حوصلہ دیتی ــــ "کسی کو معلوم نہیں کہ میں خانقاہ پہ گئی تھی اور بارش میں واپس آئی تھی۔"

"تمہاری نوکرانی کو معلوم ہے" ــــ یہ خیال اُس کے پاؤں اکھاڑ دیتا ــــ

"نوکرانی سے کسی نے پوچھا تو وہ بتا دے گی کہ جس روز منیر لاپتہ ہُوا اُس روز میں کہیں باہر گئی تھی۔"

وہ سٹپٹا جاتی۔ اُس روز بھی وہ اسی کیفیت میں تھی جب حسنین کاظمی آگیا۔ نسیمہ کو یوں سکون ملا جیسے اُسے تنکے کا سہارا مل گیا ہو اور وہ ڈوبنے سے بچ گئی ہو۔

"میں تھانے سے آرہا ہوں" — حسنین کاظمی نے کہا اور اُسے بتایا کہ وہ تھانے کیوں گیا تھا۔ اس نے نسیمہ کو ہر وہ بات بتائی جو اُس نے تھانیدار کے ساتھ کی تھی۔

"کاظمی صاحب!" — نسیمہ کے مُنہ سے گھبرائی ہوئی آواز نکلی — "یہ آپ نے کیا کیا ہے؟ وہ تو ملک صاحب کو تھانے بلائیں گے۔ مجھے بھی بُلا سکتے ہیں۔"

"مت ڈرو نسیمہ!" — حسنین کاظمی نے کہا — "میں نے فولڈا کا ذکر نہیں کیا اور اُسے یہ نہیں بتایا کہ شادی سے پہلے اُس کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق تھا۔ تم نہیں سمجھتیں نسیمہ! تھانیدار کو کسی اور ذریعے سے بھی پتہ چل سکتا تھا کہ منیر کے ساتھ تمہارا کوئی تعلق تھا۔ اُس صورت میں تھانیدار تم سے پوچھ گچھ کرتا تو نہ جانے کیا پوچھتا اور تمہارے مُنہ سے کوئی ایسی بات نکل جاتی جو تمہاری رسوائی کا باعث بن سکتی تھی۔ میں نے اُس کا ذہن صاف کر دیا ہے۔"

"لیکن میرے ذہن سے آپ پولیس کا خوف کس طرح نکالیں گے؟" — نسیمہ نے پوچھا۔

"تمہارے ذہن میں خوف ہونا ہی نہیں چاہیئے" — حسنین کاظمی نے کہا — "اُسے تم نے یا ملک صاحب نے غائب نہیں کیا۔ سچے آدمی بے خوف ہُوا کرتے ہیں۔ میری بات غور سے سنو۔ اگر کبھی تھانیدار اِدھر آ ہی نکلے اور تم سے کچھ پوچھ بیٹھے تو اُسے وہی جواب دینا جو میں اُسے بتا چکا ہوں۔ مثلاً وہ تم سے پوچھے کہ شادی سے پہلے منیر کے ساتھ تمہارا میل جول تھا تو صاف انکار کر دینا۔ کہنا کہ اُس کے ساتھ تمہاری کبھی رسمی سی بات بھی نہیں ہوتی۔ وہ پوچھے کہ تمہیں معلوم ہے کہ منیر نے تمہارے گھر پہ کالے تعویذ کرائے تھے تو کہنا کہ تمہیں معلوم نہیں۔ وہ پوچھے کہ تمہیں معلوم ہے کہ تمہارے پیچھے پڑا ہُوا تھا؟ کہنا کہ تمہیں معلوم نہیں۔"

حسنین کاظمی نے اُسے اچھی طرح سمجھا دیا کہ وہ کیا کہے اور کیا نہ کہے۔ نسیمہ ہاں میں ہاں ملاتی رہی اور اُس کے دل پر خوف اور گھبراہٹ کی گرفت پہلے سے زیادہ مضبوط ہوتی گئی۔

حسنین کاظمی اُسے تسلی دلاسہ دے کر چلا گیا لیکن نسیمہ تسلیوں کی دُنیا سے بہت آگے نکل گئی تھی۔ اپنے آپ پہ قابو رکھنا اُس کے لئے ناممکن ہو گیا تھا۔

حسنین کاظمی کے جانے کے تھوڑی دیر بعد جیراں بہشتن آگئی۔ اُسے دیکھ کر نسیمہ جیسے جل اُٹھی ہو۔

"کہاں گیا خصم تمہارا؟" — نسیمہ نے غصّے سے بے قابو ہو کر اُسے کہا — "اُسے تجھ جیسی بدکار عورتوں نے کہیں گم کر دیا ہے۔"

"کیا تمہیں اُس کے گم ہو جانے کا افسوس نہیں؟" — جیراں نے بڑے تحمل سے پوچھا۔

"میری جُوتی کو بھی افسوس نہیں" — نسیمہ نے کہا — "میں تو اس خبر کا انتظار کر رہی ہوں کہ اُس بدکار کی لاش ملے۔"

جیراں نے آہ بھری اور چارپائی پر بیٹھ گئی۔

"نسیمہ بی بی!" — جیراں نے کہا — "میں بھی تمہاری طرح خوش ہوں اور اُس روز تو میں بہت ہی خوش ہوں گی جس روز پتہ چلے گا کہ یہ نامراد قتل ہو گیا ہے۔"

"پھر تم کیا کرو گی؟" — نسیمہ نے طنزیہ لہجے میں پوچھا — "یہی تو تمہاری روزی کا ذریعہ تھا۔"

"مجبوری تھی نسیمہ بی بی!" — جیراں نے رنجیدہ سے لہجے میں کہا — "یہ باتیں صرف تمہارے ساتھ کر سکتی ہوں .... تمہیں معلوم ہے میری اپنی بیٹی جوان ہے۔ منیر اکافر اُس پہ بُری نظر رکھتا تھا۔ میں نے اُسے کہا تھا

کہ جس عورت کے پاس مجھے پیغام دے کر بھیجو گے، جاؤں گی خواہ مجھے وہاں سے جُوتے ہی پڑیں۔ میں نے اُسے یہ بھی کہا کہ مجھے ایک پیسہ نہ دینا، میری شرط صرف یہ ہے کہ میری بیٹی سے دُور رہنا بس یہ میری مجبوری تھی نسیمہ بی بی!"

"اب کیا لینے آئی ہو؟" — نسیمہ نے پوچھا۔

"ایک تو تمہیں یہ بتانے آئی ہوں کہ تم اگر خدا کی لاٹھی کو نہیں مانتیں تو اب مان لو" — جیراں نے کہا — "میں جانتی ہوں کہ تم اپنی عزت کو عزیز رکھنے والی لڑکی ہو، لیکن یہ مردُود تمہاری عزت کے پیچھے پڑا ہُوا تھا۔ اُس نے تمہیں بڑی خطرناک دھمکی دی تھی۔ تم نے جب کہا تھا کہ تم اُس کے باغ والے کمرے میں جاؤ گی تو میں دیکھ رہی تھی کہ تمہارے دل پر کیا گزر رہی تھی۔ خدا کی قسم، نسیمہ بی بی! اپنے اللہ پہ یقین کرنا، میں جب تمہارے گھر سے نکلی تھی تو میں نے راستے میں اپنے دل میں کہا تھا کہ خدایا، اس ناپاک بندے کو اپنا آپ دکھا دے۔ دیکھو نسیمہ بی بی! میں ایک جوان بیٹی کی ماں ہوں۔ وہ بھی تم جیسی ہے۔ میں غریب عورت ہوں۔ غریب کا تو یہ لوگ دین ایمان بھی قائم نہیں رہنے دیتے، لیکن غریب کی آہوں کو تو کوئی نہیں روک سکتا۔ اس چھوٹے چوہدری کو اگر تمہاری نہیں تو میری آہ کھا گئی ہے۔"

نسیمہ کا غصہ سرد پڑ گیا۔ وہ کچھ دیر جیراں کے مُنہ کی طرف دیکھتی رہی۔ دیکھتے ہی دیکھتے جیراں کی آنکھوں میں آنسو اُمڈ آئے۔

"میں تمہاری مجبوری سمجھ گئی ہوں جیراں!" — نسیمہ نے کہا — "یہ خیال رکھنا کہ ایسی باتیں کسی اور سے نہ کرنا .... کچھ پیسے چاہئیں تو مجھ سے لے لینا۔ جب کبھی ضرورت پڑے تو میرے پاس آجانا۔"

"پیسہ ہی سب کچھ نہیں ہوتا بی بی!" — جیراں نے آہ بھر کر کہا — "یہی بات جو تم نے مجھے کہی ہے کہ یہ باتیں کسی اور سے نہ کروں یہ میں تمہیں کہنے آئی تھی" — جیراں نے ہاتھ جوڑے اور منت کے لہجے میں کہا — "کسی کو نہ بتانا کہ میں اُس کے یہ کام کرتی رہی ہوں۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ پولیس مجھے گھسیٹتی پھرے۔ مجھے اپنا نہیں، اپنی بیٹی کا غم ہے۔"

"تم فکر نہ کرو جیراں!" — نسیمہ نے ہمدردی کے لہجے میں کہا — "تم نے میری عزت کا خیال رکھا ہے تو میں تمہاری بیٹی کی عزت کا خیال رکھوں گی .... لیکن ایک بات بتاؤ جیراں! وہ گیا کہاں ہے؟"

"مجھے ہندوؤں پر شک ہے" — جیراں نے کہا — "اُنہوں نے اپنی ایک لڑکی کو منیر کے باغ سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔ مجھے تو یہی شک ہے کہ وہ کہیں باہر نکلا اور ہندو اُس کی ٹوہ میں رہے۔ اوپر سے بارش آگئی۔ ہندوؤں نے اُسے مار کر لاش نالے یا دریا میں بہا دی ہوگی۔"

اِدھر اُدھر کی چند اور باتیں کر کے جیراں چل پڑی۔ دروازے میں رُکی اور واپس آگئی۔

"نسیمہ بی بی!" — اُس نے نسیمہ کے قریب آکر سرگوشی میں پوچھا — "اپنی ماں کے ساتھ ابھی تک ناراضگی چل رہی ہے؟"

"ہاں جیراں!" — نسیمہ نے کہا — "نہ وہ آتی ہے نہ میں جاتی ہوں۔"

"کہنے کو تو جی تو نہیں چاہتا، وہ تمہاری ماں ہے" — جیراں نے کہا — "لیکن مجھے تم عزیز ہو۔ جو بات سُنی ہے وہ تمہیں بتا دیتی ہوں۔ میں نے سُنا ہے کہ تمہاری ماں نے کہا ہے کہ منیر کو ملک عمر نے قتل کروا دیا ہے اور نسیمہ کا بھی اس میں ہاتھ ہے۔ سُنا ہے وہ کہتی ہے کہ میں پولیس تک یہ بات پہنچاؤں گی اور ان دونوں کو پھانسی کے تختے تک پہنچاؤں گی .... ہے تو تمہاری ماں لیکن اُس سے بچ کے رہنا۔ مجھے جو بھی بات پتہ چلی میں اُسی وقت تمہیں بتا دوں گی۔"

جیراں تو چلی گئی، لیکن نسیمہ کی یہ حالت ہوگئی جیسے اُس کے جسم سے جان بھی جیراں کے ساتھ چلی گئی ہو۔ اُسے چکر سا آیا اور وہ پاس پڑی ہوئی چارپائی پر یوں بیٹھی جیسے گر پڑی ہو۔

مستانے نے قصبے کے تھانیدار سب انسپکٹر ملک مختار کو اُس جوگی کے متعلق بتایا تھا جسے منیر نے نسیمہ کو ملک عمر حیات سے طلاق دلوانے کے لئے استعمال کیا تھا۔ مستانے نے بتایا تھا کہ وہ جوگی نہیں اور وہ ہندو بھی نہیں، وہ شاہدرہ دِلی کے علاقے کا ہسٹری شیٹر جرائم پیشہ ہے اور اُس کا اصلی نام عبدالحق عرف عبدا ہے۔

منیر کی گمشدگی کی تفتیش میں تھانیدار اتنا سنجیدہ نہیں تھا جتنا اُسے ہونا چاہیئے تھا۔ ہر کسی سے اور ہر مخبر سے اُسے یہی رپورٹ ملتی تھی کہ منیر اوچھا اور گھٹیا قسم کا بدمعاش تھا۔ دو آدمیوں نے تو اُسے یہ بھی کہا تھا کہ اُسے کسی نے اغوا نہیں کیا نہ وہ قتل ہُوا ہے، اُس نے اپنے ماں باپ سے اپنی کوئی ضِد منوانے کے لئے ڈرامہ کھیلا ہے۔ خود ہی واپس آجائے گا، لیکن تھانیدار نے اُس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کر کے اپنے لئے مشکل پیدا کر لی تھی۔ اُسے روزنامچے اور کیس کی فائل کا پیٹ بھرنے کے لئے کچھ نہ کچھ کارروائی تو کرنی ہی تھی۔

مستانے نے اُس جعلی جوگی کی نشاندہی کی تو تھانیدار نے ایک رات اُس کے ٹھکانے پر ایک تو اس لئے چھاپہ مارا کہ ہو سکتا ہے منیر کا کوئی سراغ یا اشارہ مل جائے، اور زیادہ تر اس لئے کہ عبدا جوگی جرائم پیشہ تھا اور اُس نے بھروپ دھار رکھا تھا۔ اس قسم کے جرائم پیشہ افراد کو اپنی نظر میں رکھنا تھانیداروں کے لئے ضروری ہوتا ہے اور اس قسم کے جرائم پیشہ لوگوں سے بعض تھانیدار فائدے بھی اُٹھاتے تھے۔

وہ بڑی دُور تک گیا ہُوا مٹی کا ایک ٹیلہ تھا جس میں کمرے کی طرح ایک خود ساختہ گُف تھی۔ تھانیدار رات کو وہاں گیا تو چار جوگی اکٹھے بیٹھے تھے۔ ایک کے ہاتھ میں حقّے کی لٹوپی تھی۔ اس کے نیچے کپڑا لپٹا ہُوا تھا۔ لٹوپی سے

دُھواں اُٹھ رہا تھا۔ گُف چرس کی بدبُو سے بھری ہوئی تھی۔ تھانیدار اور چار کانسٹیبلوں کو دیکھ کر چاروں جوگی جیسے مر گئے ہوں۔

"جوگی مہاراج کون ہیں؟" — تھانیدار نے پوچھا۔

جوگیوں نے اپنے ایک ساتھی کی طرف دیکھا۔

"ذرا باہر آجاؤ جوگی مہاراج!" — تھانیدار نے کہا۔

وہ جوگی گُف سے باہر نکل آیا۔ تھانیدار اُسے بازو سے پکڑ کر پرے لے گیا۔

"شاہدرہ کب چھوڑا تھا؟" — تھانیدار نے پوچھا۔

"مدت ہوئی" — جوگی نے جواب دیا۔

"تم عبدالحق عرف عبدا ہو نا!" — تھانیدار نے کہا — "سچ بولو گے تو پردے میں رہنے دوں گا۔"

"جھوٹ نہیں بولوں گا حضور!" — جوگی نے کہا — "میں عبدا ہوں.... مفرور نہیں ہوں۔ سزا کاٹ کر وہاں سے نکلا تھا۔"

"کتنی سزائیں کاٹ چکے ہو؟"

"تین!"

"کیا کرتے تھے؟"

"رہزنی۔"

"اب؟"

"آپ دیکھ رہے ہیں" — عبدے نے جواب دیا — "ادھر آکر کوئی واردات نہیں کی۔ جوگی مہاراج بن گیا ہوں۔ تین چار جڑی بوٹیاں ہاتھ آگئی ہیں۔ یہ لوگوں کو دیتا ہوں اور چار پیسے کما لیتا ہوں۔"

"اور نوسر بازی چلتی ہے" — تھانیدار نے کہا — "لوگوں کو لُوٹتے ہو۔"

"خادم ہوں حضور!" — عبدے نے کہا — "پچھلی غیر حاضریاں معاف کر دیں۔ اب باقاعدہ حاضری دیا کروں گا۔"

"یہ سب کون ہیں؟"

"حضور کے خادم ہیں"۔۔۔ عبدے نے کہا ۔۔۔ "کوئی واردات نہیں کرتے ۔۔۔۔ حکم حضور!"

"تھانے چلو"۔۔۔ تھانیدار نے کہا۔

"کوئی گڑبڑ ہے؟"

"ایک آدمی لاپتہ ہو گیا ہے"۔۔۔ تھانیدار نے کہا ۔۔۔ "منیر ۔۔۔۔ چوہدری منیر کہلاتا ہے ۔۔۔۔ جانتے ہو اُسے؟"

"جانتا ہوں"۔۔۔ عبدے نے کہا ۔۔۔ "یہیں بیان ہو جاتے تو ٹھیک نہیں؟"

"گھبراؤ نہیں"۔۔۔ تھانیدار نے کہا ۔۔۔ "پکڑوں گا نہیں ۔۔۔۔ چلو ۔۔۔۔ مال لیتے آنا۔"

عبدا گُف میں گیا اور واپس آکر تھانیدار کے ساتھ چل پڑا۔ اُس کا ایک ہاتھ تھانیدار کے ہاتھ میں چلا گیا پھر تھانیدار کا ہاتھ اپنی جیب میں چلا گیا۔

◆◆◆

"منیر کے ساتھ تمہارا کیا تعلق ہے؟"۔۔۔ تھانے میں لے جا کر تھانیدار نے عبدے سے پوچھا۔

"میرا گاہک تھا"۔۔۔ عبدے نے جواب دیا ۔۔۔ "گاہک کہہ لیں شکار کہہ لیں۔ وہ مجھے جوگی مہاراج ہی سمجھ کر میرے پاس آیا تھا۔ اُسے کسی نے بتایا تھا کہ میرے ہاتھ میں ایک علم ہے جس سے ناممکن کام بھی ہو جایا کرتے ہیں۔ منیر ایک شادی شدہ لڑکی کو طلاق دلا کر اُس کے ساتھ شادی کرنا چاہتا تھا۔ اس لڑکی کی شادی ہوئے کچھ دن ہی گزرے تھے۔ میرے ہاتھ میں کوئی ایسا علم نہیں تھا۔ مجھے اپنی اُستادی دکھانی تھی ۔۔۔۔

"منیر سے میں نے کچھ باتیں پوچھیں۔ اُس نے ہر ایک بات بتانے کی خاطر مجھے یہ بھی بتا دیا کہ اس لڑکی کے گھر میں یعنی اُس کے خاوند کے گھر میں ایک دو

دِنوں کے وقفے سے پتھر گرتے ہیں اور کپڑوں کو آگ لگتی ہے۔ میں نے اپنے ایک آدمی سے کہا کہ وہ اس لڑکی کے گھر جائے اور اس کے خاوند سے یا محلے کے کسی آدمی سے کہے کہ یہ لوگ اگر ایک جوگی بابا کے پاس جائیں تو وہ پتھروں اور آگ کا یہ سلسلہ روک سکتا ہے ۔۔۔۔

"اتفاق سے میرا آدمی اُس وقت وہاں گیا جب وہاں پتھر گر رہے تھے۔ اُس نے اس لڑکی کے خاوند کے ساتھ میرے متعلق ایسی باتیں کیں کہ لڑکی کی ماں میرے پاس آگئی۔ میں چاہتا ہی یہی تھا کہ کوئی عورت آئے۔ یہ ہماری اُستادی ہے کہ عورت ہی آئی اور یہ عورت لڑکی کی ماں تھی۔ میں نے جوگی بابا بن کر ناموں کے حرفوں کا اور ستاروں کا چکر چلایا اور اس عورت سے کہا کہ تمہاری بیٹی پر تو ابھی اور کئی مصیبتیں آئیں گی۔ اُس کے ساتھ کسی کی دشمنی نہیں، یہ تو ستاروں کی آپس کی دشمنی ہے۔ تمہاری بیٹی اور تمہارے داماد کے ناموں کا ایک ایک حرف آپس میں ٹکراتے ہیں اور دونوں کے ستارے ایک دوسرے کے دشمن ہیں۔ بیٹی کو فوراً طلاق دلواؤ اور کسی ایسے آدمی کے ساتھ اس کی شادی کرو جس کا نام میم سے شروع ہو اور اگر اِس نام میں نُون بھی آجاتے تو اور زیادہ اچھا ہے۔"

"لڑکی کا نام کیا ہے؟"۔۔۔ تھانیدار نے پوچھا ۔۔۔ "تم خاوند کا نام بھی جانتے ہو گے!"

"لڑکی کا نام نسیمہ ہے"۔۔۔ عبدے نے کہا ۔۔۔ "اور خاوند کا نام ملک عمر حیات ہے ۔۔۔۔ اس لڑکی نسیمہ کی ماں بڑی ہی چالاک اور شیطان عورت ہے۔ کہنے لگی کہ میرے داماد کا پہلی بیوی سے ایک بچہ ہے، اس بچے کو غائب کر دو کیونکہ میری بیٹی کے گھر میں جو پتھر گر رہے ہیں وہ اس بچے کی نحوست ہے ۔۔۔۔ میں اُسے کہتا رہا کہ پتھروں اور آگ کے معاملے میں بچے کا ذرا سا بھی عمل دخل نہیں لیکن یہ عورت یہی کہتی رہی کہ بچے کو غائب کر دو۔"

"پھر تم نے کیا کیا؟"۔۔۔ تھانیدار نے پوچھا ۔۔۔ "مجھے اتنی لمبی کہانیاں نہ سناؤ ۔۔۔۔ میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ منیر کہاں ہے؟ ۔۔۔۔ کیا تمہیں

یہ شک ہے کہ منیر کو نسیمہ کی ماں نے اغوا یا قتل کرایا ہوگا؟"

"میں کچھ نہیں کہہ سکتا" — عبدے نے کہا — "اپنی رائے دے سکتا ہوں۔ میرا ابھی کچھ تجربہ ہے۔ یہ عورت اُس لڑکی کی ماں ہے جسے منیر طلاق دلوانا چاہتا ہے۔ ماں طلاق نہیں چاہتی۔ وہ اپنے داماد کی پہلی بیوی کے بیٹے کو غائب کرانا چاہتی ہے تاکہ جائیداد کی وارث اُس کی بیٹی کی اولاد ہو۔ یہ مجھے معمولی دماغ کی عورت نہیں لگتی۔ منیر کے ارادوں کا اُسے پتہ چل گیا ہوگا۔ منیر بھی بدمعاشی میں معمولی آدمی نہیں۔ اُس نے کوئی اُلٹی سیدھی حرکت کی ہوگی اور نسیمہ کی ماں نے انتقامی کارروائی کی ہوگی۔"

"منیر تمہارے پاس آتا رہتا ہوگا" — تھانیدار نے کہا — "تم اُسے کچھ بتاتے رہے ہوگے کہ اُس کا کام ہو جائے گا یا نہیں۔"

"میں نے اُسے کہہ دیا تھا کہ اُس کا کام نہیں ہو سکتا" — عبدے نے کہا — "اُس نے نسیمہ کے خاوند کو ختم کرنے کی باتیں شروع کر دی تھیں .... میں نے اُسے ایک بات کہی تھی۔ اگر آپ مجھے پکڑ نہ لیں تو بتا دوں۔"

"عبدے!" — تھانیدار نے کہا — "تم اتنے اناڑی نہیں ہو سکتے کہ مُنہ سے ایسی بات نکالو گے جس میں پکڑے جانے کا خطرہ ہوگا۔ کہو، بولو۔"

"حضور!" — عبدے نے ہاتھ جوڑ کر کہا — "مجھے آپ کے علاقے میں رہنا ہے۔ میں پوری مدد کروں گا۔ مجھے جوگی بنا رہنے دیں۔ کوئی واردات نہیں کروں گا۔ واردات کرنی ہوتی تو نسیمہ کی ماں کے ساتھ اچھا خاصا سودا کر کے اس بچے کو اغوا پھر بالکل ہی غائب کر دیتا۔ بچہ سکول پڑھتا ہے۔ میرے لئے یہ واردات مشکل نہیں تھی۔"

"وہ بات بتاؤ جو بتانے لگے تھے۔"

"بات یہ ہے" — عبدے نے کہا — "جب اُس نے قتل کی بات کی تو میں نے اُس سے کچھ اور پیسے جھاڑنے کے لئے کہا تھا کہ میں اُسے ایسا زہر دے سکتا ہوں جو اُسے فوراً نہیں مارے گا، بلکہ آہستہ آہستہ اثر کرے

گا اور وہ شخص اس طرح مرے گا جیسے کسی بیماری سے مرا ہو۔ وہ کچھ دن بیمار رہے گا۔ اس طرح پکڑے جانے کا خطرہ نہیں ہوتا، لیکن منیر نے کہا تھا کہ نسیمہ کے خاوند کو ختم ہی کرنا ہے تو وہ خود کرے گا۔ یہ میری اور اُس کی آخری ملاقات تھی۔"

"مستانے کو تم جانتے ہو؟"

"ہاں حضور!" — عبدے نے جواب دیا — "ہم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہیں۔ اُسے پتہ چل گیا تھا کہ نسیمہ کی ماں میرے پاس آتی تھی۔ اُس نے اپنے دو آدمی میرے پاس بھیجے تھے جنہوں نے مجھے دھمکی دی تھی کہ میں اُس کے گاہکوں کو خراب نہ کروں۔ یہ تو اچھا ہوا کہ مستانہ پکڑا گیا ورنہ ہماری آپس میں لڑائی ہو جاتی پھر یہاں مستانہ ہوتا یا میں ہوتا .... بس حضور! میں اتنا ہی جانتا ہوں۔ اب بتائیں میرے لئے کیا حکم ہے؟"

"حکم یہ ہے عبدے!" — تھانیدار نے کہا — "مجھے تم نے جو کچھ بتایا ہے اس کا ذکر کسی اور کے ساتھ نہ ہو۔"

"نہیں ہوگا" — عبدے نے کہا۔

"اگر منیر کا کوئی سراغ ملے تو مجھے بتا دینا۔"

"فوراً بتاؤں گا حضور!" — عبدے نے کہا۔

"اب غیر حاضری نہ ہو" — تھانیدار نے کہا — "ہر مہینے کی پہلی تاریخ۔ رات کو، میرے گھر۔"

"مال پہنچے گا حضور!" — عبدے نے کہا — "تھانے کا حصہ الگ تو نہیں ہوگا؟"

"تھانے میں کسی کو پتہ نہ چلنے دینا" — تھانیدار نے کہا — "سب میرا ہوگا۔"

تھانیدار نے عبدے کو جانے کی اجازت دے دی۔ اُس کے چہرے پر ایسی مایوسی کی ہلکی سی جھلک بھی نہیں تھی کہ اُسے منیر کا کوئی سراغ اس جرائم پیشہ آدمی سے بھی نہیں ملا تھا۔ مایوسی کی بجائے اُس کے چہرے پر

رونق سی آگئی تھی۔ اُسے آمدنی کا ایک اور ذریعہ مل گیا تھا۔

◆◆◆

تھانیدار کے چہرے پر تو رونق آگئی تھی لیکن نسیمہ کے نوجوان اور حسین چہرے کی رونق بالکل ہی بجھ گئی تھی۔

ایک جوان اور خوبرو آدمی کا خون ہضم کر لینا نسیمہ جیسی لڑکی کے بس کی بات نہیں تھی۔ منیر اتنے بھیانک جرم کو ہضم نہیں کر سکتا۔ ملک عمر حیات اُس سے دو تین بار پوچھ چکا تھا کہ اُسے کوئی تکلیف تو نہیں۔ نسیمہ نے ہر بار اُسے ہنس کر ٹال دیا تھا لیکن یہ ہنسی روکھی پھیکی سی تھی۔

"نسیمہ!" — ایک روز عمر حیات نے اُسے مسرور سے لہجے میں کہا — "معلوم ہوتا ہے میں ایک اور بچے کا باپ بننے والا ہوں۔ جب شوکی اپنی ماں کے پیٹ میں تھا تو ابتدا میں اس کی ماں کی بھی ایسی ہی حالت ہو گئی تھی۔ بالکل ہی بجھ کے رہ گئی تھی۔ تیسرے مہینے کے آخر میں اُس کی طبیعت سنبھلی اور صحت بہتر ہونا شروع ہوتی تھی" — عمر حیات نے ہلکی سی ہنسی سے کہا — "اُس نے تو مجھے ابتدائی دنوں میں ہی خوشخبری سنا دی تھی، تم شرما رہی ہو"

"میں بالکل ٹھیک ہوں ملک صاحب!" — نسیمہ نے کہا تھا۔ کوشش کے باوجود وہ ہونٹوں پر مسکراہٹ نہیں لا سکی تھی۔ اُس نے کہا تھا — "ابھی نہیں .... اللہ مجھے شوکی جیسا پیارا بیٹا دے گا .... میں آپ کو بیٹا دوں گی"

اُسی شام کا ذکر ہے۔ سورج غروب ہونے ہی والا تھا۔ ملک عمر حیات ابھی گھر نہیں آیا تھا۔ شوکی صحن میں محلے کے دو بچوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔ نسیمہ کوئی چیز لانے کے لئے اُس کمرے میں گئی جو دن کو بھی تاریک رہتا تھا۔ وہ دوسرے کمروں میں گھرا ہوا تھا۔ اس کے پچھواڑے کسی اور کے مکان کا پچھواڑا تھا۔

نسیمہ نے اس کمرے میں قدم رکھا ہی تھا کہ اُسے کمرے میں کسی کی

ایسی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ جیسے کوئی "سس سس سس" کی آوازیں نکال رہا ہو۔ یہ آواز باہر کی نہیں تھی۔ نسیمہ نے وہاں سے بھاگ آنے کی کوشش کی لیکن اُس کے پاؤں دہلیز نے جکڑ لئے۔ نسیمہ نے سر سے پاؤں تک سرد سی ایک لہر محسوس کی جس نے اُسے سُن کر دیا۔

یہ پہلا موقعہ نہیں تھا کہ اُس نے ایسی آواز سُنی تھی۔ دو روز پہلے، رات کے وقت، نسیمہ گہری نیند سوئی ہوئی تھی۔ ساتھ والے پلنگ پر عمر حیات کی جگہ اُس کا بیٹا شوکت سویا ہوا تھا۔ عمر حیات کاروبار کے سلسلے میں کسی دوسرے شہر چلا گیا تھا۔ وہ ڈیوڑھی میں سونے کے لئے دو آدمی چھوڑ گیا تھا۔ نسیمہ ہڑبڑا کر جاگ اُٹھی۔ اُسے صاف محسوس ہوا تھا کہ کسی نے اُس کے دائیں پاؤں کا انگوٹھا پکڑ کر زور سے ہلایا تھا۔ وہ اُٹھ بیٹھی تھی۔ اُس کے سامنے پلنگ کی پائنتی کے ساتھ منیر کھڑا تھا۔ اُس کی آنکھیں بند تھیں۔ نسیمہ کا پسینہ نکل آیا تھا۔ کمرے میں زیرو کا بلب جل رہا تھا جس کی روشنی بہت ہی مدھم تھی۔ اتنی مدھم روشنی میں منیر کا چہرہ اور سراپا اتنا صاف نظر نہیں آنا چاہیے تھا لیکن ایسے لگتا تھا جیسے اُس پر سو نمبر کے بلب کی روشنی پڑ رہی ہو۔

"نسیمہ!" — منیر کے ہونٹ ہلے اور آہستہ آہستہ اُس کی آنکھیں کھل گئیں — "تُو نے مجھے مار ڈالا ہے۔"

نسیمہ خوف کی ایسی بے رحم گرفت میں آگئی تھی کہ زبان ہل نہ سکی۔

"نسیمہ!" — منیر کے ہونٹ پھر ہلے — "میں نے عصمت نہیں محبت مانگی تھی"

"تُو نے عصمت مانگی تھی" — اچانک نسیمہ کی زبان چل پڑی — "میں نے تیری جان لے لی ہے .... تُو مر گیا ہے" — نسیمہ نے چلّا کر کہا تھا — "تُو اُس کی بدروح ہے جس نے مجھ سے عصمت مانگی تھی"

سو نمبر کا بلب جیسے بجھ گیا ہو۔ کمرے میں اب زیرو بلب کی مری مری روشنی تھی۔ منیر وہاں نہیں تھا۔ نسیمہ کی خوف زدہ نظریں کمرے میں گھومنے لگی تھیں۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ نسیمہ نے اپنے آپ کو پلنگ پر بیٹھے ہوئے پایا

تھا۔ اُسے سرسراہٹ سی سنائی دی۔ اُس نے ہڑک کر دیکھا۔ شوکت نے کروٹ بدلی اور اُس نے لمبا سانس لیا تھا۔

"کیا یہ خواب تھا؟"

"نہیں" — اُس نے اپنے آپ کو جواب دیا تھا — "میں تو جاگ رہی تھی .... وہ آیا تھا"

"کیا یہ میرے ذہن کی تصویر تھی؟"

"تصور اس طرح تو نہیں ہوتے" — اُس نے سوچا تھا — "اگر میں آگے بڑھتی تو اُسے ہاتھ لگا سکتی تھی .... وہ آیا تھا۔"

تصور نظر آتے ہیں۔ ان کو چھوا نہیں جا سکتا۔ تصور ٹھوس نہیں ہوتے۔ تصوروں کو پکڑا نہیں جا سکتا مگر نسیمہ کو خیال آ رہا تھا کہ یہ تصور نہیں تھا اسے وہ پکڑ سکتی تھی۔

اُس نے محسوس کرنا شروع کر دیا تھا کہ اِس راز کو وہ اپنے سینے میں دفن نہیں کر سکے گی لیکن اتنا زہرناک راز رکھتی کس کے آگے؟ اُس رات تو تنہائی اُسے ڈسنے لگی اور خوف اُس کا گلا گھونٹ رہا تھا۔ اُسے خدا کے سوا کوئی ہمدرد اور مددگار نظر نہیں آتا تھا۔ وہ اُٹھی اور چادر فرش پر بچھا کر نفل پڑھنے لگی۔ اُسے احساس تھا کہ وضو لازمی ہے لیکن خوف سے وہ باہر نہیں نکل رہی تھی۔ آٹھ دس نفل پڑھ کر اُس نے دعا کے لئے ہاتھ اُٹھائے مگر سوائے رونے کے خدا سے کچھ کہہ نہ سکی تھی۔

❖

اس سے ایک دو دن پہلے وہ گھر میں اکیلی تھی۔ عمر حیات اپنے کام پر اور شوکت سکول چلا گیا تھا۔ نوکرانی کام کر کے اور سودا سلف دے کر چلی گئی تھی۔ ساون کے سفید اور سلیٹی بادل جو آسمان پر ایک دوسرے کے پیچھے دوڑے جا رہے تھے، کہیں جا کر اکٹھے ہو گئے اور گھٹا کی صورت اختیار کر کے واپس آ گئے۔ ویسے ہی موسلادھار بارش شروع ہو گئی جیسی اُس وقت برسی تھی جب نسیمہ نے منیر کو آبشار والی چٹانوں کی گہرائی میں دھکا دیا تھا۔ بجلی رہ رہ کر چمکتی تھی۔ ذرا سی دیر میں پرنالے آبشاریں بن گئے۔ گھٹا اور بے تحاشہ بارش سے دن نیم تاریک ہو گیا تھا۔ نسیمہ برآمدے میں چارپائی پر بیٹھی پکانے کے لئے سبزی تیار کر رہی تھی۔ ویسے ہی اُس کی نظریں برآمدے کے ایک اندرونی کونے میں چلی گئیں۔ وہاں سے ایک آبشار گر رہی تھی لیکن نیچے کہیں گرتی نظر نہیں آتی تھی۔ نسیمہ پر سکتہ سا طاری ہو گیا تھا۔ اُس نے سر کو جھٹک کر دیکھا لیکن آبشار وہیں رہی۔ دیوار چٹان بن گئی۔

بجلی چمکی۔ نیم تاریک برآمدہ روشن ہو گیا۔ اس چمک کے بعد نسیمہ کی آنکھوں کے آگے اندھیرا چھا گیا تھا جو آہستہ آہستہ چھٹ گیا تھا۔ نسیمہ کو آبشار کی جگہ منیر کھڑا نظر آیا۔ وہ دھندلی سی روشنی میں کھڑا تھا۔ نسیمہ بڑی سخت کوشش کے باوجود وہاں سے نظریں نہیں ہٹا سکی تھی۔ سرخ سی ایک لہر اُس کے سارے وجود میں بھر گئی تھی۔

نسیمہ نے ایسی باتیں سُنی تھیں کہ جو قتل ہو جاتے ہیں، اُن کی روحیں بھٹکتی رہتی ہیں۔ اُس نے یہ بھی سُنا تھا کہ نندہ قصبے کے قریب ہی ایک خشک نالہ ہے۔ شام کے بعد لوگ اُدھر سے نہیں گزرتے۔ کوئی بھولا بھٹکا اُدھر سے گزرے تو نالے میں سے ایک عورت کے رونے کی آوازیں آتی ہیں، پھر سفید کپڑے پہنے ہوئے ایک نوجوان اور بڑی خوبصورت لڑکی نظر آتی ہے۔ وہ گزرنے والے کے آگے آکر منتیں کرتی اور کہتی ہے مجھے گھر لے چلو۔ کہتے ہیں بیس بائیس سال گزرے کسی گاؤں کی ایک لڑکی کو اغوا کر کے اس نالے میں قتل کیا گیا تھا اور یہ اُس کی بے چین رُوح ہے۔

نسیمہ نے منیر کو دیکھا تو اُسے یہی خیال آیا تھا کہ یہ اُس کی بے چین روح ہے۔ برآمدے کی اُس دیوار میں جیسے منیر کے قد جتنا شگاف ہو گیا تھا اور منیر اس میں کھڑا تھا۔

"نسیمہ!" — بارش کے بے ہنگم شور اور گھٹاؤں کی گرج میں بھی منیر کی آواز سنائی دی تھی — "میں اتنا بُرا نہیں تھا۔ تمہارے ساتھ کیا بُرا تی

کی تھی؟"

نسیمہ نے کلمہ شریف پڑھنا شروع کر دیا تھا اور منیر غائب ہو گیا اور دیوار کا شگاف مل گیا تھا۔ خوف اور دہشت نے نسیمہ کے جسم سے جیسے جان ہی نکال دی تھی۔

"کیا میری باقی عمر اسی طرح گزرے گی؟" — اُسے بڑا ڈراؤنا خیال آیا — "نہیں نہیں .... میں زندہ نہیں رہ سکوں گی۔ میں یہ سزا برداشت نہیں کر سکوں گی .... کسے بتاؤں؟ کسے اپنا رازدار اور غمخوار بناؤں؟"

اُسے یہ خیال بھی آیا کہ اس مکان پر کوئی آسیبی اثر ہے۔ عمر حیات کی پہلی بیوی اسی مکان میں مری تھی۔ نسیمہ کو کسی نے بتایا تھا کہ اُس عورت کے مرض کو کوئی ڈاکٹر اور کوئی حکیم سمجھ ہی نہیں سکا تھا۔ سات آٹھ سال بعد نسیمہ اس گھر میں آئی تو اُس کے خاوند کے بیٹے کو عجیب سے دورے پڑنے لگے، پھر اس گھر میں ڈاکو آئے اور سب سے بڑا حادثہ یہ ہُوا کہ جس آدمی نے اس گھر کو ڈاکوؤں سے بچایا تھا وہ نسیمہ کے ہاتھوں مارا گیا اور اب اس مرے ہوئے آدمی کی رُوح یا بدرُوح نے اس گھر میں ڈیرہ ڈال دیا تھا۔

نسیمہ نے ارادہ کیا تھا کہ وہ عمر حیات سے کہے گی کہ یہ مکان فروخت کر کے شہر کے باہر اچھا سا مکان بناتے ہیں لیکن بات زبان پر آتی تھی تو وہ اسے نگل لیتی تھی۔ ضمیر پر قتل جیسے ہولناک جرم کا ایسا اثر تھا کہ وہ ڈر جاتی تھی کہ مکان کی بات کی تو مُنہ سے یہ بھی نکل جائے گی کہ میں نے منیر کو مار ڈالا ہے اور اُس کی بدرُوح مجھے پریشان کرتی ہے۔

اُس کا ہمراز اور ہمدرد حسنین کاظمی تھا لیکن وہ اپنا یہ روگ اور راز اُس کے آگے بھی رکھنے سے ڈرتی تھی۔ وہ ہر وقت کھوئی کھوئی اور ڈری ڈری سی رہنے لگی تھی۔

◆◆◆

اس روز سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے وہ اپنے گھر کے اُس کمرے میں داخل ہوئی جو دن کے وقت بھی تاریک رہتا تھا تو اُسے کمرے میں کسی

کی ہنسی کی "سِس سِس" سنائی دی۔ نسیمہ پیچھے ہٹنے لگی تو اُس کے پاؤں جکڑے گئے۔

"مجھ سے نہ ڈرو نسیمہ!" — اُسے ایک جانی پہچانی آواز سنائی دی — "اندر آجاؤ۔"

نسیمہ کو جیسے کسی نے کمرے میں گھسیٹ لیا ہو۔ وہ دہلیز سے چار پانچ قدم آگے جا رُکی۔ سامنے والی دیوار پر اُسے منیر کا چہرہ اس طرح دکھائی دیا جیسے دیوار کے ساتھ تصویر لگی ہوتی ہو۔ یہ تصویر زندہ تھی، بولتی تھی اور اس تصویر نے نسیمہ کو ہپناٹائز کر لیا تھا۔

"میں نے تمہارا کیا بگاڑا تھا نسیمہ؟" — تصویر نے کہا — "ڈرو نہیں، ڈرو نہیں۔"

نسیمہ کا جسم سرد ہو گیا۔ اُس نے کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن زبان نے ساتھ نہ دیا۔ تصویر کا صرف چہرہ تھا، پھر ایسے ہُوا جیسے پردہ ہٹ رہا ہو۔ آہستہ آہستہ منیر سر سے پاؤں تک نظر آنے لگا۔ اُس کے ارد گرد ہلکی سی روشنی کا ہالہ تھا۔ وہ آگے کو چل پڑا۔ نسیمہ ڈر کر پیچھے ہٹنے لگی۔ منیر بڑھتا آیا، نسیمہ پیچھے ہٹتے ہٹتے دیوار کے ساتھ جا لگی۔

"خدا کے لئے منیر!" — نسیمہ کی زبان چل پڑی — "خدا کے لئے رُک جاؤ .... مجھے جان سے مار کر اپنے قتل کا انتقام لے لو یا مجھے بخش دو۔ اگر تمہیں مجھ سے محبت تھی تو مجھے اتنی اذیت نہ دو۔" — نسیمہ کی آواز رُندھ گئی۔

"قتل کرنا آسان ہے نسیمہ!" — منیر نے نسیمہ سے کچھ دُور رُک کر کہا — "قتل کو ہضم کر لینا بہت مشکل ہے۔ تم نے میری محبت کو بھی قتل کیا تھا اور اس کی لاش عمر حیات کے ہاتھ بیچ ڈالی تھی .... یاد کرو میری محبت کو۔"

منیر کی آواز ایسے تھی جیسے خواب میں بول رہا ہو۔

"مجھے یاد ہے" — نسیمہ نے ڈری ہوئی آواز میں کہا — "مجھے یاد ہے منیر! .... اب کیا ہو سکتا ہے .... دیکھو منیر! میں اکیلی ہوں۔ میں دل کا یہ راز کسی کو نہیں دے سکتی۔ اپنا یہ دُکھ جو تم مجھے دے رہے ہو کسی کو دکھا نہیں

سکتی ....تم رُوح ہو۔ مجھے بخش دو۔"

"آؤ"۔۔۔ منیر بازو پھیلا کر آہستہ آہستہ آگے بڑھا ۔۔۔"میں تمہارے دُکھ اپنے سینے سے لگا لوں گا۔"

دوسرے لمحے نسیمہ منیر کے بازوؤں میں تھی۔ وہ اپنے بالوں پر، گالوں پر، گردن پر منیر کا لمس محسوس کر رہی تھی۔ ڈرتے ڈرتے نسیمہ نے اپنے بازو جو بے جان سے ہو کر اُس کے پہلوؤں کے ساتھ لٹک رہے تھے، اُٹھائے اور منیر کے گرد لپیٹ دیئے مگر اُس کے بازو اُس کے اپنے سینے پر جا لگے۔ اُس کا سر ذرا جھکا ہوا تھا۔ اُس نے گھبرا کر سر اُٹھایا۔ وہاں منیر نہیں تھا۔ اُس نے بازو جو منیر کے گرد لپیٹے تھے وہ اُس کے اپنے سینے پر بندھے ہوتے تھے۔ وہ اپنے ہی سینے کو بھینچ رہی تھی۔ اُس نے اپنے گالوں پر اور سر پر ہاتھ پھیرا۔ اُس نے تاریک کمرے میں ہر طرف دیکھا۔ وہاں کچھ بھی نہیں تھا۔

اُس نے لپک کر بٹن دبایا۔ کمرہ روشن ہو گیا۔ خوف ایک لہر کی طرح آیا۔ اُس کا دل اُچھل اُچھل کر حلق تک پہنچنے لگا۔ وہ بڑی تیزی سے کمرے سے نکل آئی۔

"کیا کروں؟"۔۔۔ اُسے خیال آنے لگے ۔۔۔"کہاں جاؤں؟"

❖

رات جب عمر حیات گہری نیند سویا ہوا تھا، نسیمہ جاگ رہی تھی۔ سوچ سوچ کر اُس کا دماغ تھک گیا تھا۔ اُسے کوئی پناہ نظر نہیں آ رہی تھی۔ اُس کے ذہن میں وہی خانقاہ آگئی ۔۔۔ خانقاہ بیبیاں والی ۔۔۔ پہلے تو وہ اُس خانقاہ سے ڈر گئی لیکن اُسے یاد آگیا کہ وہاں جا کر اُسے کتنا سکون ملا تھا۔ اُسے یہ خیال بھی آگیا کہ اِس خانقاہ نے اُس کی دو مرادیں پوری کر دی تھیں۔ ایک یہ کہ جس فوٹو سے وہ ڈرتی تھی، دوسرے ہی دن وہ فوٹو اُس کے ہاتھ میں آگیا تھا اور اُسے اُس نے اپنے ہاتھ سے جلا دیا تھا۔ دوسری مراد یہ تھی کہ منیر اُس کا پیچھا چھوڑ دے۔ یہ الگ بات ہے کہ منیر اُس کے اپنے

ہاتھوں مارا گیا تھا لیکن وہ دُنیا سے اُٹھ گیا تھا۔

اُس نے رات کو ارادہ کر لیا کہ اگلے روز اِس خانقاہ پر جائے گی اور منیر کی بدرُوح سے نجات کے لئے فریاد کرے گی۔

دوسرے دن وہ اُس وقت خانقاہ کی طرف چل پڑی جب نوکرانی کام سے فارغ ہو چکی تھی۔ نسیمہ نے اُسے کہا کہ گھر میں اور کوئی نہیں اور اُسے خانقاہ پر جانا ہے۔

"یہ آخری پھیرا رہ گیا ہے"۔۔۔ اُس نے نوکرانی سے کہا ۔۔۔"آج میری ہانڈی پکا دو۔ میں جانا آنا ہی کروں گی"۔۔۔ اُس نے نوکرانی کو خوش کرنے کے لئے دو روپے دیئے۔

"پکا دوں گی بی بی!"۔۔۔ نوکرانی نے کہا ۔۔۔"خانقاہ پر میرے لئے بھی دُعا کرنا۔"

نسیمہ چادر اوڑھ کر چلی گئی۔

وہ بہت تیز چلی جا رہی تھی۔ اُسے ڈر صرف یہ تھا کہ بارش نہ آجائے۔ آسمان پر بادل منڈلا رہے تھے۔ اُسے یہ خیال نہ آیا کہ اُسی آبشار کے قریب سے گزرنا ہے جہاں اُس نے منیر کو دھکا دیا تھا۔ وہ اس اطمینان کے ساتھ جا رہی تھی کہ اِس خانقاہ سے اُسے سکون مل جائے گا۔ وہ عام راستے سے ہٹ کر اُس ویران علاقے میں داخل ہو گئی جہاں گہرے گڑھے تھے۔ ان میں بعض گڑھے گہرے اور وسیع تھے اور بعض چھوٹے چھوٹے تھے۔ وہاں ٹیکریاں بھی تھیں اور ننگی چٹانیں بھی۔ درخت بھی تھے اور گھاس بھی۔ ساون کی وجہ سے بعض گڑھوں میں پانی اکٹھا ہو گیا تھا اور بارشوں کی وجہ سے ہاتھی گھاس خاصی اونچی ہو گئی تھی۔ اتنی اُونچی کہ نسیمہ کے سر سے کچھ اُوپر تھی۔ وہ جھاڑیاں بھی ہری ہو گئی تھیں جو خشک رہتی تھیں۔

نسیمہ اِس سبزہ زار میں جو دُور سے اچھا اور قریب سے ڈراؤنا سا لگتا تھا، بے خوف و خطر چلی جا رہی تھی۔ اس علاقے سے وہ دو بار گزر چکی تھی۔ ایک بار شادی سے پہلے اپنی ماں کے ساتھ خانقاہ بیبیاں والی پر گئی تھی اور

دوسری بار اکیلی گئی تھی جب واپسی پر اُسے منیر مل گیا اور اُس نے منیر کو موت کے مُنہ میں دھکیل دیا تھا۔ وہ یوں چلی جا رہی تھی جیسے اُسے یاد ہی نہ ہو کہ اُس نے کسی کو قتل کیا ہے۔

وہ ایک چوڑے اور خاصے بڑے کھڈ کے کنارے پر جا رہی تھی کہ ٹھٹھک کر رُک گئی۔ کم و بیش ڈیڑھ گز لمبا ایک سانپ جس کا رنگ پھیکا بادامی تھا اُس کا راستہ کاٹ کر کھڈ میں اُتر گیا۔ نسیمہ ڈر گئی۔ وہ سانپ کو دیکھتی رہی جو کھڈ میں جا رہا تھا۔ کچھ آگے دو سانڈے جو ایک ایک بالشت لمبے تھے، آپس میں لڑ رہے تھے۔ وہ سانڈے لگتے تھے لیکن وہ گوہ کے بچے تھے۔ نسیمہ نے سانپ کو دیکھا کہ رُک گیا تھا اور آہستہ آہستہ گوہ کے بچوں کی طرف بڑھ رہا تھا۔ آگے جا کر سانپ ایک جھاڑی کے پیچھے رُک گیا۔

گوہ کے بچے اُس سے بے خبر تھے۔ وہ کھیلتے کھیلتے جھاڑی کے قریب آ گئے۔ سانپ نے اتنی تیزی سے جھپٹا مارا کہ ایک بچے کو مُنہ میں پکڑ لیا۔ نسیمہ اُوپر کھڑی دیکھ رہی تھی۔ درختوں پر پرندوں نے اُڑ کر واویلا بپا کر دیا۔ سانپ بچے کو گھما کر اُس کا مُنہ اپنے مُنہ میں لے چکا تھا اور اسے نگلنے کی کوشش کر رہا تھا۔ دوسرا بچہ بھاگ گیا تھا۔

ایک طرف سے کوئی ایک گز لمبی گوہ بڑی تیز دوڑتی آئی۔ سانڈے اور چھپکلی کی نسل کی اس گز بھر لمبی گوہ نے سانپ پر حملہ کر دیا۔ سانپ بھاگ اُٹھا لیکن اُس کے مُنہ میں گوہ کا بچہ تھا اس لئے تیز نہیں بھاگ سکتا تھا۔ گوہ اُس تک پہنچ گئی اور اُس کی دُم اپنے مُنہ میں لے لی۔ سانپ پیچھے مُڑا تو گوہ نے اپنی دُم گھما کر سانپ کو ماری پھر اُس کی دُم چھوڑ کر اُس کو درمیان سے پکڑ لیا۔ سانپ اُسے کاٹ نہیں سکتا تھا کیونکہ مُنہ میں گوہ کا بچہ تھا۔ گوہ نے درمیان سے پکڑے ہُوئے سانپ کو جھنجھوڑنا اور پٹخنا شروع کر دیا۔ گوہ کا بچہ سانپ کے مُنہ سے باہر آنے لگا۔

گوہ نے سانپ کو دو حصّوں میں کاٹ دیا پھر اُس نے اپنے بچے کو دُم سے مُنہ میں پکڑا اور سانپ کے مُنہ سے نکال کر اسے گھسیٹ کر لے گئی۔ سانپ

کا مُنہ والا حصّہ ہلتا رہا، بل کھاتا رہا اور ساکن ہو گیا۔

نسیمہ کو پتہ نہ چل سکا کہ گوہ کا بچہ زندہ تھا یا مر گیا تھا۔ اُس نے یہ لڑائی پہلی دیکھی تھی۔ سانپ سے وہ بہت ڈرا کرتی تھی لیکن اس سانپ کے دو ٹکڑے ہوتے دیکھ کر اُس کے ذہن سے ڈر نکل گیا۔ اُسے اچانک منیر کا خیال آ گیا مگر اب اس خیال سے وہ ذرا نہ ڈری نہ اُس نے اپنے آپ میں کوئی ہلچل سی محسوس کی، بلکہ اُسے اطمینان سا ہُوا کہ اُس نے ایک سانپ کو، بڑے ہی زہریلے ناگ کو مار ڈالا ہے اور اپنی عصمت کو اُس کے مُنہ سے نکال کر لے آئی ہے۔

وہ اور زیادہ دلیر ہو کر آگے چل پڑی۔

◆◆◆

دو تین فرلانگ آگے گئی تو اُسے ہلکا ہلکا شور سنائی دینے لگا۔ وہ بڑھتی چلی گئی اور شور بھی بڑھتا گیا۔ اُس نے بائیں طرف دیکھا۔ اُسے وہ آبشار دکھائی دی جو اُس کی زندگی کا آسیب بن گئی تھی۔ اب پانی زیادہ نہیں تھا کچھ قصبے کا پانی تھا اور کچھ ساون کا پانی اِدھر اُدھر سے آ رہا تھا۔ چونکہ یہ بلندی سے سنگلاخ جگہ پر گر رہا تھا اور وہ جگہ تنگ تھی اس لئے اس کا شور زیادہ تھا۔

نسیمہ نے آبشار دیکھی تو اُسے منیر یاد آ گیا۔ اُس کے ذہن سے خوف اُبھرنے لگا لیکن خوف کو اُس نے دبا لیا اور اس خیال سے اُس گہرائی کو دیکھنے کے لئے جس میں منیر اُس کے دھکے سے گرا تھا، کہ وہاں گر کر منیر کے بچ نکلنے کی کوئی صورت بھی تھی یا نہیں، وہ آگے چلی گئی اور کنارے پر جا رُکی۔

وہ جگہ دیکھ کر اُس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ یہ گہرائی اُس نے اُس روز بھی دیکھی تھی جس روز اُس نے منیر کو یہاں سے دھکا دیا تھا لیکن اُس روز موسلادھار بارش برس رہی تھی۔ اچھی طرح نظر نہیں آتا تھا۔ اس کے علاوہ اُوپر سے جو پانی آبشار کی طرح گر رہا تھا وہ دریا لگتا تھا۔ نیچے اتنا زیادہ پانی تھا کہ اس جگہ کی گہرائی کا اندازہ نہیں ہوتا تھا۔ آج پانی بہت کم تھا۔ اس گہری جگہ کی تہہ نظر آتی تھی۔

نسیمہ کو یوں لگا جیسے وہ دو تین منزلہ مکان کی منڈیر پر کھڑی نیچے دیکھ رہی ہو۔ یہ چٹان تھی جو دیوار کی طرح پیچھے چلی گئی تھی۔ اس کے دامن سے سامنے والی چٹان اُوپر اُٹھی تھی۔ یہ ایک گلی یا تنگ وادی سی بنی ہوئی تھی۔ نیچے بڑے بڑے پتھر اور نوکیلی چٹانیں اُبھری ہوئی تھیں۔ اس جگہ کی گہرائی چالیس اور پچاس فٹ کے درمیان تھی۔ منیر جہاں سے لڑھک کر نیچے گرا تھا وہ ڈھلان تقریباً عمودی تھی اور اس پر بھی چھوٹی چھوٹی چٹانیں اُبھری ہُوئی تھیں۔

"نہیں بچ سکتا" — نسیمہ نے اپنے آپ سے کہا — "بچ گیا ہوتا تو اتنے دن گزُر گئے ہیں، وہ گھر آجاتا.... مر گیا ہے" — وہ اس آواز پر چونک اُٹھی — "وہ مر گیا ہے" — اُس کے مُنہ سے یہ الفاظ بلند آواز سے نکل گئے تھے۔

اُس نے دائیں بائیں اور پیچھے دیکھا۔ وہاں کوئی نہیں تھا۔ اُس کی آواز کسی نے نہیں سُنی تھی۔ وہ ویرانہ تھا۔ خانقاہ بیبیاں والی پر عورتیں تین تین چار چار اور اس سے بھی زیادہ مل کر جاتی تھیں۔ وہ علاقہ اکیلی عورت کے لئے بے حد خطرناک تھا۔ نسیمہ کی ضرورت ہی ایسی تھی کہ وہ اکیلی چلی گئی تھی۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا تھا کہ اُس میں ڈھکی چھُپی دلیری ہے جس سے وہ آگاہ نہیں۔

نسیمہ کی نظریں آبشار پر جم گئیں۔ موسم صاف تھا۔ سورج چمک رہا تھا اور بادلوں کے ٹکڑے اُس کے آگے سے گزُر رہے تھے۔ بارش کے آثار نہیں تھے۔ ہوا کا کوئی کوئی جھونکا ذرا تیز آتا تھا تو سائیں سائیں جیسی آواز پیدا کر کے گزُر جاتا تھا۔ نسیمہ کی نظریں اُس جگہ جمی ہوئی تھیں جہاں سے آبشار گر رہی تھی۔

بادل کے ایک ٹکڑے کا سایہ نسیمہ کے سامنے رینگتا گزُر گیا۔ اس کے پیچھے ایک اور سایہ رینگتا آرہا تھا۔ نسیمہ کے اِرد گرد دُنیا تاریک ہونے لگی۔

اُسے گھن گرج سنائی دینے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس قدر تیز مینہ برسنے لگا جیسے کنکریاں برس رہی ہوں۔ آبشار جو ابھی پرنالے کی طرح گر رہی تھی، دریا کی طرح گرنے لگی۔ ایسا شور کہ نسیمہ کا دل دہل رہا تھا۔ خوف کی ایک لہر اُس کے وجود میں پھر گئی۔

نسیمہ نے خانقاہ کی طرف دیکھا۔ اُسے کچھ بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ خانقاہ کی سمت جانتی تھی۔ خانقاہ میں ہی اُسے پناہ مل سکتی تھی۔ اپنا گھر دو میل دُور تھا۔ خانقاہ کی طرف بھاگ جانے کے ارادے سے اُس نے قدم اُٹھاتے تو پہلا قدم ہی نہ اُٹھا۔ اُس نے دوسرا پاؤں اُٹھانے کی کوشش کی تو وہ بھی نہ اُٹھا۔ خوف سے وہ سُن ہو کے رہ گئی۔ اُس نے پیچھے دیکھا۔ موسلادھار بارش کی دُھند میں اُسے ایک گھوڑی کھڑی نظر آئی۔ گھوڑی کی پیٹھ پر زین تھی لیکن سوار نہیں تھا۔

خوفزدگی کا یہ عالم کہ نسیمہ کی چیخ نکل گئی لیکن اپنی چیخ اُسے خود بھی نہ سنائی دی۔ چیخ تو اُسے نہ سنائی دی، کسی کی سرگوشی نما ہنسی اُسے بڑی صاف سنائی دی۔ وہ تیزی سے اُدھر گھومی تو بارش کے سوا وہاں کچھ بھی نہ تھا۔

ایک قہقہہ اس طرح سنائی دیا جیسے کسی نے دو پتھر بجاتے ہوں۔ نسیمہ نے اِدھر اُدھر دیکھا۔ اُس سے دس بارہ قدم دُور منیر کھڑا تھا۔ اُس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔ نسیمہ اُسے دیکھتی رہی۔ منیر کے بازو جو اُس کے پہلو کے ساتھ تھے، اُوپر اُٹھے اور نسیمہ کی طرف پھیل گئے۔ نسیمہ نے ایک بار پھر بھاگنے کی کوشش کی لیکن زمین نے اُس کے پاؤں نہ چھوڑے۔ منیر اس طرح اُس کی طرف بڑھنے لگا کہ اُس کے پاؤں نہیں اُٹھتے تھے اور وہ آگے آرہا تھا۔

"نہیں" — نسیمہ کی زبان رواں ہو گئی — "منیر.... منیر...." اُس کی آواز بلند ہو گئی — "مجھے جانے دو.... اگر تمہیں مجھ سے اتنی محبت تھی تو مجھے اپنا خون معاف کر دو۔"

منیر اُس کے قریب آکر رُک گیا۔

"مجھے بتاؤ تمہاری لاش کہاں ہے" — نسیمہ نے کہا — "میں تمہاری لاش کو دفن کروں گی۔ اُوپر مقبرہ بناؤں گی اور ہر رات وہاں دیا جلایا

کروں گی۔"

منیر کی ہنسی ایک بار پھر سنائی دی اور وہ ایک قدم اور آگے آگیا۔ بارش پہلے سے زیادہ تیز ہوگئی۔ آبشار کا شور کانوں کے پردے پھاڑ رہا تھا لیکن نسیمہ کو منیر کی سرگوشی بھی آسانی سے سنائی دے رہی تھی۔

"تم نے میری محبت ہضم کر لی ہے" — منیر نے کہا — "میرا خون ہضم نہیں کر سکو گی۔ تم اب میری قیدی ہو۔ اب میرے اشاروں پر ناچا کرو گی۔"

نسیمہ نے منیر کے چہرے پر نظریں جما رکھی تھیں۔ منیر کا چہرہ اُسی طرح جوان اور پُرکشش تھا جیسے ہُوا کرتا تھا۔ اُس کی آنکھوں میں وہی چمک تھی جو ہُوا کرتی تھی۔ نسیمہ اس چہرے کو دیکھ رہی تھی۔ چہرہ جو ابھی اتنا حسین تھا، ابھی بگڑنے لگا۔ اس کا رنگ سانولا ہوگیا۔ مسکراہٹ بھیڑیئے کے دانتوں میں بدل گئی۔ منیر کے ہونٹوں کے کونوں سے دو لمبے دانت باہر کو آ گئے۔ آنکھیں لال سُرخ ہوگئیں اور چہرہ بھیڑیئے کے مُنہ کی طرح لمبوترا ہوگیا۔ اُس کے کان بھیڑیئے جیسے ہوگئے۔ نسیمہ نے منیر کے ہاتھ دیکھے۔ اُس کے ناخن درندوں کے پنجوں کی طرح ہوگئے۔ نسیمہ نے منیر کے مُنہ سے رال ٹپکتی دیکھی اور منیر درندوں جیسے پنجے آگے کرکے اُسی طرح نسیمہ کی طرف آہستہ آہستہ بڑھنے لگا جس طرح درندے اپنے کمزور سے شکار کی طرف بڑھا کرتے ہیں۔

نسیمہ نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیے۔ اُس کے مُنہ سے چیخ نکلی۔ وہ پیچھے ہٹی اور دُنیا تاریک ہوگئی۔

◆◆◆

تین آدمی نسیمہ سے کچھ دُور کھڑے تھے۔ وہ کہیں جا رہے تھے۔ سورج چمک رہا تھا۔ پہلے کی طرح ساون کے بادلوں کے سفید اور سلیٹی ٹکڑے آسمان پہ تیر رہے تھے۔ وہاں بارش کی ایک بُوند نہیں گری تھی۔ چٹانی نالے میں اُوپر سے تھوڑا سا پانی بہہ رہا تھا جو ہمیشہ بہتا رہتا تھا۔ نسیمہ نے جو موسلادھار بارش دیکھی تھی وہ اُس کے ضمیر کا واہمہ تھا۔ وہ قتل کا ردِعمل تھا۔

وہ تین آدمی جو اُدھر سے گزر رہے تھے، وہ کوئی عام مسافر نہیں تھے۔ اس علاقے میں سے عام مسافروں کے لیے کوئی راستہ نہیں تھا۔ پگڈنڈی دُور تھی۔ وہ تین آدمی پگڈنڈیوں سے دُور ہٹ کر چلنے والے لوگ تھے۔ اُن کے قدم راتوں کے اندھیرے میں اور دشوار گزار جگہوں پر ہموار راستوں کی نسبت زیادہ تیزی سے اُٹھتے تھے۔

وہ کہیں جا رہے تھے کہ اُن کے ایک ساتھی نے نسیمہ کو کھڑے دیکھ لیا۔ وہ تیس چالیس قدم دُور کھڑی تھی۔

"اُسے دیکھنا" — اُس نے اپنے ساتھیوں سے کہا — "وہ کوئی عورت ہے.... دیکھو، کیا کر رہی ہے۔"

اُس وقت نسیمہ بازو لہرا لہرا کر کہہ رہی تھی — "نہیں۔ منیر! مجھے جانے دو۔ اگر تمہیں مجھ سے اتنی محبت ہے تو مجھے اپنا خون معاف کر دو۔"

"کوئی ٹُونہ کر رہی ہے" — ایک نے کہا۔

"اکیلی نہیں ہو سکتی" — دوسرے نے کہا — "کسی کو بُلا رہی ہے۔"

"پگلی معلوم ہوتی ہے" — تیسرے نے کہا — "چلو قریب چل کر دیکھتے ہیں۔"

"نہیں" — اُن میں سے ایک بولا — "ذرا پیچھے ہو جاؤ۔ دیکھتے ہیں یہ کیا کرتی ہے۔"

وہ دیکھتے رہے۔ نسیمہ نے اپنے دونوں ہاتھ اپنے چہرے پر رکھ لیے اور اُس نے بڑی زور سے چیخ ماری۔ پھر وہ تیورا کر گری، گری بھی ایسی بُری طرح کہ اُس کے قریب ایک بڑا سا پتھر پڑا ہُوا تھا۔ اُس کا سر پتھر پر لگا اور وہ بے ہوش ہوگئی۔

ان تین آدمیوں نے جب دیکھا کہ وہ نہ اُٹھتی ہے نہ ہلتی ہے تو وہ آگے چلے گئے اور نسیمہ تک جا پہنچے۔ تینوں نے اُس کے پاس بیٹھ کر دیکھا۔ وہ [illegible]

"[illegible]" — ان میں سے ایک نے کہا — "میں تو اسے [illegible]"

لگتا تا۔ اس اُجاڑ بیابان میں اتنی حسین اور نوجوان لڑکی انسان نہیں ہو سکتی۔ یہ کوئی اور چیز ہے۔"

"اس کے ہاتھ پاؤں تو سیدھے ہیں"۔۔۔ دوسرے نے کہا۔

"ہاں یار!"۔۔۔ تیسرا بولا۔۔۔ "اگر یہ ڈائن یا چڑیل ہے تو اسے بیہوش ہونے کی کیا ضرورت تھی۔"

"تھوڑی دیر دیکھ لو"۔۔۔ ایک نے مشورہ دیا۔

"صرف اسے ہی نہ دیکھتے رہو"۔۔۔ دوسرے نے کہا۔۔۔ "اُٹھ کر اِدھر اُدھر دیکھو۔ اس کے ساتھ کوئی آدمی ہو گا۔"

"یہ ہے تو انسان"۔۔۔ ایک نے کہا۔۔۔ "لیکن اس کا دماغ صحیح نہیں۔"

"ڈرتے کیوں ہو بزدلو!"۔۔۔ ایک اور نے کہا۔۔۔ "یہاں ایک خانقاہ ہے جہاں صرف عورتیں جایا کرتی ہیں۔ میرا خیال ہے یہ اُدھر جا رہی ہو گی یا واپس آ رہی ہو گی اور یہاں آ کر ڈر سے بیہوش ہو گئی ہے۔"

"جو کچھ بھی ہے، ہے ہیرا"۔۔۔ ان میں سے ایک ساتھی بولا۔۔۔ "اُٹھا لو اور چل پڑو۔ ہوش میں آئی تو دیکھا جائے گا۔"

ان میں سے ایک نے نسیمہ کو اس طرح اُٹھایا کہ نسیمہ کا پیٹ اس آدمی کے کندھے پر تھا۔ سر اور بازو پیچھے اور ٹانگیں اس آدمی کے آگے کو لٹک رہی تھیں۔ اُس کے ایک ساتھی نے نسیمہ پر اس طرح چادر ڈال دی کہ اُس کا سارا جسم چادر کے نیچے آ گیا۔

❖

یہ تینوں ایک جرائم پیشہ گروہ کے آدمی تھے۔ اگر انہیں اتنی حسین چڑیل بھی نظر آ جاتی تو وہ اسے بھی اُٹھا کر لے جاتے۔ آگے کا علاقہ اور زیادہ دشوار گزار تھا۔ ننگی چٹانیں بھی تھیں۔ گہرے گڑھے اور گھاٹیاں بھی تھیں اور اس سے ڈیڑھ دو میل آگے دریا تھا۔ اس علاقے میں صرف ایک خانقاہ تھی جہاں ایک بڑھیا مجاور بنی ہوئی موجود رہتی تھی۔ اس کے علاوہ اس علاقے میں دُور دُور تک کسی آبادی کا یا کسی انسان کا نام و نشان تک نہ تھا جہاں یہ علاقہ ختم ہوتا تھا وہاں سے گاؤں شروع ہو جاتے تھے۔ وہ تینوں اس مشکل علاقے میں چلتے گئے۔ کچھ

آگے جا کر نسیمہ کو دوسرے آدمی نے اپنے کندھے پر ڈال لیا۔ نسیمہ ابھی تک بیہوش تھی۔

وہ اب اُس علاقے میں جا رہے تھے جو نیچے ہی نیچے اُترتا جا رہا تھا۔ چٹانیں ختم ہو گئی تھیں اور ٹیلے اور کھڈ شروع ہو گئے تھے۔ اب نسیمہ کو تیسرے آدمی نے اٹھا رکھا تھا۔ اچانک نسیمہ کا جسم تڑپا پھر وہ ہوش میں آ گئی۔

"مجھے چھوڑ دو منیر!"۔۔۔ نسیمہ تڑپ تڑپ کر کہنے لگی۔۔۔ "کہاں لے جا رہے ہو؟ تم مر گئے ہو۔ مجھے زندہ رہنے دو۔"

جس آدمی نے اُسے اُٹھا رکھا تھا اُس نے نسیمہ کو زمین پر کھڑا کر دیا۔ نسیمہ نے تینوں کو باری باری دیکھا۔ ان میں اُسے منیر نظر نہ آیا۔ ان میں دو سکھ تھے اور ایک مسلمان۔

"کون ہو تم؟"۔۔۔ نسیمہ نے رندھی ہوئی آواز میں پوچھا۔۔۔ "مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟"

"حوصلہ کر لڑکی!"۔۔۔ ایک نے کہا۔۔۔ "پہلے یہ بتا کہ تُو وہاں کیا کر رہی تھی۔"

"اُف خُدایا!"۔۔۔ نسیمہ نے دونوں ہاتھوں سے اپنا سر پکڑ کر کہا۔۔۔ "میرے سر میں اتنا درد کیوں ہے؟ کیا تم لوگوں نے میرے سر پر ضرب لگا کر مجھے بیہوش کیا تھا؟"

"نہیں بی بی!"۔۔۔ اُن میں سے ایک نے کہا۔۔۔ "تُو خود بیہوش ہو کر گری تھی۔۔۔ کہاں کی رہنے والی ہے تُو، اور کہاں جا رہی تھی؟"

"میں نندہ شہر کی رہنے والی ہوں"۔۔۔ نسیمہ نے اُکھڑی اُکھڑی سی آواز میں کہا۔۔۔ "اور میں خانقاہ کی طرف جا رہی تھی۔"

"تُو راستے میں کھڑی کیا کر رہی تھی؟"

"بارش نہیں برسی تھی؟"۔۔۔ نسیمہ نے پوچھا۔ پھر بیدار ہو گئی اور بڑے غصے میں بولی۔۔۔ "تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟ میں اس وقت کہاں ہوں؟"

اُن آدمیوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ نسیمہ کا دوپٹہ اُس کے

سر پر نہیں اُس کے کندھوں پر تھا۔ ایک آدمی نے جھپٹ کر اُس کا دوپٹہ کھینچ لیا۔ دوسرے نے نسیمہ کو بازوؤں میں دبوچ لیا۔ بڑی تیزی سے اُنہوں نے دوپٹہ نسیمہ کے مُنہ پر باندھ دیا۔ دوپٹے کے دوسرے سرے سے اُنہوں نے اُس کے ہاتھ پیچھے کر کے باندھ دیئے۔

دن کا وقت تھا۔ اس وقت وہ ایک لڑکی کو اُٹھا کر اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتے تھے۔ اُنہیں بڑی دُور جانا تھا۔ وہ جہاں رُکے ہُوئے تھے اس جگہ اُونچے اُونچے ٹیلے تھے۔ چھُپنے کے لئے وہ جگہ اچھی تھی۔ یہ عام گذر گاہوں سے بہت دُور ہٹی ہوئی جگہ تھی۔ اُن تینوں نے یہ فیصلہ کیا کہ شام تک وہیں چھُپے رہیں گے۔ اندھیرا ہو جائے گا تو چلیں گے۔ نسیمہ تڑپ رہی تھی۔

"دیکھ لڑکی!" — ایک نے اُسے کہا — "کیوں تڑپتی ہو۔ اپنے آپ کو تکلیف نہ دو۔ ہم تجھے چھوڑیں گے نہیں۔ اپنے اُستاد کے پاس لے جائیں گے۔ وہ چھوڑنا چاہے گا تو تجھے چھوڑ دے گا۔ آرام سے پڑی رہو۔ ہم تجھے کوئی اور تکلیف نہیں دیں گے۔"

❖

شام ہونے کو آئی تھی، نسیمہ ابھی گھر نہیں پہنچی تھی۔ شوکت سکول سے آیا تو نوکرانی نے اُسے کھانا کھلا دیا تھا۔ وہ بار بار پوچھتا تھا کہ امی کب آئے گی۔ باپ کے کہنے پر وہ نسیمہ کو امی کہتا تھا۔ نوکرانی نے اُسے بتا دیا تھا کہ نسیمہ خانقاہ بیبیاں والی پر سلام کے لئے گئی ہے۔ نوکرانی کو معلوم تھا کہ نسیمہ کا آنا جانا کون کون سے گھر میں ہے۔ وہ اِس خیال سے اُن گھروں سے پتہ کر آئی تھی کہ نسیمہ واپس آ کر کسی کے گھر چلی گئی ہو گی۔ نوکرانی کو کسی بھی گھر میں نسیمہ نہ ملی۔ نوکرانی جانتی تھی کہ نسیمہ اپنی ماں کے ہاں نہیں گئی ہو گی کیونکہ ماں بیٹی کا ملنا ملانا بند ہو چکا تھا، پھر بھی نوکرانی نسیمہ کو اُس کی ماں کے گھر بھی دیکھ آئی تھی۔ نوکرانی کسی اور بہانے گئی تھی۔ اُس نے وہاں یہ ظاہر نہیں ہونے دیا تھا کہ وہ نسیمہ کو دیکھنے آئی ہے۔

"شوکی بیٹے!" — اُس نے آخر تنگ آ کر اور پریشان ہو کر عمر حیات

کے بیٹے سے کہا — "اپنے ابا کے پاس جاؤ اور انہیں کہو کہ امی دس بجے کے لگ بھگ خانقاہ بیبیاں والی پر جانے کے لئے گھر سے نکلی تھی اور ابھی تک واپس نہیں آئی۔"

عمر حیات اپنی کمیشن ایجنسی کے دفتر میں بیٹھا تھا جو بازار میں تھا۔ شوکی کبھی کبھی وہاں جایا کرتا تھا۔ اُس روز بھی وہ چلا گیا اور اپنے باپ کو بتایا کہ امی صبح کی گئی ہوئی ابھی تک واپس نہیں آئی۔ عمر حیات دوڑا آیا۔ اُس کے دو نوکر بھی اُس کے ساتھ آ گئے۔ نوکرانی نے اُسے بتایا کہ وہ ہر اُس گھر میں دیکھ آئی ہے جہاں نسیمہ کے جانے کی امید ہو سکتی تھی۔

عمر حیات کو پہلا خیال یہ آیا کہ تھانے اطلاع کر دے۔ اُس نے اپنے ان دو خاص آدمیوں کو بلایا جنہوں نے مستانے کی پٹائی کی تھی۔ عمر حیات نے ان جیسے پانچ سات آدمی اپنے ہاتھ میں رکھے ہُوئے تھے۔ اُس نے اِن دو آدمیوں کو بتایا کہ نسیمہ خانقاہ پر گئی تھی اور واپس نہیں آئی۔ انہوں نے عمر حیات سے کہا کہ پہلے اُدھر چل کر دیکھ لیتے ہیں جدھر وہ گئی تھی۔

سورج غروب ہو چکا تھا۔ انہوں نے ٹارچیں ساتھ لے لیں اور چل پڑے۔ کھڈوں اور گڑھوں کے علاقے میں گئے تو شام گہری ہو چکی تھی۔ وہ سب الگ الگ ہو کر ٹارچوں کی روشنی میں کھڈوں اور اُونچی گھاس میں دیکھنے لگے اور خانقاہ کی طرف بھی بڑھتے گئے۔ ٹارچوں کی روشنی میں وہ ہر طرف دیکھتے جا رہے تھے۔ عمر حیات کے آدمی زمین پر کوئی کھُرا کھوج ڈھونڈ رہے تھے۔

خانقاہ کے اندر مٹی کا دیا جل رہا تھا اور خانقاہ کی مجاور بڑھیا دہلیز پر بیٹھی تھی۔ اُس سے نسیمہ کے متعلق پوچھا تو اُس نے بتایا کہ دن کے پچھلے پہر چار پانچ عورتیں آئی تھیں۔

"دس گیارہ بجے کے درمیان!" — عمر حیات نے کہا — "بڑی خوبصورت اور نوجوان لڑکی تھی۔ اُس نے انگوری رنگ کا سُوٹ پہنا ہُوا تھا۔ دوپٹہ بھی انگوری تھا۔"

"نہیں" — بڑھیا نے کہا — "نہیں آئی۔ اُس وقت کوئی عورت آئی ہی نہیں .... اگر وہ نوجوان اور خوبصورت تھی تو چلی گئی ہے یا اُسے

لے گئے ہیں۔"

"کہاں چلی گئی ہے؟"——عمر حیات نے پوچھا ——"اُسے کون لے گیا ہے؟"

"اللہ کے سوا اور اس لڑکی کے سوا کون بتا سکتا ہے؟"——بڑھیا نے کہا ——"جوانی اندھی ہوتی ہے، اندھے راستوں پر ڈال دیتی ہے ..... تمہاری لڑکی اِدھر اکیلی آئی ہی کیوں تھی؟ یہ علاقہ دیکھو۔ تم نے ڈاکوؤں، رہزنوں اور جوان لڑکیوں کو اُٹھا لے جانے والوں کے قصے نہیں سنے؟ سب جانتے ہیں کہ اس خانقاہ پر صرف عورتیں آتی ہیں۔ کوئی عورت اکیلی نہیں آتی۔"

"نہیں آئی ملک صاحب!"——عمر حیات کے ایک آدمی نے کہا ——"یہاں تک پہنچی ہی نہیں۔"

"پھر؟"

"پھر کیا!"——عمر حیات کے ایک آدمی نے کہا ——"ہم آرام سے بیٹھ تو نہیں جائیں گے۔ کچھ کریں گے۔"

"رات گزرنے دیں"——دوسرے آدمی نے کہا ——"صبح پہلا کام یہ کریں کہ تھانے رپورٹ لکھوا دیں۔ باقی کام ہم کریں گے۔"

"اللہ کرے ہمارے پہنچنے تک وہ گھر آگئی ہو"——عمر حیات نے کہا۔

❖

نسیمہ ایک اور گھر میں پہنچ چکی تھی۔ اُس کا مُنہ کھول دیا گیا تھا۔ اُس کے ہاتھ بھی کھول دیئے گئے۔ اُس پر غشی طاری ہو رہی تھی اور وہ اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اُسے ٹھنڈا دُودھ پلایا گیا تھا۔ تھکن نے اُس کا جسم توڑ دیا تھا۔ وہ ایسے کمرے میں تھی جو پکے مکان کا کمرہ معلوم ہوتا تھا۔ اس میں دو بڑے اچھے پلنگ بچھے تھے۔ کمرہ دیہاتی انداز سے سجا ہُوا تھا۔ اس سے اسے پتہ چلتا تھا کہ کوئی گاؤں ہے۔ ایک پلنگ پر ایک سکھ بیٹھا ہُوا تھا۔ اُسے ان آدمیوں نے جو نسیمہ کو لاتے تھے، گہری نیند سے جگایا تھا۔ اُس پر ابھی تک غنودگی طاری تھی جس میں رات کی دیسی شراب کا بھی اثر تھا۔ اُس نے نسیمہ کو دیکھا تو دیکھتا ہی رہ گیا تھا۔ نسیمہ رو رہی تھی اور ان سب کو گالیاں دے رہی تھی۔

"اپنا خُون نہ جلا کاکی!"——پلنگ پر بیٹھے ہُوئے سکھ نے اونگھتی ہُوئی آواز میں نسیمہ سے کہا ——"یہ پلنگ خالی پڑا ہے اس پر لیٹ جا۔ میں بھیڑیا نہیں کہ تجھے کھا جاؤں گا .... مجھے یہ بتا، اِن آدمیوں نے راستے میں تمہارے ساتھ بدمعاشی تو نہیں کی تھی؟"

"بدمعاشی تو نہیں کی"——نسیمہ نے غصیلی آواز میں کہا ——"لیکن اسے تم نیکی سمجھتے ہو کہ میں خانقاہ کی طرف اکیلی جا رہی تھی اور راستے میں معلوم نہیں کیا ہُوا کہ میں گِر پڑی، میرا سر شاید پتھر پر لگا جس سے میں بیہوش ہو گئی اور یہ آدمی مجھے اُٹھا کر لے آئے۔"

اُن تینوں آدمیوں نے پوری رات نسیمہ کے ساتھ پیدل سفر کیا تھا۔ اسے اُنہوں نے باری باری اُٹھایا بھی تھا کہ لڑکی تھک نہ جائے، لیکن اُس کے ساتھ اُنہوں نے ذرا سی چھیڑ خانی بھی نہیں کی تھی۔ وہ جب اِس گاؤں میں پہنچے تھے اُس وقت صبح کی اذان ہو رہی تھی۔ صبح ابھی تاریک تھی۔ اُنہوں نے اِس سکھ کو جگایا اور لالٹین جلا کر نسیمہ پیش کی تھی۔ اس سکھ نے گالیاں دے کر اپنے ان آدمیوں سے پوچھا تھا کہ انہوں نے اُسے کیوں جگایا ہے لیکن لالٹین کی روشنی میں ایک حسین لڑکی کو دیکھ کر وہ اُچھل کر اُٹھا تھا۔ ان آدمیوں کو اُس نے باہر نکال دیا تھا۔ نسیمہ کو معلوم نہیں تھا کہ وہ کہاں ہے اور اپنے قصبے نندہ سے کتنی دُور آگئی ہے۔ اُسے اپنا انجام بڑا ہی بھیانک دکھائی دے رہا تھا۔

"میں تمہارے ساتھ ایک سودا کرتی ہوں"——نسیمہ نے کہا ——"مجھے میرے گھر پہنچا دو۔ جتنی رقم پر مجھے کسی اور کے ہاتھ بیچو گے اس سے کچھ زیادہ رقم تمہیں میرے خاوند سے مل جائے گی۔"

"تجھے کِس نے بتایا ہے کہ میں تجھے بیچوں گا؟"——سکھ نے پوچھا۔

"تمہارے اِن آدمیوں نے راستے میں بتایا تھا"——نسیمہ نے

جواب دیا۔

"نہیں کاکی!" ـــ سکھ نے مخمور سی آواز میں کہا ـــ "تجھ جیسے ہیرے کو کون بیچتا ہے۔ تجھ جیسا موتی کس کے ہاتھ آتا ہے؟ میں تجھے اپنے پاس رکھوں گا.... اپنے سینے کے ساتھ لگا کر رکھوں گا۔ تجھے رانی بنا کر رکھوں گا۔ یہ جو تجھے اُٹھا کر لے آتے ہیں، یہ اور ان جیسے کئی اور تیرے حکم کے غلام ہوں گے۔ تُو فخر سے کہا کرے گی کہ میں ماہن سنگھ کی بیوی ہوں"

"ماہن سنگھ ڈاکو" ـــ نسیمہ نے طنزیہ کہا۔

"تو اور کیا!" ـــ سکھ نے کہا ـــ "میں مولوی ماہن سنگھ نہیں، ڈاکو ہوں۔ اس علاقے کی لڑکیاں تجھے دیکھ کر جلیں گی.... ابھی کچھ نہ سوچ.... کیا نام ہے تیرا؟ .... ہاں، نسیمہ.... شہروں کے لوگ لڑکیوں کے اسی طرح کے نام رکھا کرتے ہیں۔ سو جا، آرام کر لے۔ تجھے کوئی نہیں چھیڑے گا۔ میں بھی تجھے تنگ نہیں کروں گا.... اور ہاں، یہ سوچ لے۔ تُو یہاں سے بھاگ نہیں سکے گی۔ بھاگے گی تو اس گاؤں کا کوئی نہ کوئی آدمی تجھے پکڑ کر یہاں چھوڑ جائے گا۔ دن چڑھے گا تو اس حویلی کے اندر کھُلی پھرتی رہنا.... لیٹ جا، لیٹ جا!"

ماہن سنگھ لیٹ گیا اور فوراً ہی اُس کے خراٹے سنائی دینے لگے۔ نسیمہ کے جسم سے ایک تو خوف نے جان نکال لی تھی، دوسرے ساری رات کے سفر کی تھکان تھی۔ وہ اس طرح لیٹ گئی جیسے بیہوش ہو گئی ہو۔

نسیمہ کی جب آنکھ کھُلی اُس وقت سورج خاصا اُوپر آ چکا تھا۔ وہ ہڑبڑا کر اُٹھی۔ ماہن سنگھ اپنے پلنگ پر نہیں تھا۔ وہ اُٹھ کر باہر نکلی۔ یہ ایک کھُلا صحن تھا جس کے ایک طرف دو کمرے تھے۔ ان کے بالمقابل ایک دیوار تھی۔ اس دیوار کے ساتھ ایک کھُرلی تھی جس کے ساتھ ایک گھوڑی بندھی ہوتی تھی۔ اس دیوار کے ساتھ نیم کے دو درخت بھی تھے۔ دونوں پھیل کر صحن کی طرف بھی آئے ہوئے تھے اور دیوار کے اُوپر سے باہر بھی گئے ہوئے تھے۔

اس گھر میں کوئی عورت نظر نہیں آتی تھی۔ وہ ٹہلتے ٹہلتے رسوئی میں چلی گئی۔ وہاں المونیم کی چھوٹی بڑی دیگچیاں، چند ایک پلیٹیں اور لمبے لمبے گلاس

بکھرے ہوئے تھے۔ صاف پتہ چلتا تھا کہ اس باورچی خانے میں کسی عورت کا عمل دخل نہیں۔ وہ جب رسوئی سے نکلی تو ڈیوڑھی میں سے ایک سکھ نکلا۔ نسیمہ اُسے دیکھ کر ڈر گئی۔

"مت ڈرو" ـــ سکھ نے اُسے کہا ـــ "تم اب ماہن سنگھ کی چیز ہو۔ میں نہانے کے لئے پانی رکھ دیتا ہوں۔ تم نہا لو۔ پھر میں تمہارے لئے کھانا لے آؤں گا"

"میرے لئے صرف دُودھ اور روٹی لانا" ـــ نسیمہ نے اس خیال سے کہا کہ اُنہوں نے اگر گوشت پکایا ہے تو وہ حلال نہیں ہو گا۔

نسیمہ جب نہا کر نکلی تو اُس نے محسوس کیا کہ اُس کی طبیعت پر جو بوجھ آ پڑا تھا وہ کچھ کم ہو گیا ہے۔ اُس کا دماغ سوچنے کے قابل ہو گیا۔ تھوڑی دیر بعد سکھ اُس کے سامنے چنگیر میں روٹی رکھ گیا جس پر مکھن کا ایک پیڑہ رکھا ہوا تھا۔ چینی کے ایک بڑے پیالے میں کم و بیش نصف سیر گرم دُودھ تھا۔ سکھ باہر نکل گیا۔

"یہ جواب نہیں" ـــ نسیمہ نے اپنے آپ سے کہا ـــ "اور یہ میرا قصور بھی نہیں۔ مجھے یہ حقیقت قبول کرنی پڑے گی"

"نہیں" ـــ اُس کی ذات سے ایک آواز اُٹھی ـــ "تم نے اپنی عصمت بچانے کے لئے ایک آدمی کو قتل کر دیا تھا.... تم بدکار تو نہیں"

"پھر کیا کروں؟" ـــ یہ سوال اُسے پریشان کرنے لگا ـــ "کیا میں یہاں سے بھاگ سکتی ہوں؟ کسی کی مدد کے بغیر یہاں سے کیسے نکلوں گی؟"

"خدا کو مت بھُول نسیمہ!" ـــ اُسے جیسے کسی اور کی آواز سنائی دی ہو ـــ "قسم کھا لے کہ عصمت کے موتی کو داغدار نہیں ہونے دوں گی"

اُس نے اپنے زانو پر بڑی زور سے ہاتھ مارا۔ وہ بدک گئی جیسے یہ ہاتھ کسی اور کا تھا جو اُس کے زانو پر پڑا تھا۔ ہاتھ کی اس ضرب سے وہ مکمل طور پر بیدار ہو گئی اور اس کے ساتھ ہی اُس کی وہ قوتیں بیدار ہو گئیں جن سے وہ آگاہ نہیں تھی۔ یہی وہ قوتیں تھیں جو اُس وقت مرکوز ہو گئی تھیں جب اپنے

گھر میں نسیمہ نے منیر کی شہ رگ اپنے پنجے میں جکڑ لی تھی، اور یہی وہ قوتیں تھیں جو اُس وقت مرکوز ہو گئی تھیں جب موسلادھار بارش میں چٹانی نالے کے کنارے پر منیر نے اُس کی عصمت پہ ہاتھ ڈالا تھا اور نسیمہ نے اُسے موت کے مُنہ میں دھکیل دیا تھا۔

نسیمہ اپنی نفسیات کو نہیں سمجھتی تھی۔ وہ صرف یہ محسوس کر رہی تھی کہ اِن سکھوں کے سامنے وہ اتنی آسانی سے ہتھیار نہیں ڈالے گی۔ اپنے آپ کو وہ اُس وقت کے لئے تیار کرنے لگی جب ماہن سنگھ اپنے کمرے میں اُسے کہے گا کہ تم میری بیوی ہو۔ نسیمہ نے دماغ پر بہت زور دیا، لیکن اُسے کوئی طریقہ نجات کا اور فرار کا نہ سُوجھا۔

وہ وقت اُس روز کا سُورج غروب ہوتے ہی آگیا۔ ماہن سنگھ آچکا تھا۔ اُس کے ساتھ تین چار آدمی تھے جو بہت دیر اُس کے پاس بیٹھے رہے۔ اس دوران نسیمہ دوسرے کمرے میں رہی۔ شام کو بھی اُس نے دُودھ کے ساتھ روٹی کھائی۔ وہ حیران ہو رہی تھی کہ اُسے ڈرنا چاہیئے تھا، لیکن ایک یقین سا تھا کہ اُس کی رات آج اس گھر میں نہیں گزرے گی۔ اُس نے خُدا کو صرف ایک بار پکارا تھا۔ اس یقین میں یہ خیال بھی شامل تھا کہ وہ فرار نہیں ہو سکے گی، قتل ہو جائے گی۔

اُس نے اپنے آپ کو قتل ہونے کے لئے ذہنی طور پر تیار کر لیا۔

سب لوگ چلے گئے۔ ماہن سنگھ آیا اور اُسے اپنے کمرے میں لے گیا۔

نسیمہ نے دیکھا کہ دونوں پلنگوں کے درمیان ایک تپائی رکھی تھی جس پر شراب کی بوتل، دو گلاس اور ایک پلیٹ رکھی تھی جس میں بُھنا ہُوا گوشت تھا۔

"بیٹھ جا کاکی!" — ماہن سنگھ نے کہا۔

نسیمہ پلنگ پر بیٹھ گئی اور ماہن سنگھ شراب کی بوتل اُٹھا کر دوسرے پلنگ پر بیٹھ گیا۔ وہ بوتل کھول کر گلاس میں انڈیلنے لگا تو بڑی زور کی گرج سنائی دی۔ ایسے لگا جیسے شراب نے گلاس میں گر کر یہ گرج پیدا کی ہو۔ اس کے ساتھ ہی کُھلے ہُوئے دروازے میں سے بڑی زور کی چمک آئی۔ ماہن سنگھ

نے اُوپر دیکھا۔

"کتنا پیارا موسم ہے!" — ماہن سنگھ نے کہا — "بارش ہو جائے تو مزہ آجائے۔"

نسیمہ چُپ چاپ اُسے دیکھتی رہی۔ گھٹا پھر گرجی۔ رات ایک بار پھر روشن ہو کر تاریک ہو گئی۔ ماہن سنگھ نے دونوں گلاسوں میں شراب ڈال دی اور ایک گلاس نسیمہ کی طرف سرکا دیا۔

"میں شراب تو نہیں پیوں گی" — نسیمہ نے کہا۔

ماہن سنگھ احمقوں کی طرح ہنس پڑا۔

"میں تجھے زبردستی تو نہیں پلاؤں گا" — ماہن سنگھ نے کہا — "میری صرف ایک بات مان لو... اپنے ہاتھ سے مجھے پلا دو۔"

نسیمہ نے ایک گلاس اُٹھایا اور اُس کے ہاتھ میں دے دیا۔ ماہن سنگھ یوں پی گیا جیسے پانی پیتے ہیں۔ نسیمہ نے دوسرے گلاس میں جو شراب تھی، وہ اُس کے گلاس میں انڈیل دی۔ ماہن سنگھ وہ بھی پی گیا۔ پھر وہ چار یا پانچ بوٹیاں گوشت کی کھا گیا۔ نسیمہ نے گوشت کھانے سے بھی انکار کر دیا تھا۔

اچانک باہر موسلادھار بارش کا شور اُٹھا۔ کمرہ ٹھنڈا ہونے لگا۔

"تمہاری بیوی کوئی نہیں؟" — نسیمہ نے پوچھا۔

"بیویاں تو اس گھر میں آتی رہی ہیں" — ماہن سنگھ نے قہقہہ لگا کر کہا — "لیکن میں نے کبھی شادی نہیں کی .... تمہارے ساتھ شادی کروں گا۔ کیا تم میری بیوی بن کر خوش نہیں ہو گی؟"

"ماہن سنگھ!" — نسیمہ نے اُس کے گلاس میں شراب ڈالتے ہُوئے کہا — "تم ڈاکو ہو جس کا مطلب یہ ہے کہ تم بڑے زبردست آدمی ہو۔ میں تمہیں اپنے متعلق کچھ بتا دینا چاہتی ہوں .... مجھے شک ہے کہ میں انسان نہیں ہوں۔ میں کوئی شر شرارہ ہوں یا کسی شر شرارہ کا مجھ پر اثر ہے۔ پہلے میرے گھر میں پتھر گرتے رہے اور کپڑوں کو اپنے آپ ہی آگ لگتی رہی۔ میرا کوئی نقصان نہیں ہُوا۔ پھر میرے گھر میں رات کے وقت دو ڈاکو آئے۔

گھر میں صرف میں تھی اور میرا خاوند تھا، لیکن ان ڈاکوؤں کے پیچھے میرے گھر میں ایک ایسا آدمی آگیا جو ہمارا دشمن تھا۔ اُسے دیکھ کر ایک ڈاکو بھاگ گیا اور دوسرا پکڑا گیا.... پھر یہی آدمی جس نے میرے گھر کو ڈاکوؤں سے بچایا تھا، میری عزت کے پیچھے پڑ گیا....

"ماہن سنگھ! تم بھی بڑے سخت آدمی ہو، لیکن یہ آدمی کچھ کم نہیں تھا۔ امیر ماں باپ کا خوبصورت بیٹا تھا۔ وہ سچ مچ کا شہزادہ لگتا تھا۔ اُس نے ایک ویران جگہ مجھے روک لیا اور زبردستی مجھے زیر کرنے کی کوشش کرنے لگا۔ میں اُس کے بڑے مضبوط بازوؤں کے شکنجے میں آگئی تھی، لیکن میرے اندر کے شہ شرار نے ایسا جھٹکا دیا کہ وہ ایک گہرے نالے میں جا گرا جہاں نیچے بڑے بڑے نوکیلے پتھر تھے اور اُوپر سے سیلاب گر رہا تھا۔ وہ زندہ نہیں رہا۔ آج تک اُس کی لاش نہیں ملی۔"

"واہ شیر کی بچی!" — ماہن سنگھ نے نعرہ لگانے کے انداز سے کہا — "مجھے تجھ جیسی بیوی چاہیئے" — اُس نے خالی گلاس نسیمہ کی طرف سرکا دیا۔ نسیمہ نے اس میں پہلے سے زیادہ شراب ڈال دی۔ ماہن سنگھ جو پہلے ہی جھومنے لگا تھا، وہ گلاس بھی چڑھا گیا۔

"نہیں ماہن سنگھ!" — نسیمہ نے کہا — "میں نے اپنی کوئی صفت بیان نہیں کی۔ میں تمہیں یہ بتانا چاہتی ہوں کہ میں تمہارے ساتھ رہی تو کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں مجھ سے کوئی نقصان پہنچے۔"

"اس وہم کو دماغ سے نکال دے کاکی!" — ماہن سنگھ نے قہقہہ لگا کر کہا — "ماہن سنگھ سے تو جن بھوت بھی ڈرتے ہیں .... آ اور میرے پاس بیٹھ۔"

اب ماہن سنگھ کے قہقہے اور اُس کی زبان سے نکلنے والی باتیں ڈگمگا رہی تھیں۔ کوئی طاقت ایسی تھی جو نسیمہ کو بتا رہی تھی کہ شراب اس شخص کی قوتیں اور اس کی مردانگی بہت حد تک سلب کر چکی ہے۔ یہ تھوڑی سی اور پی گیا تو یہ بیکار ہو جائے گا۔

"تھوڑی سی اور" — نسیمہ نے کہا — "میرے ہاتھ سے تھوڑی سی اور پی لو" — نسیمہ نے گلاس میں اور شراب ڈال دی۔

"لا" — ماہن سنگھ نے جھومتی ہوئی آواز میں کہا — "اپنے پیار کے دو گھونٹ اور پلا دے" — اُس نے نسیمہ کے ہاتھ سے گلاس لیا اور ہونٹوں سے لگا لیا۔ گلاس خالی کر کے اُس نے بڑی زور سے گلاس تپائی پر رکھا اور بولا — "اب آجا اور اپنی جوانی کا نشہ پلا دے۔"

نسیمہ بڑی تیزی سے اُٹھی۔ اُس کا دایاں ہاتھ کسی درندے کا پنجہ بن گیا۔ اُس پر کسی شہ شرارہ کا یا پاگل پن کا وہی دَورہ پڑ گیا جو حسنین کاظمی نے اُس کے ہاتھ کی لکیروں میں دیکھا تھا۔ بادل بڑی زور سے گرجے۔ بارش اتنی تیز ہو گئی جیسے چھت پر گھوڑے دوڑ رہے ہوں۔ ماہن سنگھ نے بازو پھیلا رکھے تھے۔ نسیمہ کا ہاتھ ماہن سنگھ کی گردن پر تیر کی طرح گیا اور اُس کی شہ رگ نسیمہ کے پنجے میں آگئی۔

ماہن سنگھ کو شراب نے پہلے ہی اَدھ مُوا کر رکھا تھا۔ وہ پلنگ پہ پیٹھ کے بل گرا اور تڑپنے لگا۔ نسیمہ کا بایاں ہاتھ میز کی طرف گیا۔ اُس نے شراب کی بوتل اُٹھائی اور پوری طاقت سے بوتل ماہن سنگھ کے ماتھے پر ماری۔ پھر ایک اور ضرب اُسی جگہ اتنے ہی زور سے لگائی۔ نسیمہ کے دائیں ہاتھ کی انگلیاں ماہن سنگھ کی شہ رگ میں جیسے اُتر گئی تھیں وہ ماتھے کی ضربوں سے اور دم گھٹنے سے بے حس ہو گیا۔

نسیمہ نے اُس کی شہ رگ چھوڑ دی۔ بوتل پھینک دی اور صحن میں چلی گئی۔ یہ اُسی روز کی طرح کی بارش تھی جس روز اُس نے منیر کو آبشار والے نالے میں دھکا دیا تھا۔ وہ پہلے ڈیوڑھی کی طرف جانے لگی لیکن اس خیال سے رُک گئی کہ وہاں کوئی نہ کوئی سویا ہُوا ہو گا۔ دن کے وقت اُس نے اس گھر کو اندر سے دیکھ لیا تھا۔ بجلی نے چمک کر اُسے ایک بار پھر ہر ایک چیز دکھا دی۔ اُسے کھُرلی نظر آئی۔ وہ کھُرلی تک پہنچی اور اس پر چڑھ گئی۔ اس کے ساتھ ہی نیم کا درخت تھا جس کا ایک ٹہن ذرا نیچے کو آیا ہُوا تھا۔ وہ ذرا سی اچھلی تو اُس کے ہاتھ ٹہن تک

پہنچ گئے۔ ٹہنی کو پکڑ کر وہ اُوپر کو اُٹھی۔ دیوار ساتھ ہی تھی۔ وہ دیوار پر چڑھ گئی۔ یہی ٹہنی دیوار کے اُوپر سے باہر کو چلا گیا تھا۔ اُس نے اسی ٹہنی کو پکڑا اور باہر کو لٹک گئی۔ ٹہنی کچھ نیچے ہو گیا۔ نسیمہ نے ٹہنی کو چھوڑ دیا اور زمین پر جا پڑی۔

بارش اُسے یہ فائدہ دے رہی تھی کہ باہر کوئی بھی نہیں تھا۔ وہ ایک طرف کو چل پڑی۔ تین چار مکانوں کے بعد گاؤں ختم ہو گیا۔ وہ اُسی طرف چلتی گئی۔ اُس کے پاؤں کیچڑ میں دھنس رہے تھے۔ ایک بار وہ پھسل کر گر بھی پڑی لیکن وہ رُکی نہیں۔ اُٹھی اور چل پڑی۔ اُس نے یہ سوچنے کی ضرورت ہی محسوس نہ کی کہ وہ کدھر جا رہی ہے۔ حیران وہ اس بات پر ہو رہی تھی کہ اُس کے دل میں خوف وہراس کا نام ونشان بھی نہ تھا۔ وہ چلی گئی۔

❖

ملک عمر حیات نے رات بھر نسیمہ کا انتظار کیا تھا۔ ذرا سی آہٹ پر عمر حیات دروازے کی طرف دوڑ پڑتا۔ اُس نے ساری رات اسی طرح جاگتے گزار دی۔ صبح ہوتے ہی اُس کے دونوں خاص آدمی اُس کے گھر آ گئے۔ عمر حیات نے جب انہیں بتایا کہ نسیمہ نہیں آئی تو اُس کے دونوں آدمیوں نے اسے کہا کہ اب انتظار نہیں کرنا چاہیئے۔ تھانے میں رپورٹ لکھوانا ضروری ہے۔

وہ اُسی وقت تھانے چلے گئے۔

"آیئے ملک صاحب!" — تھانیدار ملک مختار نے بڑی بے تکلفی سے ملک عمر حیات کا استقبال کیا — "کہیئے، آج آپ کو ہماری یاد کیسے آ گئی؟"

"عجیب مصیبت آ پڑی ہے ملک صاحب!" — عمر حیات نے پریشانی کے عالم میں کہا — "میری بیوی کل سے لاپتہ ہے۔"

"لاپتہ کس طرح ہو گئی؟" — تھانیدار نے پوچھا۔

"کل نوکرانی کو یہ کہہ کر گھر سے نکلی کہ خانقاہ بیبیاں والی پر جا رہی ہوں" — عمر حیات نے کہا — "میں گھر نہیں تھا۔ شام چار بجے کے بعد میرا بیٹا میرے پاس آیا اور اُس نے بتایا کہ امی صبح گھر سے نکلی تھی اور ابھی تک نہیں آئی۔"

"آپ کل شام میرے پاس کیوں نہ آ گئے؟"

"میں اِن آدمیوں کو جو باہر بیٹھے ہیں، ساتھ لے کر خانقاہ تک گیا" —

عمر حیات نے کہا — "وہاں ایک مجاور عورت ہے۔ اُس نے بتایا کہ خانقاہ پر دس گیارہ بجے کوئی عورت نہیں آئی۔ ان دو کے علاوہ میرے ساتھ دو اور آدمی بھی تھے۔ ہم سب نے ٹارچوں سے سارا علاقہ چھان مارا لیکن کوئی سراغ نہ ملا۔"

"ملک صاحب!" — تھانیدار نے گہرا سانس لے کر کہا — "آپ کو شاید معلوم ہی نہیں کہ آپ کے گھر میں کیا ہوتا رہا ہے اور کیا ہو رہا ہے ..... آپ صاحبِ حیثیت ہیں لیکن آپ کو اپنی حیثیت اور اپنی عزت کا ذرا سا بھی خیال نہیں۔"

"ملک صاحب!" — عمر حیات نے حیران ہو کر کہا — "میں کہہ رہا ہوں کہ میری بیوی لاپتہ ہو گئی ہے اور آپ بات کو کسی اور طرف لے جا رہے ہیں۔ آپ میری حیثیت کی کیا بات کر رہے ہیں؟"

"ملک عمر حیات صاحب!" — تھانیدار نے کہا — "منیر کی گمشدگی کی تفتیش میں مجھے ایسی بے شمار باتیں معلوم ہوئی ہیں جو آپ کے گھر کے اردگرد گھومتی ہیں .... میری بات غور سے سُنیں .... آپ کی بیوی کو کسی نے اغوا نہیں کیا۔ وہ خود گئی ہے۔"

"خود گئی ہے؟" — عمر حیات نے کہا۔

"جی ملک صاحب!" — تھانیدار نے کہا — "منیر بھی خود گیا ہے۔ اُس کی گھوڑی کا اُس کے بغیر گھر آنا ایک دھوکہ تھا جو اُس نے ہم سب کو دیا ہے۔ آپ کی بیوی کو اُس کا ٹھکانہ معلوم تھا۔ کل وہ بھی اُس کے پاس چلی گئی ہے۔"

"ملک مختار صاحب!" — عمر حیات نے کہا — "مجھے ٹالنے کا اور تفتیش سے بچنے کا کوئی اور بہانہ بنائیں، میری بیوی کو بدنام نہ کریں۔"

"ذرا غور کریں ملک صاحب!" — تھانیدار نے کہا — "ڈاکو آپ کے گھر میں داخل ہوئے اور منیر نے انہیں اندر آ کر پکڑا .... میں آپ کو بتاتا ہوں۔ منیر پہلے ہی آپ کے گھر میں موجود تھا۔ آپ کو معلوم نہیں تھا۔"

"وہ میرے گھر میں کیا کر رہا تھا؟"

"اس کا جواب آپ کی بیوی دے سکتی ہے" — تھانیدار نے کہا —

"ملک صاحب! آپ کی بیوی منیر کے پاس اُس کے سبزیوں کے باغ میں جاتی رہی ہے۔ منیر اُسے چاہتا تھا۔ آپ کی ساس کچھ اور چاہتی تھی۔ اس سارے چکر میں مستانے جیسے جرائم پیشہ افراد بھی شامل تھے۔ میں چونکہ منیر کی گمشدگی کے متعلق سنجیدہ نہ تھا، اس لئے میں نے آپ کی عزت کی خاطر آپ کو، آپ کی بیوی کو اور آپ کی ساس کو شاملِ تفتیش نہ کیا۔"

"تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ میری بیوی کی گمشدگی کے سلسلے میں کوئی کارروائی نہیں کریں گے؟" — عمر حیات نے کہا — "کیا مجھے ڈی۔ایس۔پی کے پاس جانا پڑے گا؟"

"میں کارروائی تو ضرور کروں گا" — تھانیدار نے کہا — "ڈی۔ایس۔پی کی بجائے آپ آئی۔جی کے پاس چلے جائیں۔ اس کا مجھ پر کوئی اثر نہیں پڑے گا۔ میں آپ کو بتا رہا ہوں کہ آپ کے گھر کے حالات کیا ہیں اور آپ ان سے ہمیشہ بے خبر رہے ہیں۔۔۔۔ آیئے، میں رپورٹ لکھتا ہوں۔"

تھانیدار رپورٹ لکھنے لگا لیکن عمر حیات کے مُنہ سے بات نہیں نکلتی تھی۔

تھانیدار نے ملک عمر حیات کو خاموش دیکھا تو اُس کے ہونٹوں پر طنزیہ سی مُسکراہٹ آگئی

"بولیں ملک صاحب!" — تھانیدار نے عمر حیات سے کہا — "پہلے اپنی بیوی کا حُلیہ لکھوائیں۔"

"ذرا ٹھہرو ملک مختار!" — عمر حیات نے تھانیدار سے کہا — "میں اس سے بہتر رپورٹ لکھوانے آؤں گا۔۔۔۔ بیوی کی گمشدگی کی رپورٹ تو بُزدل لکھوایا کرتے ہیں۔ میں قتل کی رپورٹ لے کر آؤں گا۔"

"کِس کے قتل کی رپورٹ؟"

"اپنی بیوی اور منیر کے قتل کی رپورٹ ملک مختار!" — عمر حیات کے لہجے میں اب عزم کی پختگی اور غصہ تھا۔ اُس کے لہجے سے یہ بھی پتہ چلتا تھا کہ اُس کی نظروں میں انسپکٹر ملک مختار کی کوئی عزت نہیں۔ وہ کہہ رہا تھا — "لیکن تمہیں قتل کی رپورٹ تمہارے ایس۔پی کی طرف سے ملے گی اور میں ایس۔پی سے کہوں گا کہ میرے ہاتھوں یہ دو قتل میرے تھانے کے ایس۔ایچ۔او، انسپکٹر مختار نے کراتے ہیں، اور میں اُسے یہ بھی کہوں گا کہ اس تھانیدار نے منیر کی گمشدگی کی تفتیش سے بچنے کے لئے قیاس آرائیاں کیں، میری بیوی پر الزام لگایا اور مجھے اشتعال دلا کر مجھ سے یہ دو قتل کرائے ہیں۔"

"ملک صاحب!" — ملک مختار نے زبردستی کی ہنسی ہنستے ہوئے کہا — "آپ کو معلوم نہیں آپ کیا کہہ رہے ہیں۔ میں تو۔۔۔۔"

"میں جو کہہ رہا ہوں سوچ سمجھ کر کہہ رہا ہوں" — عمر حیات نے کہا — "جو تفتیش تم نے نہیں کی وہ میں کروں گا۔ اگر مجھے منیر اور اپنی بیوی اکٹھے مل گئے تو تمہیں دونوں کی لاشیں ملیں گی۔۔۔۔ تم نے مجھے دیہاتی سمجھ لیا ہے جسے تم ڈرا کر بھگانا چاہتے ہو۔"

"میں تو کہہ رہا ہوں کہ اپنی بیوی کی گمشدگی کی رپورٹ لکھوائیں۔"

ملک مختار نے کہا ——"آپ نے مجھ پر رُعب جمانا شروع کر دیا ہے۔"

"رپورٹ لکھواؤں گا ملک مختار صاحب!"——عمر حیات نے اُٹھتے ہوئے کہا ——"ایسی رپورٹ لکھواؤں گا کہ تمہارے ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔"

وہ تھانیدار کے کمرے سے نکل گیا۔ تھانیدار نے ایک ہیڈ کانسٹیبل کو آواز دی۔

"ملک عمر حیات کی ساس کا گھر تم جانتے ہو نا!"——انسپکٹر ملک مختار نے ہیڈ کانسٹیبل سے کہا۔

"بڑی اچھی طرح جانتا ہوں۔"

"اُسے فوراً اُٹھا لے آؤ"——ملک مختار نے کہا اور ایک ہی سانس میں تین چار گالیاں دے کر بولا——"یہ لوگ اتنی عزت کے قابل نہیں۔"

"اب کیا ہو گیا ہے؟"——ہیڈ کانسٹیبل نے پوچھا۔

"ملک کی بیوی لاپتہ ہو گئی ہے"——ملک مختار نے کہا——"وہ گئی منیر کے پیچھے ہے۔"

"ملک صاحب!"——ہیڈ کانسٹیبل نے کہا——"انیس سال اور چار مہینے سروس ہو گئی ہے۔ اس تھانے میں مجھے پانچ سال ہو گئے ہیں۔ شہر کے بچے بچے کو جانتا ہوں۔ لکھ لیں، منیر مارا گیا ہے، اور مارا بھی ہندوؤں کے ہاتھوں گیا ہے۔"

"پھر ملک کی بیوی کہاں گئی ہے؟"——ملک مختار نے پوچھا۔

"یہ اُس کی ماں بتا سکتی ہے"——ہیڈ کانسٹیبل نے جواب دیا اور مُخبروں کی رپورٹیں سُنا کر کہا——"ملک کی ساس کو ذرا رگڑیں۔ میں اُسے لے آتا ہوں۔"

ہیڈ کانسٹیبل چلا گیا۔ ملک مختار کو احساس تھا کہ ملک عمر حیات معمولی آدمی نہیں۔ پڑھا لکھا ہونے کے علاوہ وہ روپے پیسے والا بھی تھا اور میل ملاقات والا بھی۔ شہر میں اُس کی حیثیت اچھی تھی۔ حیثیت والے ہندو اور سکھ بھی اُس کی عزت کرتے اور اُس کی حیثیت کو مانتے تھے۔ انسپکٹر ملک مختار اُس

کی دھمکی سے دبک گیا تھا اور محسوس کرنے لگا تھا کہ اُسے منیر کی گمشدگی کی تفتیش کرنی ہی پڑے گی۔

وہ انہی سوچوں میں ڈوبا ہوا تھا کہ ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ اُس نے ریسیور اُٹھایا۔

"اوتے ملک مختار ہو؟"——دوسری طرف سے آواز آئی——"دو گھنٹوں بعد ایکسچینج نے تمہارا نمبر ملایا... نہال سنگھ بول رہا ہوں۔"

سب انسپکٹر نہال سنگھ ساتھ والے دیہاتی علاقے کے ایک تھانے کا ایس۔ایچ۔او تھا جو قصبے کے تھانے سے آٹھ میل دُور تھا۔

"بول بول نہالے! کیا حال ہے تیرا!"——ملک مختار نے دوستانہ بے تکلفی سے کہا——"دو گھنٹوں سے میرے نمبر کے پیچھے کیوں پڑا رہا ہے تو؟"

"یار! ایک بڑی خوبصورت اور بڑی جوان لڑکی ملی ہے"——نہال سنگھ نے کہا۔

"پھر موج کر نہالے!"——ملک مختار نے کہا——"مجھے کیا کہتا ہے؟"

"وہ تیرے تھانے کی ہے ملکا!"——نہال سنگھ نے کہا——"میرے تھانے سے دو میل دُور جنگل بیابان میں بیہوش پڑی تھی۔ رات بڑی زور کی بارش برستی رہی تھی۔ صبح سویرے سویرے ایک گاؤں کا نمبردار لڑکی کو چارپائی پر ڈلوا کر لے آیا۔ اس کے مُنہ میں پانی ڈالا، پھر دودھ قطرہ قطرہ مُنہ میں ڈالتے رہے اور وہ ہوش میں آگئی۔ وہ اپنا نام نسیمہ اور اپنے خاوند کا نام ملک عمر حیات بتاتی ہے اور کہتی ہے نندہ کی رہنے والی ہوں۔"

"پوچھا نہیں تُو نے گئی کہاں تھی؟"

"بیان لے لیا ہے یار!"——نہال سنگھ نے کہا——"کہتی ہے کل ایک خانقاہ کی طرف جا رہی تھی۔ شہر سے دُور نکل گئی تو اُسے چکر آگیا اور وہ گر پڑی۔ کہتی ہے اتنا یاد ہے کہ سر پتھر پر لگا تھا یا کسی نے پیچھے سے سر پر کچھ مارا تھا۔ وہ بیہوش ہو گئی۔ ہوش آئی تو وہ ایسی جگہ زمین پر پڑی تھی جہاں ہر طرف چٹانیں

اور اونچی گھاس تھی۔ تین آدمی اُس کے قریب بیٹھے ہُوئے تھے۔ دو سکھ تھے اور تیسرا ہندو تھا یا مسلمان۔ انہوں نے اسے ڈرایا کہ مُنہ سے آواز نہ نکالے۔ رات کو وہ اسے اپنے ساتھ لے گئے اور کسی گاؤں میں جا پہنچے ....

"ایک مکان میں اسے رکھا۔ کہتی ہے کہ ایک آدمی اس کے پاس آیا اور وہ شراب پینے لگا، پھر یہ آدمی سو گیا۔ اُس وقت بارش شروع ہو چکی تھی۔ لڑکی بیان دیتی ہے کہ وہ اُٹھ کر صحن میں گئی اور دیوار پھاند کر بھاگ آئی۔ بارش بڑی تیز تھی۔ لڑکی تھکن، بارش اور خوف سے کہیں بیہوش ہو گئی۔ صبح ایک آدمی نے اُسے دیکھا۔ اُس نے اپنے نمبردار کو بتایا ...."

"پھر لڑکی تیرے پاس پہنچ گئی"۔۔۔ ملک مختار نے اُس کی بات پُوری کرتے ہُوئے کہا۔۔۔ "اُس کے ساتھ گڑبڑ تو بہت ہوتی ہو گی۔"

"نہ ملکا!"۔۔۔ نہال سنگھ نے کہا۔۔۔ "کہتی ہے اُنہوں نے ایسی ویسی کوئی حرکت نہیں کی۔"

"یہ معاملہ کچھ اور ہے نہالے!"۔۔۔ ملک مختار نے کہا۔۔۔ "نندہ کا ایک جوان آدمی لاپتہ ہے۔ یہ لڑکی اُسی کے پاس گئی تھی۔ مجھے شک ہے کہ اس آدمی نے اسے خراب کر کے چھوڑ دیا ہے۔"

"اوئے سُن اوئے ملک مختار!"۔۔۔ نہال سنگھ نے طنزیہ کہا۔۔۔ "تجھے ابھی تک کسی نے لائن حاضر کیوں نہیں کیا۔ تُو اس لڑکی سے میری خلاصی کرا۔ اس کے خاوند کو اطلاع کر دے کہ آ کر اپنی بیوی کو شناخت کرے اور اسے لے جائے۔ وہ کہتی ہے کہ میری عزّت پر کسی نے ہاتھ نہیں ڈالا۔ وہ کسی کے خلاف پرچہ بھی نہیں کرانا چاہتی۔ وہ کسی کے پاس خود گئی تھی اور خراب ہو کر آئی ہے تو تجھے کیا؟ مجھے کیا؟ تُو بس اتنی مہربانی کر کہ اُس کے خاوند کو یہاں بھیج دے۔ تجھے اگر اپنے گمشدہ شخص کی تلاش ہے تو اس لڑکی سے پوچھ لینا .... اور سُن مختارے! اس کے خاوند سے کہنا کہ اس کے لئے کپڑوں کا جوڑا لیتا آئے۔ اس کے پہنے ہُوئے کپڑے کیچڑ سے بھرے ہُوئے ہیں۔"

"ابھی بھیجتا ہوں"۔۔۔ ملک مختار نے کہا۔۔۔ "اور سُنا، علاقے کا کیا

حال ہے!"

"چل رہا ہے ملکا!"۔۔۔ نہال سنگھ نے کہا۔۔۔ "آج کل ماہن سنگھ میرے علاقے میں آیا ہُوا ہے۔"

"پکڑتا نہیں؟"

"کیوں نہیں پکڑتا؟"۔۔۔ نہال سنگھ نے جواب دیا۔۔۔ "میرے تائے کا پُتر تو نہیں، پر ابھی پتہ نہیں چلا وہ کہاں ہے .... آدمی زبردست ہے۔"

"ہمت کر نہالے!"۔۔۔ ملک مختار نے کہا۔۔۔ "تیری انسپکٹری کھری ہے۔"

ماہن سنگھ اُس خطے کا مشہور ڈاکو تھا۔ تین بار پولیس کا گھیرا توڑ کر نکل گیا تھا۔ دیہات کے لوگوں کے ساتھ اُس کا سلوک اتنا اچھا تھا کہ وہ جس گاؤں میں جاتا وہاں کے لوگ کسی کو اُس کا پتہ نہیں چلنے دیتے تھے۔ پولیس کو کسی اور ذریعے سے اُس کی خبر ملتی تو پولیس کے آنے سے پہلے ہی گاؤں کے لوگ اُسے خبردار کر دیتے اور گاؤں سے نکال دیتے تھے۔ اُس نے کئی غریب ماں باپ کی لڑکیوں کو جہیز کے لئے رقم دی تھی۔ اُس کی وارداتیں ساہوکاروں اور جاگیرداروں کے ہاں ہُوا کرتی تھیں۔ اُس وقت وہ قتل کی دو اور ڈکیتی کی تین وارداتوں میں مطلوب تھا۔

نسیمہ نے سب انسپکٹر نہال سنگھ کو نہیں بتایا تھا کہ وہ ماہن سنگھ کو جان سے مار آئی ہے۔

◆◆◆

ٹیلیفون بند کر کے انسپکٹر ملک مختار نے ایک کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ ملک عمر حیات ابھی ابھی یہاں سے گیا ہے، اُسے بازار سے، گھر سے، جہاں کہیں گیا ہے، بلا لائے۔

عمر حیات ابھی آیا نہیں تھا کہ اُس کی ساس آ گئی۔

"دیکھ خاتون!"۔۔۔ ملک مختار نے اُسے کہا۔۔۔ "اگر تھانے سے جلدی نکلنا چاہتی ہو تو سچ بولنا۔ ذرا جتنا جھوٹ تمہیں حوالات میں بند کرا کے پھر جیل خانے

بھیج دے گا.... تم خود عزّت دار ہو یا نہیں، عزّت دار خاندان کی عورت ہو، مجھ سے اپنی عزّت کرانا۔"

"میں نے کیا کیا ہے؟" — نسیمہ کی ماں نے ڈری ہوئی آواز میں پوچھا۔

"میں تمہیں الگ بٹھا دوں گا" — ملک مختار نے کہا — "اچھی طرح سوچ سمجھ لینا۔ سائیں مستانے کے ساتھ، جوگی کے ساتھ اور چوہدری منیر کے ساتھ تمہارا جو تعلق تھا اور ان کے ساتھ تمہاری جو باتیں ہوتی رہی ہیں وہ سب یاد کر لو اور مجھے سُنا دینا۔"

"میرا کسی کے ساتھ کوئی ایسا تعلق تو نہیں تھا" — نسیمہ کی ماں نے کہا — "وہ تو میری بیٹی کے گھر میں پھرا کرتے تھے اور میں سائیں مستانے اور جوگی کے پاس جایا کرتی تھی...."

"کہ وہ ملک عمر حیات کی پہلی بیوی کے بیٹے کو اغوا کرا دیں" — ملک مختار نے اُس کا جملہ پورا کر کے کہا — "میں تمہیں آرام سے بٹھا دوں گا۔ سوچنا پھر مجھے ساری کہانی سنا دینا۔ تمہاری عزّت اسی میں ہے۔ تمہارا داماد بھی آ رہا ہے!"

نسیمہ کی ماں کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ وہ بہت ہی چالاک عورت تھی لیکن تھانے میں پہلی بار آئی تھی۔ وہ ملک مختار کی منّت سماجت کرنے لگی۔ ملک مختار نے محرر ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر کہا کہ وہ اس عورت کو اپنی بارک میں بٹھا لے۔

کچھ دیر بعد ملک عمر حیات آ گیا۔

"اب کیا حکم ہے؟" — اُس نے ملک مختار سے پوچھا۔

"آپ کی بیوی مل گئی ہے" — ملک مختار نے ہنستے ہوئے کہا۔

"منیر کہاں ہے؟" — عمر حیات نے پوچھا — "اُسی کے ساتھ ملی ہو گی!"

"نہیں" — ملک مختار نے کہا — "آپ تو مجھ سے ناراض ہی رہتے ہیں .... آپ بھاگل پور تھانے میں چلے جائیں۔ وہاں سب انسپکٹر نہال سنگھ آپ کو ملے گا۔ ابھی ابھی اُس کا فون آیا تھا" — اُس نے عمر حیات کو وہ ساری بات سنا دی جو نہال سنگھ نے اُسے فون پر بتائی تھی۔

"مجھے ایک بات بتائیں ملک صاحب!" — اب ملک عمر حیات نے تھانیدار کے ساتھ احترام سے بات کی — "میں کیا سمجھوں؟ کیا میری بیوی منیر کے ساتھ پکڑی گئی ہے؟ .... آپ کی کیا رائے ہے؟"

"نہال سنگھ کو صرف آپ کی بیوی ملی ہے" — انسپکٹر ملک مختار نے کہا — "اور جس طرح ملی ہے وہ میں نے آپ کو بتا دیا ہے۔ اس میں منیر کا کوئی ذکر نہیں .... باقی رہی میری رائے، یہ نہ پوچھیں تو بہتر ہے۔ پولیس کی نظر کچھ اور ہوتی ہے۔ پولیس ہر کسی کو شک کی نگاہ سے دیکھتی ہے۔ میں شک میں بات کروں گا تو آپ کو بُری لگے گی۔ پہلے اپنی بیوی کا بیان سُن لیں۔ اُس کا بیان غلط بھی ہو سکتا ہے۔ میرا شک یہ ہے کہ وہ اپنی مرضی سے گئی تھی .... ملک صاحب! میں آپ کو ابھی بتا دیتا ہوں کہ میں آپ کی بیوی کا بیان لوں گا اور تفتیش کروں گا۔ آپ جانتے ہیں کہ منیر کی گمشدگی کی رپورٹ میرے مغز پر سوار ہے اور آپ کی بیوی کا تعلق اُس کے ساتھ بتایا گیا ہے۔ آپ فکر نہ کریں۔ آپ کی حیثیت اور عزّت کا پورا خیال رکھوں گا۔ آپ کی بیوی کو تھانے نہیں بلاؤں گا۔"

"اگر یہ ثابت ہو گیا کہ وہ منیر کے پاس گئی تھی تو میں اسے طلاق دے دوں گا" — عمر حیات نے کہا — "پھر آپ اُسے تھانے بلائیں، جہاں چاہیں بلائیں۔"

"خدا کا شکر ہے کہ آپ قتل سے طلاق پر آ گئے ہیں" — ملک مختار نے کہا — "طلاق آپ کا ذاتی معاملہ ہو گا، اور ملک صاحب! اگر آپ نے بیوی کو قتل کیا یا قتل کرنے کی کوشش کی تو یہ میرا معاملہ ہو گا۔ ذرا ٹھنڈے دل سے سوچنا۔ آپ بھاگل پور چلے جائیں۔ تانگہ لے لیں۔ یہی کوئی آٹھ میل دُور ہو گا۔"

ملک عمر حیات چلا گیا۔ ملک مختار نے نسیمہ کی ماں کو بلا کر اپنے سامنے بٹھا لیا۔

"مجھے صرف یہ بتا دے بی بی!" — ملک مختار نے نسیمہ کی ماں سے

پوچھا — "ملک عمر حیات کے بیٹے کو تو کیوں اغوا کرانا چاہتی تھی؟"

نسیمہ کی ماں پھٹی پھٹی آنکھوں سے اُسے دیکھتی رہی۔ ملک مختار نے اپنا سوال دُہرایا تو بھی وہ بُت بنی بیٹھی رہی۔

"یہاں تو بی بی، بڑے زبردست ڈاکو بھی بول پڑتے ہیں" — ملک مختار نے کہا — "تُو کس نشے میں ہے؟"

"آپ مجھ سے یہ باتیں کیوں پوچھ رہے ہیں؟" — نسیمہ کی ماں نے پوچھا — "عمر حیات نے میرے خلاف کچھ کہا ہے؟"

"میرے سوال کا جواب دو اماں!" — ملک مختار نے جھنجلاتے ہوئے لہجے میں کہا — "مجھ سے سوال نہ پوچھو .... اگر تم جواب دینے سے ڈرتی ہو تو مجھ سے اپنا جواب سُن لو .... تم ملک عمر حیات کی جائیداد کے وارث کو راستے سے ہٹانا چاہتی تھیں۔ تم اپنی بیٹی کی اولاد کو جائیداد کا وارث بنا رہی تھیں" — اُس نے نسیمہ کی ماں کی طرف جُھک کر کہا — "اس میں شاید تمہارا بھی کچھ فائدہ تھا .... تمہارا خاوند کیا کرتا ہے؟ کہاں ہے وہ؟ زندہ ہے؟"

"ہے تو زندہ!" — نسیمہ کی ماں نے کہا — "لیکن مُردوں سے بڑھ کر بیکار ہے۔ گھر کا کاروبار اور سلسلہ میں چلاتی رہی ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج تھانے میں بیٹھی ہوں۔"

"کیا میں نے غلط کہا ہے کہ تم ملک عمر حیات کے بیٹے کو اغوا کرانا چاہتی تھیں؟"

"یہی بات تھی" — نسیمہ کی ماں نے ہاری ہوئی اور دبی ہوئی آواز میں جواب دیا۔

"کیا تمہیں معلوم تھا کہ سائیں مستانہ اور رجو گی بدمعاش اور عادی مجرم ہیں؟"

"نہیں" — اُس نے جواب دیا — "مجھے اپنے پیدا کرنے والے کی قسم ہے، میں ان دونوں کو عامل اور کامل سمجھتی تھی۔"

"کیا تمہیں معلوم ہے کہ ملک عمر کے گھر آگ اور پتھروں کا جو سلسلہ چلتا

رہا ہے یہ منیر نے کالا جادو کروایا تھا؟"

"منیر نے؟" — نسیمہ کی ماں نے حیرت زدہ لہجے میں کہا — "نہیں تو! ... میں آج پہلی بار سُن رہی ہوں کہ یہ منیر کی کارستانی تھی۔"

"تم دیکھ رہی ہو کہ میں تمہاری عزت کر رہا ہوں" — ملک مختار نے کہا — "بجائے اس کے کہ میں سوال کرتا جاؤں تم خود ہی ساری بات سنا دو .... میں تمہیں یہ بات بتا دیتا ہوں کہ بہت سی ایسی باتوں کا مجھے علم ہے جو تم سمجھتی ہو کہ تمہارے سوا کسی اور کو معلوم نہیں۔"

"میں ابھی تک نہیں سمجھی کہ آپ مجھ سے کیا پوچھنا چاہتے ہیں" — نسیمہ کی ماں نے کہا۔

"غور سے سنو" — ملک مختار نے کہا — "منیر اور تمہاری بیٹی نسیمہ کے آپس میں تعلقات تھے۔ تم جانتی ہو کہ منیر کہیں غائب ہو گیا ہے اور تم یہ بھی جانتی ہو کہ وہ کہاں ہے۔ مجھے پکا یقین ہے کہ تم یہ بھی جانتی ہو کہ تمہاری بیٹی منیر کے پیچھے چلی گئی تھی اور اب پکڑی گئی ہے۔"

نسیمہ کی ماں بُری طرح تڑپی۔ ایک ہی سانس میں اُس نے کئی قسمیں کھائیں۔ وہ کہتی تھی کہ اُسے اپنی بیٹی کے کہیں چلے جانے کے متعلق کچھ علم نہیں۔ ملک مختار تجربہ کار تھانیدار تھا۔ اُس نے پولیس کا مخصوص انداز اختیار کیا تو نسیمہ کی ماں نے وہ باتیں سنا دیں جو اُسے معلوم تھیں۔

"اور یہ صحیح ہے کہ شادی سے پہلے منیر اور نسیمہ کی ملاقاتیں ہوتی تھیں" — نسیمہ کی ماں نے آخر میں کہا — "لیکن نسیمہ کی شادی کا وقت آیا تو مجھے ملک عمر حیات اچھا لگا۔"

"اس لئے کہ وہ امیر آدمی ہے؟" — ملک مختار نے پوچھا۔

"امیر بھی ہے اور منیر کی طرح بدنام بھی نہیں" — نسیمہ کی ماں نے جواب دیا — "میری بیٹی نے ملک عمر کو دل سے قبول کر لیا ہے۔"

"مجھے شک ہے کہ شادی کے بعد بھی وہ منیر سے ملتی رہی ہے" — ملک مختار نے کہا۔

"نہیں" ــ نسیمہ کی ماں نے جواب دیا ــ "میری بیٹی نے قسم کھا لی تھی کہ اُسے نہیں ملے گی۔"

"محترمہ!" ــ ملک مختار نے کہا ــ "جو میں جانتا ہوں وہ تم نہیں جان سکتیں یا تم اپنی بیٹی پر پردہ ڈال رہی ہو.... منیر اتنا دلیر اور بہادر نہیں تھا کہ کسی کے گھر میں جا کر ڈاکوؤں کو پکڑ لیتا، نہ ہی وہ ڈاکوؤں کو پکڑنے گیا تھا۔ وہ وہاں پہلے سے موجود تھا۔ مجھے یقین ہے کہ تمہاری بیٹی نے اُسے بلایا تھا۔"

"اگر میں آپ کو سچی بات بتا دوں تو کیا آپ مجھے گرفتار کر لیں گے؟" ــ نسیمہ کی ماں نے پوچھا۔

"بالکل نہیں" ــ ملک مختار نے جواب دیا ــ "تم نے کون سا جرم کیا ہے کہ میں تمہیں گرفتار کر لوں گا؟ میرے پاس کسی ایسے جرم کی کوئی رپورٹ نہیں جو تم نے کیا ہو۔ تم دل کی ہر بات کہہ ڈالو۔"

"آپ ٹھیک کہتے ہیں" ــ نسیمہ کی ماں نے کہا ــ "منیر وہاں پہلے سے موجود تھا، لیکن اُسے میری بیٹی نے نہیں بلایا تھا۔ وہ ملک عمر کو قتل کرنے گیا تھا۔ آگے اُسے ڈاکو مل گئے۔"

"تم کس طرح جانتی ہو؟"

"منیر نے مجھے بتایا تھا" ــ نسیمہ کی ماں نے جواب دیا۔

"تمہیں کیوں بتایا تھا؟"

یہاں آکر نسیمہ کی ماں چپ ہو گئی۔ ملک مختار کے کہنے پر بھی وہ نہ بولی۔

"اب میں تمہیں حوالات میں بند کر دوں گا" ــ ملک مختار نے کہا ــ "ایک طرف مجھ سے وعدے لیتی ہو کہ میں تمہیں گرفتار نہ کروں اور دوسری طرف مجھ سے صحیح باتیں چھپانے کی کوشش کرتی ہو۔ کیا تم ہونٹ سی لو گی تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا؟"

"میں کچھ نہیں چھپاؤں گی" ــ نسیمہ کی ماں نے ڈرتے ہوئے لہجے میں

کہا ــ "وہ نسیمہ کو حاصل کرنے کے لئے ملک عمر حیات کو قتل کرنا چاہتا تھا۔ ایک روز نسیمہ نے مجھے دھتکار دیا اور کہا کہ میرے گھر نہ آیا کرو۔"

"وجہ؟"

نسیمہ کی ماں نے وجہ بتا دی۔ اُس نے صاف الفاظ میں اور پوری تفصیل سے بتایا کہ مستانے نے نسیمہ کو بلایا تھا۔ نسیمہ کی ماں کو یہ معلوم نہیں ہو سکا تھا کہ ملک عمر حیات نے نسیمہ کے ذریعے مستانے کو اپنے گھر بلوایا اور اُس کی پٹائی کروائی تھی۔

"پھر عمر نے بھی مجھے بُرا بھلا کہا" ــ نسیمہ کی ماں نے کہا ــ "اُس نے میری بہت بے عزتی کی۔ اس طرح نسیمہ کا اور میرا تعلق اور ملنا جُلنا ختم ہو گیا۔ میں برداشت نہ کر سکی۔ ایک دو دنوں بعد منیر مل گیا۔ وہ مجھ سے ناراض تھا کہ میں نے اسے نسیمہ کا رشتہ نہیں دیا تھا۔ میں اُس کے پاس رُک گئی۔ اُس نے گلے شکوے کیے۔ میں نے اُسے کہا کہ عمر اگر مر جاتے تو نسیمہ کا نکاح تمہارے ساتھ پڑھا دوں گی۔ میں نے یہ بات غصے میں کہی تھی۔ منیر نے مجھے کہا کہ وعدہ کرو اور ملک عمر کو ختم کرنا میرا کام ہے....

"میں نے کہا کہ ہُوا وعدہ۔ وہ سچ مچ تیار ہو گیا۔ اُس نے مجھ سے پوچھا کہ عمر کے گھر کے اندر کا نقشہ کیا ہے۔ میں نے اُسے بتا دیا کہ برآمدہ کہاں اور کمرے کہاں ہیں اور عمر اور نسیمہ کہاں سوتے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ وہ خنجر لے کر گیا تھا مگر دوسرے دن شور اُٹھا کہ منیر نے عمر کے گھر سے ایک بڑے خطرناک ڈاکو کو پکڑا ہے۔ ڈاکو مستانہ تھا۔ منیر مجھے ملا تو اُس نے بتایا کہ وہ دیوار پر چڑھ کر اندر چلا گیا تھا۔ اِدھر وہ اندر گیا اُدھر سے مستانہ اور اس کا ساتھی اندر آ گئے۔ منیر نے اپنی جان کا خطرہ محسوس کیا۔ وہ بھاگ نہیں سکتا تھا۔ اُس نے یہ طریقہ سوچ لیا جو اُس نے کر دکھایا۔"

"کیا نسیمہ اور ملک عمر کو پتہ نہیں چلا تھا کہ منیر کس نیت سے اُن کے گھر میں داخل ہُوا تھا؟"

"نہ جی!" ــ نسیمہ کی ماں نے کہا ــ "ملک عمر اور منیر کی دوستی

اتنی گہری ہوگئی کہ منیر کو عمر اپنے گھر لے جاتا تھا۔ مجھے خبریں ملتی رہی ہیں۔ ان کی دوستی کی گواہی تو سارا محلّہ دے گا۔"

"میرا خیال ہے اس دوران منیر اور نسیمہ کی درپردہ دوستی ہوگئی ہوگی"۔۔۔ ملک مختار نے کہا۔

"میں کچھ نہیں کہہ سکتی"۔۔۔ نسیمہ کی ماں نے کہا۔

ملک مختار نے نسیمہ کی ماں کو گھر جانے کی اجازت دے دی۔

◆◆◆

ملک عمر حیات بھاگل پور تھانے میں پہنچ گیا۔ نسیمہ سب انسپکٹر نہال سنگھ کے کمرے میں بنچ پر لیٹی ہوئی تھی۔ اُس کے کپڑے کیچڑ سے لت پت تھے۔ بالوں میں بھی کیچڑ تھا۔ اُس کا چہرہ زرد تھا۔ اپنے خاوند کو دیکھ کر وہ اُٹھ کھڑی ہوئی لیکن تھکن نے اور رات کی بارش نے اُس کا جسم توڑ دیا تھا۔ ملک عمر حیات نے اُسے دیکھا لیکن اُس کے چہرے مسرّت کا نام ونشان نہ تھا۔

"یہ آپ کی بیوی ہے؟"۔۔۔ نہال سنگھ نے ملک عمر حیات سے پوچھا۔

"ہاں سردار جی!"۔۔۔ عمر حیات نے مرے مرے سے لہجے میں کہا۔

نہال سنگھ نے محرّر ہیڈ کانسٹیبل کو بلا کر کاغذی کارروائی کرنے کو کہا۔ عمر حیات نے نسیمہ کو وہ کپڑے دیئے جو وہ گھر سے لے گیا تھا۔ نہال سنگھ نے اُسے ایک کمرہ دکھایا جس میں جا کر نسیمہ نے کپڑے بدل لئے۔ نہال سنگھ کے پوچھنے پر عمر حیات نے کہا کہ وہ کسی کے خلاف مقدمہ نہیں کرنا چاہتا۔ اُس نے کاغذوں پر دستخط کئے اور نسیمہ کو ساتھ لے کر تھانے سے نکل آیا۔ وہ اپنے قصبے سے تانگہ لے گیا تھا جو باہر کھڑا تھا۔ دونوں پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔

تانگہ بھاگل پور گاؤں سے نکل گیا۔ عمر حیات نے نسیمہ کے ساتھ بات تک نہ کی بلکہ اُس کی طرف دیکھا بھی نہیں۔

"معلوم ہوتا ہے مجھے زندہ دیکھ کر آپ کو افسوس ہو رہا ہے"۔۔۔ نسیمہ نے علیل سی آواز میں کہا۔

عمر حیات نے بڑی آہستہ سے گردن گھما کر نسیمہ کی طرف دیکھا پھر مُنہ پھیر لیا۔

"ملک صاحب!"۔۔۔ نسیمہ نے کہا۔۔۔ "میں نے کوئی جُرم تو نہیں کیا۔"

عمر حیات نے تانگے والے کی طرف دیکھا اور آہستہ سے بولا۔۔۔ "گھر چل کر سُنوں گا۔"

پھر نسیمہ نہ بولی اور تانگے کے ساتھ ہچکولے کھاتی رہی۔ ملک عمر حیات اُسے مجرم سمجھ رہا تھا۔ اُس کا ذہن بڑے تکلیف دہ خیالات سے بھرتا جا رہا تھا۔ کوئی اچھی سوچ آتی ہی نہیں تھی۔ نسیمہ کو طلاق دے دینا یا اُسے قتل کروا دینا عمر حیات کے لئے مشکل نہیں تھا۔ اُس کی مشکل یہ تھی کہ نسیمہ کو وہ دل کی گہرائیوں سے چاہتا تھا۔ نسیمہ کے بغیر وہ اپنے آپ کو نامکمل سمجھتا تھا۔ اس میں بھی اُسے کوئی شک نہیں تھا کہ نسیمہ کے دل میں اُس کی بے پناہ محبت ہے مگر اُس کے کانوں میں ایسی باتیں پڑی تھیں جو ثابت کرتی تھیں کہ نسیمہ کی محبت ایک فریب ہے۔

عمر حیات اپنے خیالوں اور وسوسوں کی اذیّت میں مبتلا تھا اور نسیمہ کو اُس کی خاموشی پریشان کر رہی تھی۔ یہ پریشانی غصّے کی صورت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ عمر حیات کی خاموشی سے وہ سمجھ گئی تھی کہ اُس کے دل میں اُس کے خلاف شکوک پیدا ہو گئے ہیں۔ نسیمہ بے گناہ تھی، اور عمر حیات رسمی طور پر بھی اُس کی دلجوئی نہیں کر رہا تھا۔ وہ اپنی ذات میں تپش سی محسوس کرنے لگی۔ اُس نے سوچا ہی نہیں کہ وہ عمر حیات کے ساتھ صلح صفائی کی بات کرے گی اور قسمیں کھا کر اُسے یقین دلائے گی کہ وہ اپنی مرضی سے کسی کے ساتھ یا کسی کے پاس نہیں گئی تھی۔

"آپ کی یہ خاموشی ہم دونوں کے لئے اچھی نہیں"۔۔۔ نسیمہ نے کہا۔

عمر حیات نے پہلے کی طرح اُس کی طرف دیکھا پھر مُنہ پھیر لیا۔ نسیمہ نے عمر حیات کے ماتھے پر دو شکنیں دیکھیں۔

تانگہ اپنی رفتار چلتا رہا اور نندہ میں داخل ہُوا۔

"اب بتاؤ" — گھر پہنچ کر عمر حیات نے نسیمہ سے پوچھا — "کہاں گئی تھیں تم؟"

"میں جھک مارنے گئی تھی" — نسیمہ نے جلے کٹے لہجے میں کہا — "پہلے آپ بتائیں کہ آپ کو مجھ پر کیا شک ہے؟ میں نے اپنی ماں کو دُھتکار دیا ہے۔ اپنے باپ سے بھی ملنا چھوڑ دیا ہے۔ صرف آپ کو اپنا بنایا تھا۔ خدا کے بعد آپ ہی کو اپنا سہارا سمجھتی تھی۔"

"میں جو پوچھ رہا ہوں مجھے وہ بتاؤ" — عمر حیات نے بڑے رُعب سے کہا۔

"کیا تھانے میں آپ نے میرا بیان نہیں پڑھا جس پر میں نے دستخط بھی کئے تھے؟" — نسیمہ نے عمر حیات کے رُعب کو نظر انداز کرتے ہُوئے کہا — "میرا وہ بیان بالکل سچا ہے۔"

"میں اسے سچا نہیں سمجھتا" — عمر حیات نے کہا — "میں سچ سُننا چاہتا ہوں۔"

"میں کہہ رہی ہوں آپ کے دل میں جو کچھ ہے وہ میرے آگے رکھیں" — نسیمہ نے ایسے لہجے میں کہا جیسے وہ عمر حیات کی نہ کچھ لگتی ہے نہ اُسے کچھ سمجھتی ہے — "میں خانقاہ بیبیاں والی پر جا رہی تھی۔ راستے میں مجھے شاید گرمی کی وجہ سے چکر آ گیا....."

"منیر کے ساتھ تمہارا کیا تعلق تھا؟" — عمر حیات نے پوچھا۔

"کچھ بھی نہیں" — نسیمہ نے جواب دیا — "اور پوچھیں؟"

"کیا تم کل اُس کے پاس نہیں گئی تھیں؟" — عمر حیات نے کانپتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

نسیمہ کے سینے میں بڑے زور کا دھماکہ ہُوا۔ اُس کے اندر شعلے بھڑک اُٹھے۔ اُس کے دونوں ہاتھوں کی انگلیاں درندوں کے پنجوں کی طرح ہو گئیں۔ اُس کا چہرہ سُرخ ہو گیا اور اُس پر وہی کیفیت طاری ہو گئی جس میں وہ اپنے گھر میں مستانے کو قتل کرنے کے لئے باورچی خانے سے چھُری اُٹھا لائی تھی اور عمر حیات اور اُصلے نے بڑی مشکل سے اُس پر قابو پایا تھا۔ پھر اُس پر یہ کیفیت اُس وقت طاری ہوئی تھی جب اُس کے گھر میں منیر نے اُس سے اُس کی عصمت کا سودا کرنا چاہا تھا اور اُس نے منیر کی شہ رگ اپنے پنجے میں دبوچ لی تھی۔ اسی کیفیت میں اُس نے منیر کو موت کے مُنہ میں دھکیل دیا تھا اور اسی کیفیت میں وہ ماہن سنگھ ڈاکو کو قتل کر آئی تھی۔ اب عمر حیات نے اُس پر یہ الزام تھوپ دیا کہ وہ منیر کے پاس گئی تھی تو اُس پر وہی کیفیت طاری ہو گئی جو بڑے ہی خطرناک پاگل پن کا دورہ تھا۔

عمر حیات نے اُس کے چہرے پر نظر ڈالی تو اُس نے صاف طور پر محسوس کیا کہ نسیمہ کا چہرہ بگڑ گیا ہے اور ہو سکتا ہے وہ بیہوش ہو جاتے۔ نسیمہ کا مُنہ کھُل گیا تھا اور اُس کے اُوپر نیچے کے دانت ایک دوسرے کو پیس رہے تھے۔ عمر حیات کرسی پر بیٹھا تھا اور نسیمہ آہستہ آہستہ اُس کی طرف یوں بڑھ رہی تھی جس طرح شیر یا چیتا اپنے شکار کی طرف دبے پاؤں بڑھا کرتا ہے۔

"نسیمہ!" — عمر حیات نے کہا تو رُعب سے لیکن اُس کی آواز میں خوف کی جھلک نمایاں تھی۔ کہنے لگا — "میں اپنا ایک شک رفع کرنا چاہتا ہوں۔ تم ہاں یا نہ میں جواب دے دو۔"

نسیمہ نے جیسے اُس کی بات سُنی ہی نہ ہو۔ وہ عمر حیات کی طرف بڑھتی آئی .... آہستہ، بہت ہی آہستہ .... اُس کا چہرہ ٹیڑھا سا ہو گیا جیسے وہ بڑے ہی شدید درد میں مبتلا ہو۔ اُس کے دونوں ہاتھ اُس کی چال کی طرح آہستہ آہستہ آگے کو ہو رہے تھے۔

"نسیمہ!" — اب کے عمر حیات نے گھبرائی ہوئی آواز میں کہا اور اس کے آگے کچھ نہ کہہ سکا۔

"تم!" — نسیمہ نے اُس کے قریب جاکر اور دانت پیس کر کہا — "تم میرے ہاتھ سے مرنا چاہتے ہو لیکن میں اپنی محبت کی شہ رگ نہیں کاٹ سکتی" — اُس کی سانس بڑی تیز چل رہی تھی۔ وہ اب اس طرح بولنے لگی جیسے پھنکار رہی ہو — "تم خوش قسمت ہو کہ مجھے تم سے محبت ہے اور تم نے مجھے محبت دی ہے۔"

"نسیمہ!"

"خاموش رہ!" — نسیمہ نے یوں کہا جیسے اُس نے دبی دبی سی چیخ ماری ہو۔ بولی — "میرے پاس ایک ہی دولت ہے اور وہ میری عصمت ہے۔ عصمت میرا ایمان ہے .... تو کہتا ہے کہ میں یہ بھی لُٹا آتی ہوں" — وہ دونوں ہاتھ عمر حیات کے چہرے کے قریب اس طرح لے گئی جیسے اُس کے چہرے کو چیر پھاڑ دے گی۔ اُس نے کہا — "ان ہاتھوں سے ماہن سنگھ کا گلا گھونٹ کر آئی ہوں۔ ماہن سنگھ ڈاکو .... تو کیا ہے؟ یقین نہ آتے تو جاکے اُس کی لاش دیکھ آ۔"

"نسیمہ!" — ملک عمر حیات حیرت زدہ ہو کر اُٹھا اور نسیمہ کو اپنے بازوؤں میں لے کر بولا — "کیا کہہ رہی ہو؟ ہوش میں آؤ نسیمہ! کون سے ماہن سنگھ کا گلا گھونٹ آئی ہو؟"

نسیمہ کا جسم اکڑ گیا تھا۔ عمر حیات کو یوں لگ رہا تھا جیسے نسیمہ لکڑی کی بنی ہوئی ہو۔ عمر حیات کے بازوؤں میں اُس کا جسم ڈھیلا ہوتے ہوتے یوں ہوگیا جیسے اس میں جان ہی نہ رہی ہو۔ اُس نے سر عمر حیات کے سینے پر پھینک دیا اور سسک سسک کر رونے لگی۔ عمر حیات نے اُسے پلنگ پر لٹا دیا — دورہ گزر گیا تھا۔

❖

"ماہن سنگھ کی کیا بات کی تھی تم نے نسیمہ؟" — عمر حیات نے گرم دودھ کا گلاس اُس کے ہاتھ میں دیتے ہوئے پوچھا — "اور یہ بتاؤ کہ تمہیں کیا ہوگیا تھا۔ تمہارا تو چہرہ بگڑ گیا تھا۔ ہونٹ ٹیڑھے ہوگئے تھے۔"

"ماہن سنگھ ڈاکو کے سامنے بھی مجھے یہی کچھ ہوگیا تھا جو آپ نے دیکھا ہے" — نسیمہ نے مریض سے لہجے میں کہا — "معلوم نہیں مجھے کیا ہو جاتا ہے۔ میں بدچلنی اور دھوکہ دینے کا الزام برداشت نہیں کر سکتی۔ آپ کو یاد ہوگا جب ہم نے سائیں مستانے کو یہاں بلایا تھا تو میں چھری اُٹھا لاتی تھی۔ میں اُسے ڈرا نہیں رہی تھی۔ میں کسی اور ہی قوت یا شر شرارہ کے قبضے میں آگئی تھی۔"

"مجھے یاد ہے" — عمر حیات نے کہا — "تمہارا جسم لکڑی جیسا ہوگیا تھا۔"

"آپ خوش قسمت ہیں" — نسیمہ نے کہا — "نہیں .... میں خوش قسمت ہوں کہ آپ میرے ہاتھوں سے بچ گئے ہیں۔ یہ آپ کی محبت کا اثر ہے، اور میرے مُنہ سے ایسا راز نکل گیا جو میں کسی کو نہیں بتانا چاہتی تھی۔ یہ ایسا دھچکہ تھا جس نے دَورہ ختم کر دیا۔"

"خدا کے لئے کچھ بتاؤ نسیمہ!" — عمر حیات نے کہا — "کیا تم ماہن سنگھ ڈاکو تک پہنچ گئی تھیں یا اُس کے ہاتھ چڑھ گئی تھیں؟"

"میں نے جو بات اُس تھانیدار کو نہیں بتائی تھی وہ آپ کو بتا دوں گی" — نسیمہ نے کہا — "میرا یہ بیان بالکل صحیح ہے کہ میں خانقاہ بیبیاں والی جا رہی تھی" — وہ چُپ ہوگئی۔ ذرا سوچ کر اُس نے جھوٹ بولا — "شاید گرمی اور حبس کی وجہ سے میں بیہوش ہو کر گر پڑی۔ ہوش آئی تو میں تین آدمیوں کے قبضے میں تھی۔ دن کو اُنہوں نے مجھے چھپائے رکھا اور رات کو ساتھ لے گئے۔ مجھے خطرہ اپنی عزت کا تھا لیکن انہوں نے کہا کہ تم ہمارے اُستاد کی چیز ہو اس لئے ہم تمہارے جسم کو ہاتھ بھی نہیں لگا سکتے۔"

نسیمہ نے عمر حیات کو ماہن سنگھ کے قتل کا سارا واقعہ سنا دیا اور یہ بھی کہ وہ کس طرح وہاں سے نکل کر بارش میں بھاگی تھی۔

"نسیمہ!" — عمر حیات نے کہا — "میں مان نہیں سکتا۔"

"میں خود نہیں مان سکتی" — نسیمہ نے کہا — "اگر آپ معلوم کر سکتے ہیں

کر ماہن سنگھ زندہ ہے یا مر گیا ہے تو معلوم کریں۔ وہ مر گیا ہے یا زندہ ہے تو دیکھنے کی کوشش کریں۔ آپ کو اُس کی گردن میں شہ رگ کے قریب میری انگلیوں کے ناخن اُترے ہوئے نظر آئیں گے اور اُس کے سر پہ شراب کی بوتل کی تین ضربوں کے نشان ہوں گے ....

"میں یہ بھی نہیں مان سکتی کہ اندھیری رات میں جب بارش تیز برس رہی تھی، بجلی چمکتی اور کڑکتی تھی میں وہاں سے اتنی دُور پہنچ گئی تھی۔ آپ کو شاید یقین نہیں آئے گا کہ میں ذرا سا خوف بھی محسوس نہیں کر رہی تھی میرے دل میں خُدا اور رسولؐ کا نام تھا۔ میں خدا سے بار بار کہتی تھی کہ میں گناہگار ہُوں تو خدایا مجھے سزا دے۔ میں گناہگار نہیں تھی۔ میں صاف طور پر محسوس کر رہی تھی کہ خدا میرے ساتھ ساتھ ہے۔ مجھے تو یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ میں کہاں ہُوں، اپنے گھر سے کتنی دُور ہوں اور میں کہاں جا پہنچوں گی۔ تیز چلنا ممکن نہیں تھا۔ میں کئی بار پھسل کر گری۔ کیچڑ چلنے نہیں دیتا تھا۔ آخر مجھے غشی آ گئی۔ خدا نے وہاں کسی فرشتے کو بھیج دیا جہاں میں بیہوش پڑی تھی میں ہوش میں آئی تو میں تھانے میں پڑی ہوئی تھی .... میں نے سکھ تھانیدار کو ماہن سنگھ کے متعلق اس لئے نہ بتایا کہ وہ مجھے گرفتار کر لے گا۔"

"ماہن سنگھ کے متعلق مجھے پتہ چل جائے گا" — عمر حیات نے کہا۔

"منیر کی آپ نے کیا بات کی تھی؟" — نسیمہ نے پوچھا — "کیا وہ زندہ ہے؟"

"زندہ؟" — عمر حیات نے حیران ہو کر کہا — "یہ تو پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ قتل ہو گیا ہے یا خود ہی کہیں چلا گیا ہے۔"

"پھر آپ نے مجھ پر یہ شک کیوں کیا ہے کہ میں منیر کے پاس گئی تھی؟" — نسیمہ نے پوچھا۔

"میرے ذہن میں یہ شک تھانیدار نے ڈالا تھا" — عمر حیات نے کہا — "میں نے اسے سچ نہیں مانا تھا۔ پولیس والے ہر بات شک میں کیا کرتے ہیں۔"

عمر حیات نسیمہ کے دورے سے ڈر گیا تھا۔ اُسے نسیمہ کی اس بات پر یقین نہیں آیا تھا کہ اُس نے ماہن سنگھ کو قتل کیا ہے لیکن نسیمہ کے ساتھ بحث کرنے سے وہ گھبراتا تھا۔ اُسے ایک اور خطرہ بھی نظر آنے لگا تھا۔ وہ یہ کہ نسیمہ اتنے زبردست ڈاکو کو واقعی قتل کر کے بھاگی ہے تو اُس کے گروہ کے آدمی کوئی خوفناک انتقامی کارروائی کریں گے۔

وہ نسیمہ کو تسلی دلاسہ دے کر اپنے کام پر چلا گیا۔

نسیمہ کو عمر حیات کی تسلیاں سکون نہیں دے سکتی تھیں۔ اُس پر جو بیتی تھی یہ اُس کے اعصاب کے لئے ناقابلِ برداشت تھی۔ اُس کی آنکھوں کے آگے ایک فلم چل پڑی۔ وہ خانقاہ کو جا رہی تھی اور اُس لے وہ گھری جگہ دیکھی تھی جہاں اُس نے منیر کو گرایا تھا۔ اُس نے بارش برستی دیکھی تھی۔ منیر کو دیکھا تھا پھر وہ تین آدمیوں کے قبضے میں تھی، پھر وہ ماہن سنگھ کے قبضے میں جا پہنچی۔

اُسے یہ سب ڈراؤنے خواب کی طرح یاد آ رہا تھا۔ اُس کے سامنے ماہن سنگھ کا اُس وقت کا چہرہ آ گیا جب نسیمہ نے اُس کی شہ رگ اپنے پنجے میں جکڑ رکھی تھی اور اُس کے ناخن ماہن سنگھ کی شہ رگ کی دونوں طرف اُس کی گردن میں اُترتے جا رہے تھے، پھر نسیمہ نے اُس کے سر پر بوتل کی ضربیں لگائی تھیں۔ ماہن سنگھ سکھ تھا۔ اُس کے سر پر پگڑی ہونی چاہیئے تھی لیکن اُس نے پگڑی اُتار کر سر پر ریشمی رومال باندھ رکھا تھا۔ اُسے نسیمہ کے ہاتھوں ہی مرنا تھا۔ خدا نے سبب پیدا کر دیئے تھے

نسیمہ پر خوف طاری ہونے لگا۔ قتل اُس کا پیشہ نہیں تھا۔ اس کے ساتھ ہی اُسے منیر کا خیال آ گیا اور یہ بھی کہ اُس نے یہ راز عمر حیات کو نہیں دیا تھا۔ اُسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے اُس پر کسی نے کالا جادو کر دیا ہو یا اُس پر کوئی آسیبی اثر ہو گیا ہو۔ جب سے عمر حیات کی بیوی بن کر وہ اس گھر میں آئی تھی اُس پہ کوئی نہ کوئی مصیبت اور آفت نازل ہو رہی تھی۔ اُسے شک ہونے لگا کہ منیر نے اُس کے گھر پر جو تعویذ کروائے تھے، ان کا اثر ابھی پوری طرح ختم نہیں ہُوا اور معلوم نہیں ابھی اُس پہ کیسی کیسی

آفات گریں گی۔

وہ آئینے کے سامنے جا کھڑی ہوتی۔ اُسے اپنے آپ سے ڈر آنے لگا۔ اُسے حسنین کاظمی کا خیال آیا اور اُس کے ساتھ یہ سوال کہ حسنین کاظمی کو بتادوں کہ اُس نے منیر کو قتل کر دیا تھا؟ یہ بھی بتادوں کہ اُس نے ایک بڑے زبردست ڈاکو کو بھی جان سے مار دیا تھا؟ .... سوچ سوچ کر وہ پریشان ہوگئی۔ اُس کا سر دُکھنے لگا۔ اُس نے بے بسی کے عالم میں دونوں ہاتھوں سے اپنا سر تھام لیا۔ بائیں کنپٹی سے پیچھے، کان سے اُوپر اُسے اپنے سر میں اُبھار سا محسوس ہُوا۔ اُس نے ہاتھ پھیر کر محسوس کیا۔ یہ اُبھار تھا۔ اُسے یاد آیا کہ وہ بے ہوش ہوگئی تھی اور جب گری تو ادھر سے سر پتھر پر لگا ہو گا۔ اُسے یاد نہیں رہا تھا کہ ثبوت کے طور پر یہ اُبھار عمر حیات کو دکھا دیتی۔

عمر حیات کو ثبوت مل گیا تھا۔ نندہ آڑھت کی منڈی بھی تھی جس میں دیہاتی علاقے سے دالیں اور گندم وغیرہ آتی تھی۔ بازار میں دیہاتیوں کا میلہ لگا رہتا تھا۔ دوپہر کے بعد بازار میں یہ خبر مشہور ہوگئی کہ ماہن سنگھ ڈاکو مارا گیا ہے۔ جس گاؤں میں ماہن سنگھ مارا گیا تھا وہاں کے رہنے والے دو آدمی نندہ کے بازار میں آئے اور یہ خبر پھیلا گئے تھے۔

یہ خبر عمر حیات تک پہنچی تو وہ اُس آدمی کی تلاش میں نکل کھڑا ہُوا جسے اِن دو آدمیوں نے یہ خبر سنائی تھی۔ عمر حیات نے تین مختلف آدمیوں سے یہ خبر سُنی تھی۔ تینوں نے مختلف کہانیاں سنائی تھیں۔ تینوں صرف اس پر متفق تھے کہ ماہن سنگھ مارا گیا ہے لیکن ایک نے کہا کہ پولیس مقابلے میں مارا گیا ہے، دوسرا کہتا تھا کہ ماہن سنگھ اپنے آدمیوں کے ہاتھوں مارا گیا ہے اور تیسرے نے کہا کہ اُس کے قاتل کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

عمر حیات کو پتہ چل گیا کہ سب سے پہلے یہ خبر کہاں پہنچی تھی۔ وہ اُس دکان پر گیا جو آڑھت کی ایجنسی تھی۔ وہاں سے اُسے صحیح خبر ملی کہ ماہن سنگھ ایک مہینے سے اس گاؤں میں ٹھہرا ہُوا تھا۔ گاؤں کے بچّے بچّے کو معلوم تھا کہ

ماہن سنگھ یہاں ہے لیکن کچھ اُس کے ڈر کی وجہ سے اور زیادہ تر اُس کے سلوک کی وجہ سے گاؤں کا کوئی فرد گاؤں سے باہر پتہ نہیں چلنے دے رہا تھا کہ ماہن سنگھ ڈاکو اس گاؤں میں ہے۔

عمر حیات کو اصل خبر یہ ملی کہ رات کو بہت تیز مینہ برستا تھا۔ ماہن سنگھ اپنے مکان میں تھا۔ اُس کے دو ساتھی ڈیوڑھی میں سوئے ہُوئے تھے۔ انہوں نے صبح دیکھا کہ ماہن سنگھ اپنے پلنگ پر مرا پڑا ہے۔ اُس کی شہ رگ پر زخم تھے جیسے وہاں کسی کُند ہتھیار کی نوک کئی بار ماری گئی ہو۔ وہاں سے خون نکلا تھا۔ اُس کے سر پر چوٹوں کے اُبھرے ہوئے نشان تھے جیسے اُسے ڈنڈے یا لاٹھیاں ماری گئی ہوں۔

ماہن سنگھ کے ساتھیوں نے گاؤں کے ایک آدمی کو بتایا تو سارے گاؤں کو معلوم ہوگیا۔ اُس کے ساتھی وہاں سے غائب ہوگئے، شاید اس ڈر سے کہ پولیس کو پتہ چل گیا تو وہ پکڑے جائیں گے۔ انہیں ماہن سنگھ کے قتل میں تو پولیس نہ پکڑتی، اُس کے ساتھی ہونے کی وجہ سے اُن کی گرفتاری لازمی تھی۔

عمر حیات یہ خبر سُن کر وہاں سے اُٹھا تو اُسے یہ خبر ملی کہ ماہن سنگھ کی لاش پوسٹمارٹم کے لئے آئی ہے۔ سرکاری ہسپتال اسی قصبے میں تھا۔ دیہات میں جو لوگ قتل ہوتے تھے اُن کی لاشیں یہیں آیا کرتی تھیں۔ ماہن سنگھ کے مرنے کی اطلاع تھانے پہنچا دی گئی تھی۔ یہ سب انسپکٹر نہال سنگھ کا تھانہ تھا جو قصبے سے آٹھ میل دور تھا۔

شام تک عمر حیات کو صحیح خبر مل گئی جو اُس نے ہسپتال کے عملے سے حاصل کی تھی۔ ڈاکٹر نے پوسٹمارٹم رپورٹ میں لکھا تھا کہ ماہن سنگھ کی موت سانس رُکنے سے واقع ہوتی ہے اور اُس کی شہ رگ پر جو زخم ہیں وہ انسانی ناخنوں کے لگتے ہیں۔

عمر حیات نہال سنگھ کے۔ اے۔ ایس سے بھی ملا تھا جو ماہن سنگھ کی لاش کے ساتھ آیا تھا۔ اُس کے ساتھ گپ شپ لگاتے عمر حیات نے معلوم

کر لیا تھا کہ ماہن سنگھ کے قتل کی تفتیش اُس طرح نہیں ہو گی جس طرح قتل
کی دوسری وارداتوں میں کی جاتی ہے۔ ماہن سنگھ قتل اور ڈکیتی کی وارداتوں
میں مطلوب تھا۔ اُس کا قتل پولیس کے محکمے کے لئے بڑی اچھی خبر تھی۔

شام کو عمر حیات گھر آیا تو اُس نے نسیمہ کو گلے لگا لیا اور اُسے بتایا
کہ ماہن سنگھ کی لاش ہسپتال میں چیری پھاڑی جا چکی ہے۔

"لیکن پولیس اُس کے قاتل کو تو ڈھونڈنے کی کوشش کرے گی"
— نسیمہ نے کہا۔

"نہیں کرے گی" — عمر حیات نے کہا — "میں نے یہ بھی معلوم کر
لیا ہے۔ وہ تو خود قاتل اور ڈاکو تھا۔ پولیس والے خوش ہیں کہ وہ مارا گیا ہے"

عمر حیات تو خوش تھا مگر نسیمہ بجھی بجھی سی رہی۔ اُس نے خوش ہونے
کی بہت کوشش کی لیکن دل پر گھبراہٹ کا جو قبضہ تھا، وہ کم نہ ہوا۔

"دل سے بوجھ اُتار دو نسیمہ!" — عمر حیات نے کہا — "خدا کا شکر ادا
کرو۔ میں ایک کالے بکرے کا صدقہ دوں گا"

"ایک عورت نے بتایا ہے کہ میری ماں کو تھانے بلایا گیا تھا" —
نسیمہ نے کہا — "معلوم نہیں اُسے کیوں بلایا گیا تھا۔ وہ ہمارے خلاف
کچھ بتا آئی ہو گی"

"میرا خیال ہے اُسے منیر کی گمشدگی کے سلسلے میں بلایا گیا ہو گا" —
عمر حیات نے کہا — "میں معلوم کر لوں گا .... تم اس کا بھی غم نہ کرو۔ تمہاری
ماں اچھی عورت نہیں۔ منیر کے ساتھ اُس کا ضرور کوئی تعلق ہو گا"

نسیمہ کو تو معلوم تھا کہ منیر کا اُس کی ماں کے ساتھ کیا تعلق تھا اور یہی
وہ راز تھا جو نسیمہ عمر حیات سے چھپا رہی تھی۔ اب اُسے خطرہ نظر آ رہا تھا کہ
یہ راز فاش ہو جائے گا۔

تھانے میں انسپکٹر ملک مختار تھانے کے کاموں سے ذرا فارغ ہوا

تو اُس کے ذہن میں منیر آ گیا۔ اُس لے نسیمہ کی ماں کے سینے سے ہر ایک بات
نکلوا لی تھی اور جو انکشاف نسیمہ کی ماں نے کئے تھے ان پر وہ غور کر چکا تھا۔
منیر کا تعلق نسیمہ کے ساتھ بھی ثابت ہوتا تھا اور ملک عمر حیات کے ساتھ
بھی لیکن کوئی ایسا اشارہ نہیں ملتا تھا جس سے یہ شک ہوتا کہ منیر کو عمر حیات
نے قتل کر دیا ہے یا اُس کی گمشدگی کے ساتھ نسیمہ کا بھی کوئی تعلق تھا۔ ملک مختار
کو یہ بھی معلوم ہو گیا تھا کہ منیر کا تعلق ہندو عورتوں کے ساتھ بھی تھا۔

وہ انہی سوچوں میں اُلجھا ہوا تھا کہ منیر کا باپ آ گیا۔ اُسے دیکھتے ہی
ملک مختار کو غصہ آ گیا۔

"جناب ملک صاحب!" — منیر کے باپ نے آنسو بہاتے ہوئے
پوچھا — "میرے بچے کا کچھ پتہ چلا؟"

"تم اپنے اس گناہ کی سزا بھگت رہے ہو کہ اپنے بیٹے کو اس عمر تک
بچہ سمجھتے رہے ہو" — ملک مختار نے کہا — "ہندو عورتوں کے ساتھ یارانے
اُس نے لگا رکھے تھے۔ مسلمانوں کے شریف گھرانوں کی لڑکیوں کے پیچھے
وہ پڑا رہتا تھا۔ چرسیوں، بھنگیوں اور جوگیوں کے ساتھ دوستانہ اُس کا تھا
.... اگر میں اُس کی ساری کارستانیاں تمہیں بتاؤں تو تم کہو گے کہ ایسا فریبی اور
بدکار بیٹا واپس نہ ہی آئے تو اچھا ہے"

"لیکن ملک صاحب!" — منیر کے باپ نے لجاتی ہوئی آواز میں کہا —
"وہ میرا بیٹا ہے .... یہی ایک ہی بیٹا ہے میرا"

"میں نے تمہیں پہلے دن کہا تھا کہ کسی پر شک ہے تو اُس کا نام لو" —
ملک مختار نے کہا — "یہ لکھواؤ کہ تمہارے بیٹے کو فلاں نے اغوا کر کے
قتل کرا دیا ہے۔ میں تمہیں اب بھی یہی کہوں گا"

"جناب!" — منیر کے باپ نے کہا — "آپ کچھ تسلی تو دے دیں"

"وہ خود کہیں چلا گیا ہے" — ملک مختار نے کہا — "خود بھی اُسے
تلاش کرو .... میں جو کچھ کر سکتا ہوں کر رہا ہوں"

ملک مختار کچھ بھی نہیں کر رہا تھا اور وہ کچھ کرنا چاہتا بھی نہیں تھا۔

نسیمہ کی ذہنی حالت روز بروز بگڑتی گئی۔ وہ ہر وقت ڈری ڈری رہتی تھی۔ کبھی ایسے ہوتا کہ عمر حیات یا اُس کا بیٹا شوکت اُسے بلاتا تو وہ بدک اُٹھتی۔ اُس کی نیند بھی اُڑ گئی تھی۔ اگر آنکھ لگ جاتی تو وہ ڈر کر جاگ اُٹھتی۔ دو راتیں تو یوں بھی ہُوا کہ اُس نے بڑا ہی ڈراؤنا خواب دیکھا اور وہ چیخ مار کر جاگ اُٹھی۔ چند دِنوں میں اُس کے ہاتھ سے چار پانچ برتن گِر کر ٹوٹے۔

عمر حیات سمجھتا رہا کہ نسیمہ کے ہاتھ سے ماہن سنگھ قتل ہو گیا ہے اور یہ اس کا ردِعمل ہے، لیکن تشخیص علاج نہیں ہوتی۔ عمر حیات کو کوئی علاج نظر نہیں آ رہا تھا۔ رہ رہ کر اُس کے ذہن میں حسنین کاظمی آتا تھا مگر حسنین کاظمی کو بھی نہیں بتایا جا سکتا تھا کہ نسیمہ قاتل ہے۔ عمر حیات نے بہت سوچا اور ایک روز حسنین کاظمی کے ہاں جا پہنچا۔

"کیا پھر کوئی مشکل آ پڑی ہے ملک صاحب!" — حسنین کاظمی نے اُس سے پوچھا — "آپ کچھ پریشان نظر آتے ہیں۔"

"ہاں کاظمی صاحب!" — عمر حیات نے کہا — "معلوم ہوتا ہے میرے گھر سے آسیبی اثر نکلا ہی نہیں۔ پتھر گرنے اور آگ لگنے کا سلسلہ تو رُک گیا تھا لیکن اثر ابھی باقی ہے۔"

"کیا ہوتا ہے؟"

"نسیمہ ٹھیک نہیں" — عمر حیات نے جواب دیا — "رات کو سوتی نہیں۔ سو جائے تو ڈر کر جاگ اُٹھتی ہے اور دن کو خوفزدگی کی حالت میں رہتی ہے" — عمر حیات نے اس سے زیادہ کچھ نہ بتایا۔ کہنے لگا — "آپ ہمارے ہاں آئیں گے یا نسیمہ کو یہاں لے آؤں؟"

"اس معاملے میں وقت ضائع نہیں کرنا چاہئے" — حسنین کاظمی نے کہا — "مجھے ابھی ساتھ لے چلیں اور نسیمہ کے پاس مجھے اکیلا چھوڑ دیں۔ اگر میں نے دیکھا کہ اُس پر زیادہ اثر ہے تو میں اُسے جالندھر خواجہ صاحب کے پاس لے جاؤں گا۔"

عمر حیات حسنین کاظمی کو اپنے ساتھ لے آیا اور نسیمہ کو اُس کے پاس بٹھا

کر اپنے کام پر چلا گیا۔

"کیا ہوتا ہے نسیمہ؟" — حسنین کاظمی نے اُس سے پوچھا۔

"منیر تنگ کرتا ہے" — نسیمہ نے کہا۔

"منیر؟" — حسنین کاظمی نے حیران ہوتے ہوئے پوچھا — "کیا منیر واپس آگیا ہے؟"

"نہیں" — نسیمہ نے جواب دیا — "واپس آجائے تو میں اُس کے مُنہ پر تھوکوں بھی نہیں۔ ہوتا یوں ہے کہ وہ مجھے اپنے سامنے کھڑا نظر آتا ہے۔"

"وہم ہے نسیمہ!"

"لیکن میں اس وہم کو چھو بھی سکتی ہوں" — نسیمہ نے کہا — "رات کو وہ میرے پاؤں کا انگوٹھا پکڑ کر ہلاتا ہے۔ میری آنکھ کھل جاتی ہے تو مجھے وہ اپنی پائنتی کھڑا نظر آتا ہے" — نسیمہ نے اُسے تفصیل سے بتایا کہ منیر اُسے کہاں کہاں اور کس طرح نظر آتا رہا ہے۔

اس دوران حسنین کاظمی نے نسیمہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے رکھیں اور ایک بار نسیمہ کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اُس کے ہاتھ کو پھیلا کر دیکھا۔

"نسیمہ!" — حسنین کاظمی نے کہا — "تم مجھے اپنا راز دان اور ہمدرد سمجھتی ہو نا!"

"خدا کی قسم کاظمی صاحب!" — نسیمہ نے کہا — "آپ نہ ہوتے تو میں اپنے آپ کو ختم کر چکی ہوتی۔ میں جو باتیں کسی اور سے نہیں کر سکتی وہ آپ کے ساتھ کیا کرتی ہوں۔"

"پھر ایک بات بتا دو" — حسنین کاظمی نے کہا — "منیر کو زہر دے کر مروایا ہے؟"

"کس نے؟"

"تم نے!" — حسنین کاظمی نے کہا — "عورت کسی کو مارنا چاہے تو زہر دیا کرتی ہے۔ اسی لئے میں نے پوچھا ہے کہ اُسے زہر سے مروایا ہے؟"

نسیمہ کا رنگ اُڑ گیا، پھر اُس کے ماتھے پر پسینہ پھوٹ آیا۔

"بولو نسیمہ!" ــــ حسنین کاظمی نے کہا ــــ "اس راز کو بھی اپنے سینے میں دفن کر دوں گا۔"

نسیمہ پھر بھی خاموش رہی۔ اب اُس کے چہرے پر درد کا تاثر آ گیا۔

"مت گھبراؤ" ــــ حسنین کاظمی نے نسیمہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا ــــ "یہ زہریلا کانٹا ہے جو تمہارے دل میں، تمہاری رُوح میں اُتر گیا ہے۔ اسے نکال پھینکو۔"

"آپ کس بنا پر اتنے یقین سے کہہ رہے ہیں کہ میں نے منیر کو مروا دیا ہے؟" ــــ نسیمہ نے ایسی آواز میں کہا جس میں لرزہ تھا۔

"یہ رُوح کا روگ ہے" ــــ حسنین کاظمی نے کہا ــــ "اور تم نے اپنی جو حالت بیان کی ہے یہ اس روگ کی علامت ہے۔ یہ تمہارے ضمیر کی آہ و فغاں ہے۔ اسے ردِ عمل کہہ لو" ــــ اُس نے نسیمہ کا دایاں ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر اسے پھیلایا اور ایک لکیر پر اپنی انگلی رکھ کر کہنے لگا ــــ "تم کو یاد ہے نا، میں نے ایک روز تمہارا ہاتھ دیکھا تھا تو میں گھبرا گیا تھا۔ تم نے اور ملک صاحب نے بہت پوچھا کہ میں نے تمہارے ہاتھ میں کیا دیکھا ہے لیکن میں نے نہیں بتایا تھا۔"

"اب بتا دیں" ــــ نسیمہ نے پوچھا ــــ "کیا دیکھا تھا آپ نے؟"

"قتل!" ــــ حسنین کاظمی نے کہا ــــ "یا خودکشی ..... تم نے خودکشی نہیں کی، قتل کیا ہے۔"

"کیا مجھ جیسی کمزور اور ڈرپوک عورت کسی آدمی کو قتل کر سکتی ہے؟"

"کر سکتی ہے" ــــ حسنین کاظمی نے کہا ــــ "عورت ہو یا آدمی، خدا نے دونوں کو اتنی زیادہ قوتیں دے رکھی ہیں جن کا کوئی شمار نہیں۔ بعض لوگ اپنی قوتوں کو اپنے قابو میں لے لیا کرتے ہیں اور بعض کی یہ قوتیں کسی تحریک یا اشتعال سے خود ہی بیدار ہو جاتی ہیں لیکن یہ کیفیت تھوڑی سی دیر کے لئے

آتی ہے۔ میں نے ریاضت کیا، مراقبے کئے، وِرد اور وظیفے کئے، چلّے کاٹے، خواجہ صاحب کی شاگردی کی اور خدا کی دی ہوئی ان قوتوں کو اپنے تابع کر لیا ہے ..... میرے ہاتھ میں کوئی جادو نہیں نسیمہ! یہ قیافہ شناسی ہے۔ میں چند سیکنڈ میں تمہارے ذہن پر قبضہ کر سکتا ہوں۔ تمہاری زبان میرے اثر کے تحت بولے گی لیکن تمہارا علاج یہ ہے کہ تم خود بولو، یا کہہ دو کہ میرا قیافہ غلط ہے۔"

"میں نے اُسے زہر نہیں دیا تھا" ــــ نسیمہ نے کہا ــــ "اُسے ایسی جگہ سے دھکا دے کر گرایا تھا جہاں سے وہ زندہ نہیں نکل سکتا تھا ..... یہ اُس روز کی بات ہے جس روز آپ نے اُسے اپنے ہاں بلایا اور اُس سے وہ فوٹو لیا تھا جس سے میں ڈرتی تھی۔ بدقسمتی یہ ہوئی کہ فوٹو سے پہلے مجھے منیر مل گیا۔ اگر وہ مجھ پر دست درازی نہ کرتا یا مجھے فوٹو پہلے مل جاتا تو میں اس حالت کو نہ پہنچتی اور منیر زندہ ہوتا۔"

نسیمہ نے حسنین کاظمی کو تفصیلاً بتایا کہ منیر اُسے کس طرح ملا، کیا باتیں ہوئیں، منیر نے کس طرح اُس پر حملہ کیا اور اُس نے منیر کو دھکا دے دیا۔

"ایسا ہونا تھا" ــــ حسنین کاظمی نے کہا ــــ "یا یہ نہیں تو کسی اور طریقے سے ہونا تھا۔ خواجہ صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ منیر قتل ہو جائے گا۔ اگر زندہ رہا تو پاگلوں کی طرح زندہ رہے گا۔ ہُوا یہ کہ وہ قتل تمہارے ہاتھوں ہُوا ..... اچھا ہُوا ..... اچھا ہُوا نسیمہ!"

"میں نے یہ بات ملک صاحب سے چھپا رکھی ہے" ــــ نسیمہ نے کہا ــــ "انہیں بتا دوں؟"

"بتا دیں گے" ــــ حسنین کاظمی نے کہا ــــ "مجھے ذرا سوچنے دو۔"

❖

"کاظمی صاحب!" ــــ نسیمہ نے کہا ــــ "یہ راز آپ کو دے کر مجھے سکون سا محسوس ہونے لگا ہے ..... لیکن ..... لیکن کاظمی صاحب! آپ کہتے ہیں کہ میرے ہاتھ کی ایک لکیر ہے جو مجھ سے قتل جیسا بھیانک جرم کرا رہی

ہے۔ اگر ایسا ہی ہے تو کیا میں کسی تیسرے آدمی کو بھی قتل کروں گی؟"

"تیسرے آدمی کو؟" ــــ حسنین کاظمی نے پوچھا ــــ "کوئی دوسرا بھی تھا؟"

"اوہ" ــــ نسیمہ نے کھسیانی اور دکھیاری سی مسکراہٹ سے کہا ــــ "میرے مُنہ سے نکل گیا ہے تو یہ بھی سُن لیں .... آپ نے سُنا ہوگا کہ ماہن سنگھ جو اس علاقے کا مشہور اور بڑا زبردست ڈاکو تھا، مارا گیا ہے .... وہ بھی میرے ہاتھوں مرا ہے۔"

"نسیمہ؟" ــــ حسنین کاظمی نے نسیمہ کی طرف جُھک کر اور اُس کے چہرے پر نظریں جما کر انتہائی حیرت کے عالم میں کہا ــــ "تم پر منیر کے قتل کا بہت ہی زیادہ اثر ہے۔ اتنا زیادہ کہ اب جو کوئی مرے گا تم کہا کرو گی کہ اسے میں نے قتل کیا ہے۔ تمہاری حالت یہی رہی ...."

"میں پوری طرح اپنے آپ میں ہوں کاظمی صاحب!" ــــ نسیمہ نے کہا ــــ "ماہن سنگھ کے ساتھ میری ٹکّر اس طرح ہوئی تھی ...."

نسیمہ نے حسنین کاظمی کو پوری بات سُنا دی۔ حسنین کاظمی کچھ دیر اُس کے مُنہ کی طرف دیکھتا رہا۔

"لیکن کاظمی صاحب!" ــــ نسیمہ نے کہا ــــ "اس کا ردِعمل وہ نہیں ہُوا جو منیر کے مرنے کے بعد میرے سامنے آ رہا ہے۔"

"اس لئے کہ تم نے یہ زہر اپنے خاوند کے آگے اُگل دیا تھا" حسنین کاظمی نے کہا ــــ "تمہارے خاوند پر اس کا یہ اچھا اثر پڑا کہ وہ تمہیں پاکباز عورت سمجھنے لگا، ایک ایسی عورت جو جان دے دیتی ہے، جان لے لیتی ہے لیکن عصمت کو داغدار نہیں ہونے دیتی۔ اب تم نے منیر کی موت کا زہر اپنے ضمیر اور اپنی رُوح سے نکال کر رکھ دیا ہے۔ اب وہ واہمے ختم ہو گئے ہیں جو تم دیکھتی رہی ہو۔ منیر، ماہن سنگھ جیسا ہی بدکار اور گناہگار تھا۔ تم نے کسی بیگناہ کو قتل نہیں کیا، تم کسی بے گناہ پر کبھی ہاتھ نہیں اُٹھاؤ گی۔

"کاظمی صاحب!" ــــ نسیمہ نے کہا ــــ "میرے ساتھ ایسے کیوں ہو رہا ہوں؟ میری مصیبت پتھروں سے چلی تھی جو میرے گھر میں گرتے رہے ..."

"وہ بات ختم ہو گئی ہے" ــــ حسنین کاظمی نے کہا ــــ "تم پر اور تمہارے گھر پر اب کسی جادو، اُلٹے تعویذ یا آسیب کا اثر نہیں۔ ایسے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ خواجہ صاحب سے یہ کہانیاں سنو تو تم کہو گی کہ یہ صحیح نہیں ہو سکتا۔ تمہاری جگہ کوئی اور عورت ہوتی تو وہ منیر کے آگے ہتھیار ڈال دیتی۔ وہ اپنی ماں کی فرمائشیں اور خواہشیں پوری کرتی رہتی، لیکن تم حق پر قائم رہیں۔ تم نے عصمت کو اپنے ایمان کا حصّہ بنائے رکھا۔ تم نے خاوند سے بے وفائی کو گناہِ کبیرا سمجھا اور تم نے مصائب اور آفات کے آگے سر نہ جھکایا۔ تمہارے دل میں خدا اور رسولؐ کا نام رہا .... تم ابھی کم عمر ہو نسیمہ! زندگی کے، کائنات کے، شب و روز کے بے شمار مظاہرے ہیں جنہیں تم ابھی نہیں سمجھ سکتیں۔ طاقت کا سرچشمہ اللہ ہے۔ اللہ سچ ہے، صداقت ہے۔ شیطان گناہوں کے مجموعے کا اور بدی کا دوسرا نام ہے۔ تم نے ہر مصیبت میں صداقت اور عصمت کو سینے سے لگائے رکھا۔ تم اپنی ماں کے کہنے پر سائیں مستانے کی خواہش پوری کر سکتی تھیں مگر تم نے کہا کہ تمہارا گھر جل جاتے تم بدی کو قبول نہیں کرو گی .... تمہیں خدا نے طاقت دی ہے۔ اُسی کی ذاتِ باری نے تمہیں اتنی طاقت دی کہ وہ ماہن سنگھ جس سے پولیس ڈرتی ہے تمہارے ہاتھوں مارا گیا۔"

"خدا نے مجھے اُٹھا کر میرے گھر کیوں نہیں پہنچا دیا تھا؟" ــــ نسیمہ نے شگفتہ سے لہجے میں پوچھا ــــ "مجھے اتنی طوفانی بارش میں خراب کیوں کیا تھا؟"

"نادان لڑکی!" ــــ حسنین کاظمی نے کہا ــــ "طوفانی بارش ہوتی تو تم وہاں سے نکل بھی نہ سکتیں۔ کوئی نہ کوئی تمہیں پکڑ لیتا۔ وہ اللہ ہی تھا جس نے تمہیں بے ہوشی کی حالت میں اٹھوا کر تھانے پہنچا دیا، ورنہ تمہیں کوئی اور اٹھا لے جاتا .... تم اس معجزے کی بات کرتی ہو کہ تمہیں اللہ نے ماہن سنگھ کے گھر سے اُٹھا کر تمہارے گھر تک کیوں نہ پہنچا دیا۔ نسیمہ! تم عام قسم کی انسان ہو پیغمبر نہیں ہو۔ پیغمبری کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ خدا نے پیغمبروں کو بھی آزمائشوں میں ڈالا تھا۔ حضرت یونسؑ کو مچھلی نے نگل لیا تھا۔ حضرت یوسفؑ

کو بھائیوں نے کنوئیں میں پھینک دیا تھا، حضرت نوحؑ اُس سیلاب میں گھر گئے تھے جس میں پہاڑ ڈوب گئے تھے....

"نسیمہ! یہ فہرست بڑی لمبی ہے۔ اللہ نے پیغمبروں کی زندگیوں میں معجزے دکھائے اور میرے اور تمہارے جیسے انسانوں کو وہ قوتیں عطا کر دیں جنہیں کام میں لا کر انسان خود معجزے کر سکتا ہے۔ یاد رکھو نسیمہ! بدی عملاً کرو یا اس کے خیالات ذہن میں رکھو، یہ خدا کی دی ہوئی قوتوں کو بیکار کر دیتی ہے، پھر منیر جیسے اکھڑ دماغ شہزادے اور موہن سنگھ جیسے زبردست ڈاکو کمزور سی ایک لڑکی کے ہاتھوں مارے جاتے ہیں۔ یہ قوتیں صداقت اور نیکی کے خیالات سے اُبھرتی ہیں اور وہ معجزے رُونما ہوتے ہیں جو تم نے کر دکھائے ہیں....

"اپنے آپ کو پہچانو نسیمہ! یہ جو تم منیر کو اُس کی موت کے بعد دیکھتی رہی ہو اور اُس کی باتیں سُنتی رہی ہو، یہ قتل کے بعد کا ردِ عمل تھا۔ تم نے یہ خطرناک راز اپنے سینے میں دبا کر رکھا۔ تمہیں سمجھانے والا کوئی نہ تھا۔ تم خود سمجھنے سے قاصر تھیں۔ اب تم منیر کو نہیں دیکھو گی۔"

"کیا آپ کو یقین ہے کہ مجھ پر جادو یا تعویذ کا اثر نہیں؟" ــــ نسیمہ نے پوچھا۔

"ہاں، میں یقین سے کہہ رہا ہوں" ــــ حسنین کاظمی نے کہا ــــ "میں تمہیں ایک وظیفہ بتاؤں گا۔ یہ کرتی رہنا لیکن یہ فلسفہ سمجھنے کی کوشش کرو کہ جہاں بدی تمہیں چیلنج کرتی ہے تم حق اور صداقت کے تحفظ میں کھڑی ہو جاتی ہو پھر تمہاری تمام قوتیں بدی کے خلاف مرکوز ہو جاتی ہیں۔ اگر تم بدی کے آگے ہتھیار ڈال دینے کا صرف ارادہ کر لو تو تمہاری تمام قوتیں بکھر جائیں گی، پھر تمہاری زندگی میں کوئی معجزہ نہیں ہو گا۔ میں نے تمہیں بتایا ہے کہ میرے پاس کوئی جادو نہیں، بات صرف اتنی ہے کہ میں نے اپنی محنت، ہمت اور استقلال سے اِن قوتوں کو اپنا غلام بنا لیا ہے۔ جالندھر والے خواجہ صاحب اور آگے نکل گئے ہیں اور وہ اس علم کی گہرائی میں چلے گئے ہیں۔ یہ کمال تم بھی حاصل کر سکتی ہو، ہر انسان ان قوتوں کو اپنا غلام بنا سکتا ہے

لیکن لوگ بدی میں یا بدخیالوں اور تصوروں میں ڈوبے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے اور لوگوں کی یہی کمزوریاں ہیں جو انہیں پیروں اور عاملوں کا مرید بناتی ہیں اور وہ گمراہ ہوتے رہتے ہیں.... وہم اور شکوک سے نکلو نسیمہ!"

نسیمہ نے صاف طور پر محسوس کیا کہ اُس پہ بڑی وزنی سِل رکھی ہوتی تھی جو اُتر گئی ہے۔

❖

شام کو ملک عمر حیات اپنے کام سے فارغ ہُوا تو گھر جانے کی بجائے تانگے میں بیٹھا اور حسنین کاظمی کے گاؤں چلا گیا۔ نسیمہ کے متعلق وہ بہت پریشان تھا، وہ حسنین کاظمی سے پوچھنا چاہتا تھا کہ نسیمہ کو کیا ہو گیا ہے۔

"آپ نے اچھا کیا ہے کہ آ گئے ہیں" ــــ حسنین کاظمی نے عمر حیات سے کہا ــــ "نسیمہ کے متعلق بے فکر ہو جائیں۔"

حسنین کاظمی نے اُسے پوری تفصیل سے سنا دیا کہ نسیمہ نے منیر کو کس طرح اور کہاں سے دھکا دیا تھا اور اس کے بعد نسیمہ پر کیا گزرتی رہی ہے۔

"کاظمی صاحب!" ــــ عمر حیات نے ایسی آواز میں کہا جس میں حیرت بھی تھی گھبراہٹ بھی اور کچھ خوف بھی تھا ــــ "وہ تو مجھ پر بھی حملہ کرنے لگی تھی۔ کیا اُس کی یہ کیفیت خطرناک نہیں؟ یہ میرے بیٹے کے لئے بھی خطرناک ہو سکتی ہے۔"

"نہیں" ــــ حسنین کاظمی نے کہا ــــ "کوئی خطرہ نہیں۔ صرف یہ احتیاط کریں کہ اُس پر بدچلنی کا اور بیوفائی کا الزام نہ لگانا۔ آپ خوش قسمت ہیں کہ آپ کو یہ بیوی ملی ہے۔"

حسنین کاظمی نے اُسے بھی وہی باتیں سمجھائیں جو اُس نے نسیمہ کو سمجھائی تھیں۔ عمر حیات کے دل سے بوجھ اُترتا چلا گیا۔

"صرف ایک بات میرے ذہن میں اٹکی ہوئی ہے" ــــ حسنین کاظمی نے کہا ــــ "میں آپ کو بتا دیتا ہوں لیکن یہ نسیمہ تک نہ پہنچے.... منیر کی گمشدگی

کے سلسلے میں مجھے تھانیدار ملک مختار نے بلایا تھا۔ میں نے اُسے بہت کچھ بتایا تھا اور آپ کی طرف سے اُس کی توجہ ہٹا دی تھی۔ باتوں باتوں میں خواجہ صاحب کا ذکر آ گیا۔ تھانیدار نے مجھے کہا کہ خواجہ صاحب کا یہ علم اگر کامل ہے تو میں انہیں کہوں کہ منیر کے متعلق کچھ بتائیں ....

"میں دوسرے دن خواجہ صاحب کے پاس چلا گیا اور انہیں بتایا کہ منیر لاپتہ ہو گیا ہے۔ خواجہ صاحب کے پاس منیر کا سارا حساب کتاب ہے۔ یہ ان کے اپنے علم کا حساب ہے۔ اُسی کو دیکھ کر انہوں نے مجھے کہا تھا کہ منیر کا انجام بہت بُرا ہو گا۔ یہ شخص قتل ہو گا یا بہت بُری زندگی یعنی پاگلوں جیسی زندگی گزارے گا۔ اب میں نے انہیں کہا کہ منیر لاپتہ ہو گیا ہے تو انہوں نے اُسی وقت مراقبے میں جا کر اور اپنا کوئی حساب کر کے مجھے بتایا کہ منیر قتل نہیں ہوا۔ جہاں کہیں بھی ہے زندہ ہے اور وہ اچھی حالت میں نہیں۔"

"آپ کا کیا خیال ہے؟" ــــ عمر حیات نے پوچھا ــــ "معلوم کیا جا سکتا ہے کہ ....."

"قیافہ ہے" ــــ حسنین کاظمی نے کہا ــــ "غلط بھی ہو سکتا ہے لیکن خواجہ صاحب کا قیافہ کبھی غلط نہیں ہُوا۔"

"آپ نے تھانیدار کو بتا دیا ہے؟"

"نہیں" ــــ حسنین کاظمی نے جواب دیا ــــ "میں پھر کبھی تھانے گیا ہی نہیں نہ جاؤں گا .... بہر حال یہ بات نسیمہ کو نہ بتانا۔"

"اگر وہ زندہ واپس آ گیا تو سیدھا تھانے جائے گا" ــــ عمر حیات نے کہا ــــ "اور نسیمہ کے خلاف رپورٹ لکھوا دے گا۔"

"وہ وقت آنے دیں" ــــ حسنین کاظمی نے کہا ــــ "فکر نہ کریں۔"

عمر حیات جب واپس آ رہا تھا تو وہ اس سوچ میں کھویا ہُوا تھا کہ منیر زندہ واپس آ گیا تو اُسے فوراً کس طرح غائب کرایا جا سکتا ہے۔

نسیمہ بار بار دروازے کی طرف دیکھتی تھی۔ ملک عمر حیات کو اس وقت تک گھر آ جانا چاہیئے تھا۔ وہ تو رات کو اس وقت سے پہلے گھر آ جایا کرتا تھا۔ نسیمہ کو معلوم نہ تھا کہ عمر حیات حسنین کاظمی کے ہاں چلا گیا ہے۔ نسیمہ نے عمر حیات کے بیٹے شوکت کو کھانا کھلا کر سُلا دیا اور خود وہموں، وسوسوں اور بڑی تلخ سوچوں کی دلدل میں دھنستی چلی گئی۔

"میں کیا کر بیٹھی ہوں؟"

"نہیں، یہ میں نہیں تھی۔ پھر کیا تھا؟ کوئی جن یا آسیب مجھ پر قابض ہو گیا ہے؟"

"ملک صاحب نہیں آئے .... کیوں اتنی دیر لگا دی ہے انہوں نے؟ ماہن سنگھ کے آدمی انتقامی وار نہ کر گئے ہوں!"

"کیا وہ جانتے ہوں گے کہ ملک صاحب میرے خاوند ہیں؟"

"اگر کاظمی صاحب نے ملک صاحب کو بتا دیا کہ میں نے منیر کو لاپتہ کیا ہے تو ملک صاحب کیا کریں گے؟ .... مجھے طلاق دے دیں گے؟ اتنی خطرناک بیوی کو کون اپنے گھر رکھتا ہے!"

"پھر میں کہاں جاؤں گی؟ .... کیا کروں گی؟"

اور سوالوں کا ایک ریلا تھا جو چلا ہی آ رہا تھا، بڑی بے رحمی سے چلا آ رہا تھا۔ اس سے اُسے بچانے والا کوئی نہ تھا۔ کچھ بتانے والا کوئی نہ تھا۔ اُس کے ذہن پر اتنا زیادہ بوجھ تھا کہ حسنین کاظمی کی بتائی ہوئی کوئی ایک بھی بات اُسے یاد نہیں آ رہی تھی۔ حسنین کاظمی نے اُسے اچھی طرح سمجھایا تھا کہ اُس سے جو کچھ ہو گیا ہے یہ بظاہر بڑا ہی عجیب بلکہ ہیبت ناک لگتا ہے لیکن انسانی فطرت اور نفسیات کو سمجھنے والوں کے لئے یہ عجیب بھی نہیں اور ہیبت ناک بھی نہیں۔

وہ اس قدر پریشان ہو گئی کہ بھاگ جانے کے انداز سے اٹھی اور باہر والے دروازے کی طرف ذرا تیزی سے چل پڑی۔ اُس نے دروازے کی چٹخنی اتاری ہی تھی کہ کسی کے قدموں کی آہٹ دروازہ پر آ کر رکی۔ نسیمہ ڈر

گئی جیسے باہر جو کوئی بھی ہے وہ اُسے گرفتار کرنے آیا ہے۔ اُس نے ایک کواڑ ذرا سا کھولا مگر باہر کے دھکے سے کواڑ سارا ہی کھُل گیا۔

"اوہ!" —— نسیمہ نے خوف اور اطمینان کے مِلے جُلے لہجے میں کہا —— "آپ .... کہاں رہ گئے تھے آج؟"

"کام نسیمہ، کام" —— عمر حیات نے اُس کے دونوں کندھوں پر اپنے دونوں ہاتھ رکھ کر کہا —— "کاروبار میں وقت کی پابندی کہاں ہوتی ہے .... شوکی بھی انتظار کر رہا ہوگا؟"

"بچہ اتنا انتظار کیسے کر سکتا ہے!" —— نسیمہ نے دروازے کی چٹخنی چڑھا کر کہا —— "کھانا کھا کر سو گیا ہے۔"

عمر حیات بڑی تیزی سے نہا کر کھانے پر بیٹھ گیا۔ نسیمہ خاموشی سے کھانا کھا رہی تھی۔ عمر حیات اُس کی خاموشی کو محسوس کر رہا تھا اور یہ بھی کہ نسیمہ کا رنگ اُڑا اُڑا سا ہے اور وہ اپنے آپ میں نہیں۔

* * *

کھانے کے بعد عمر حیات نے نسیمہ کو الگ اپنے پاس بٹھا لیا۔

"اپنے آپ میں آؤ نسیمہ!" —— عمر حیات نے کہا —— "اپنے آپ کو تنہا اور بے آسرا نہ سمجھو۔ ایک طرف تو تم نے ماہن سنگھ جیسے خطرناک ڈاکو کو مار ڈالا ہے اور دوسری طرف تم گھبراہٹ اور خوف کا شکار ہوتی جا رہی ہو۔"

"سمجھ نہیں آتی اس گھبراہٹ اور خوف سے نکلوں کیسے!" —— نسیمہ نے کہا۔

"ماہن سنگھ کے قتل میں تمہیں کوئی نہیں پکڑے گا" —— عمر حیات نے کہا —— "اگر منیر بھی تمہارے ہاتھوں مارا گیا ہے تو سمجھو کچھ بھی نہیں ہوا۔"

نسیمہ یوں چونکی جیسے کسی نے اُسے سوئی چبھو دی ہو۔ اُس کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔ عمر حیات کی نظریں اُس کے چہرے پر جمی ہوئی تھیں اور وہ مسکرا رہا تھا۔

"کاظمی صاحب سے آپ کی ملاقات ہوتی ہے؟" —— نسیمہ نے پوچھا۔

"میرے دیر سے آنے کی وجہ یہی تھی" —— ملک عمر حیات نے کہا —— "میں اُن کے گاؤں چلا گیا تھا۔ میں اس خیال سے گیا تھا کہ وہ جو باتیں مجھے بتائیں گے وہ تم نہیں بتاؤ گی .... میں تمہارے متعلق بہت پریشان ہوں نسیمہ!"

"آپ شاید میری پریشانی کا اندازہ نہیں کر سکتے" —— نسیمہ نے کہا —— "ایک تو یہ ڈر ہے کہ میں پکڑی جاؤں گی لیکن جو خوف مجھے کھا رہا ہے وہ یہ ہے کہ مجھ پر کسی نے کوئی ایسا عمل کرا دیا ہے جس کے اثر سے میں کچھ دیر کے لئے ڈائن یا چڑیل بن جاتی ہوں۔"

"کیا کاظمی صاحب نے تمہیں یہ فلسفہ سمجھایا نہیں؟" —— عمر حیات نے کہا —— "انہوں نے جو باتیں تمہارے ساتھ کی تھیں وہی میرے ساتھ کی ہیں۔ یہ سمجھ میں آجانے والی باتیں ہیں۔"

"اور ایک ڈر یہ بھی ہے" —— نسیمہ نے آہ بھر کر کہا —— "کہ آپ نے یہ تو سوچا ہوگا کہ یہ تو بڑی خطرناک لڑکی ہے۔ آپ مجھے شیطان ماں کی شیطان بیٹی سمجھتے ہوں گے۔"

"نہیں" —— عمر حیات نے کہا —— "اگر قتل کی وجہ کچھ اور ہوتی تو میں تمہیں طلاق دے کر پولیس کے حوالے کر دیتا لیکن تم نے ان دونوں کو اپنی عصمت کی خاطر قتل کیا ہے .... خدا کی قسم نسیمہ! مجھے تم پر فخر ہے۔"

"قتل .... قتل" —— نسیمہ نے جھنجھلاتے ہوئے لہجے میں کہا —— "کتنا بھیانک لفظ ہے .... کیا آپ کو یقین ہے کہ کاظمی صاحب اس راز کو چھپائے رکھیں گے؟"

"مجھے یقین ہے" —— عمر حیات نے کہا —— "تم دل سے بوجھ اتار دو۔"

"پھر ایک ڈر ہے" —— نسیمہ نے کہا —— "یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ منیر زندہ ہو اور کبھی واپس آجائے۔"

"یہ تم بتا سکتی ہو کہ اُس کے زندہ رہنے کا امکان تھا یا نہیں۔"

"میں آپ کو وہ جگہ دکھا دوں گی" —— نسیمہ نے کہا —— "بیبیاں والی خانقاہ کے راستے میں ہے۔"

"اگر وہ زندہ آگیا تو دیکھ لیں گے کیا کرنا ہے"—— عمر حیات نے نسیمہ کو اپنے بازوؤں میں لے کر بڑے پیار سے کہا۔

نسیمہ نے اپنا آپ عمر حیات پہ اس طرح پھینک دیا جیسے وہ تھک کر چُور ہو چکی ہو۔ اُس کے دل سے یہ خوف نکل گیا کہ عمر حیات کا ردِ عمل اُس کے خلاف ہوگا۔ عمر حیات نے اُسے یہ نہ بتایا کہ جالندھر والے خواجہ صاحب نے کہا ہے کہ منیر زندہ ہے اور وہ اچھی حالت میں نہیں۔

"ملک صاحب!"—— نسیمہ نے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا —— "میرے ضمیر پہ ایک بوجھ ہے۔ وہ میں آپ کے سامنے اُتار پھینکنا چاہتی ہوں۔ میں آپ سے بے وفائی نہیں کر سکتی.... شادی سے پہلے میں منیر سے ملا کرتی تھی۔ وہ مجھے اچھا لگتا تھا۔ میرے دل میں اُس کی محبت پیدا ہو گئی تھی لیکن وہ پاک محبت کو نہیں سمجھتا تھا"—— بولتے بولتے نسیمہ چپ ہو گئی اور اس نے عمر حیات کو ایسی نظروں سے دیکھا جس میں بے بسی سی تھی، کچھ اداسی اور التجا بھی تھی۔

"کیوں؟"—— عمر حیات نے پیارے سے لہجے میں پوچھا —— "چُپ کیوں ہو گئی ہو؟"

"معلوم ہوتا ہے"—— نسیمہ نے کہا اور اُس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ آنسو دوپٹے سے پونچھ کر اُس نے بڑی لمبی آہ بھری اور بولی —— "معلوم ہوتا ہے میری ماں کے گناہوں کی سزا مجھے مل رہی ہے اور میں بڑے بُرے انجام کو پہنچ رہی ہوں .... لیکن ملک صاحب! کہنے والے جو بھی کہتے رہیں، میرا خدا جانتا ہے کہ اپنے جسم کو اور اپنے ضمیر کو پاک رکھا ہے۔ کوئی آدمی میرے سامنے کھڑا ہو کر کہے تو سہی کہ میرے ساتھ اُس کا ایسا ویسا تعلق رہا ہے۔ دنیا کے سامنے نہیں تو میں خدا کے سامنے سر اُونچا کر کے کھڑی ہو سکتی ہوں۔ اگر میں ایسی ویسی ہوتی تو...."

"اللہ کو کیا منظور ہے، میں بتا نہیں سکتا"—— عمر حیات نے کہا

"میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ میرے دل میں تمہاری نیت اور تمہارے چال چلن کے متعلق کوئی شک اور کوئی شبہ نہیں رہا۔ تم بات کرو۔ سینے میں جو غبار بھرا ہوا ہے وہ نکال دو۔ تمہاری ماں کے گناہوں کی سزا اُسی کو ملے گی۔ تم نے مجھے دھوکہ نہیں دیا تو میں تمہیں دھوکہ نہیں دوں گا۔"

"میں سینے میں کچھ بھی نہیں رکھوں گی"—— نسیمہ نے کہا —— "آپ نے مجھے جو محبت دی ہے اس کا پورا صلہ دوں گی.... میں کہہ رہی تھی کہ میرے دل میں منیر کی محبت پیدا ہو گئی تو میری ماں کو پتہ چل گیا۔ اُس نے مجھے روکا۔ کہنے لگی کہ منیر بدنام آدمی ہے۔ آج تو ماں باپ نے اُسے شہزادہ بنا رکھا ہے، کل جب باپ اُس کے سر پہ نہیں ہوگا تو یہ لڑکا سب زمین جائداد بیچ کر عیش و عشرت میں اُڑا دے گا....

"میں نے جب ماں کو بتایا کہ منیر کے ساتھ میری محبت تو پاک ہے تو ماں نے میرے دماغ میں کچھ اور ہی ڈالنا شروع کر دیا۔ کہتی تھی کہ محبت کوئی چیز نہیں، نہ محبت سے کچھ حاصل ہوتا ہے۔ مرد میں صرف دو خوبیاں دیکھو۔ اُس کے جسم میں طاقت اور جیب میں دولت ہو۔ اگر ایسا نہ ملے تو اپنے ابا جیسا خاوند ڈھونڈو.... کاٹھ کا اُلو.... مٹی کا مادھو.... پھر اس کو اپنی جوتی کے نیچے رکھو اور وہ کرو جو من کی مرضی ہو....

"بڑی ناپاک ماں ہے ملک صاحب! اس عورت نے مجھے ان الفاظ میں اپنی استادی سنائی تھی —— 'میں جب تیرے ابا کی دلہن بن کر آئی تھی تو میں کنواری نہیں تھی'—— پھر ماں نے کہا تھا —— 'میرے سینے میں تین راز بند تھے'—— اُس نے میرے ساتھ یہ باتیں اُس وقت کی تھیں جب میں نے جوانی میں قدم رکھا تھا۔ یہی کوئی دو اڑھائی سال پہلے۔ تب مجھے اپنا بچپن یاد آیا۔ میری ماں اب بھی کتنی خوبصورت ہے۔ آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ جوانی میں یہ کتنی حسین ہو گی۔ میرا باپ تو اس کا غلام تھا۔ مجھے یاد ہے کہ میرا باپ دو دو تین تین روز کے لئے کہیں چلا جاتا تھا تو ایک بڑا امیر آدمی میری ماں کے پاس آیا کرتا تھا۔ میں نے دونوں کو دو تین بار ایک ہی پلنگ پہ دیکھا ہے"

"کون تھا وہ؟"

"جانے دیں ملک صاحب!"— تسنیم نے کہا —"میں کسی اور کا پردہ نہیں اُٹھاؤں گی۔ مجھے آج وہ تینوں رانجھے یاد آرہے ہیں جن کے متعلق ماں نے کہا تھا کہ اُس نے اپنے سینے میں بند کر رکھے تھے۔ تینوں مجھے پیسے دیا کرتے تھے۔ میری ماں کو تو وہ بہت پیسے دیتے ہوں گے۔ اُسے پیسوں سے ہی پیار تھا۔"

"اگر ان کے نام بتا دو تو کیا حرج ہے؟"

تسنیم نے تینوں نام بتا دیئے۔ ان میں ایک مر چکا تھا اور دو بوڑھے ہو گئے تھے۔

"ان سے بڑھ کر اور پیسہ کس کے پاس ہوگا"— عمر حیات نے کہا —"اتنی وسیع زینداری۔ ان لوگوں کو تو یہ بھی پتہ نہیں چلتا تھا کہ روپیہ پیسہ پھینکیں کہاں۔"

"میرا خیال ہے کہ میری ماں نے ان کا یہ مسئلہ حل کر دیا تھا کہ روپیہ پیسہ کہاں پھینکیں"— تسنیم نے کہا —"میرے ابا کو تو میری ماں جھوٹ موٹ کے پیار سے اندھا کئے رکھتی تھی.... میں آپ کو اپنی بات سناتی ہوں۔ ایسی ماں کی بیٹی کو ماں جیسا ہی ہونا چاہیئے تھا لیکن مجھے شاید اللہ نے اُلٹی کھوپڑی دے دی تھی۔ میں پیار اور محبت کی خواہشمند تھی۔ شاید ہر لڑکی کو اپنے باپ کے ساتھ سب سے زیادہ پیار ہوتا ہے۔ مجھے اپنے ابو سے بہت پیار تھا مگر وہ تو مُردہ نکلا۔ میرے باپ نے مجھے کبھی نہیں اٹھایا تھا۔ میں اگر ضد کرتی کہ ابا کے ساتھ باہر جانا ہے تو اباصاحب ڈانٹ کر چپ کرا دیتے تھے....

"ماں کے رنگ ڈھنگ ہی کچھ اور تھے اور اُس کی دلچسپیاں بھی کچھ اور تھیں۔ مجھ سے چھوٹا ایک بھائی تھا، بچپن میں ہی مر گیا۔ پھر ایک بہن پیدا ہوئی۔ وہ بھی زندہ نہ رہی۔ میں بڑی چھوٹی عمر میں ہی گھر میں تنہائی محسوس کرنے لگی تھی۔ جُوں جُوں وقت گزرتا گیا، میرے باپ کے ساتھ میری ماں کا رویہ خراب ہوتا گیا۔ کرتے

کرتے میری ماں نے میرے ابا کو گھر میں نوکر کی حیثیت دے دی۔ ابا نے میری ماں سے کبھی یہ پوچھنے کی جرأت بھی نہیں کی تھی کہ وہ اتنے پیسے کہاں سے لاتی ہے۔ آپ جانتے ہیں کہ ہم غریب تو نہیں تھے لیکن ماں نے آمدنی کا کوئی اپنا ہی ذریعہ بنایا ہوا تھا....

"ماں نے مجھ میں اُس وقت دلچسپی لینی شروع کی جب میری عمر پندرہ سال ہوگئی۔ میرا قد کاٹھ اچھا نکلا۔ جسم بھی اچھا اور شکل وصورت بھی اچھی نکلی۔ اب تو میرا دماغ سوچنے اور سمجھنے کے قابل ہو گیا تھا۔ ماں نے مجھے آمدنی کا ذریعہ یوں بنا لیا کہ میرے رشتے کے لئے عورتیں آنے لگیں۔ میری ماں ہر ایک کے ساتھ پکا وعدہ کر کے اُن سے خوب کھاتی پیتی۔ دو گھر ایسے تھے جن کے لڑکوں کو میری ماں نے اپنے اثر میں لے لیا۔ دونوں میرے امیدوار تھے۔ میری ماں نے ان سے بہت پیسے بٹورے۔ وہ ایسی حرکتیں مجھ سے چھپاتی نہیں تھی۔ یہ حرکتیں مجھے بہت بُری لگتی تھیں۔ ماں نے جس جس لڑکے کے ماں باپ کو پھانس رکھا تھا، ان میں سے کوئی بھی مجھے پسند نہیں تھا۔ ماں دراصل مجھے بیچنا چاہتی تھی....

"اور بڑے ہو کر میں نے منیر کو پسند کر لیا۔ میری ماں کو میرے جذبات کے ساتھ ذرا سی بھی دلچسپی نہیں تھی۔ محبت کے نام سے اُس نے مجھے بہت ڈرایا۔ کہتی تھی کہ مرد جانتے ہی نہیں کہ پاک محبت ہوتی کیا ہے۔ مجھے بعد میں پتہ چلا تھا کہ میری ماں مجھے منیر سے ہٹاتی تھی اور اُس سے پیسے بھی بٹور لیتی تھی۔ اُسے بھی میری ماں نے میرے رشتے کا وعدہ دے رکھا تھا....

"پھر اُس کی نظر آپ پر پڑی اور اُس نے آپ کے ساتھ راہ ورسم پیدا کر لی۔ اُس نے مجھے کہا کہ یہ ہے مالدار اسامی۔ کاروبار ہے، اتنی بڑی حویلی ہے اور اکیلا ہے۔ ساری دولت گھر رہتی ہے۔ کوئی حصہ دار نہیں۔ آپ کو میری پہلی ملاقات یاد ہوگی۔ میں نے کچھ ایکٹنگ کی تھی۔ پہلے کبھی میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ آپ کے ساتھ میری جو شروع میں ملاقاتیں ہوتی

تھیں، ان میں میرا خلوص شامل نہیں تھا۔ میں یہ ضرور کہوں گی کہ آپ کے دل میں میری محبت پیدا ہو گئی تھی۔ یہ آپ کی مسکراہٹ سے ظاہر ہوتی تھی۔"

"ایسا ہی تھا نسیمہ!" ــــ عمر حیات نے کہا ــــ "میں نے تو شوکی کی خاطر شادی نہ کرنے کی قسم کھائی تھی لیکن تم نے میری قسم توڑ ڈالی .... میں واقعی تمہاری ماں کے ہاتھوں میں بیوقوف بن گیا تھا۔ اُس نے مجھے تمہاری جھلک دکھا کر مجھ سے بہت سے پیسے لے لئے تھے۔ ساتھ ہی یہ بھی کہتی تھی کہ میں برادری سے باہر رشتہ دے ہی نہیں سکتی۔"

"آپ سے اُس نے خوب رقم بٹوری ہو گی" ــــ نسیمہ نے کہا۔

"رقم؟" ــــ عمر حیات نے کہا ــــ "تم رقم کی بات کرتی ہو، اُس نے مجھ سے تین سوٹ لئے تھے۔ دوپٹے اور سینڈل بھی .... خدا کی قسم کھا کر کہتا ہوں نسیمہ! میں تمہیں اس سے دس گنا زیادہ قیمت دے کر بھی اپنے گھر لانے کو تیار تھا۔ مجھ سے یہ نہ پوچھو کہ تمہاری ماں نے مجھ سے کتنی رقم لی تھی۔"

"یوں کہیں نا، کہ آپ نے مجھے خریدا تھا" ــــ نسیمہ نے شگفتہ سے لہجے میں کہا ــــ "میری ماں مجھے بیچنا چاہتی تھی۔"

"میں اگر جھوٹ نہیں بول رہا تو میں نے تمہارے جسم کی قیمت نہیں دی تھی" ــــ عمر حیات نے کہا ــــ "میں نے محبت کی قیمت دی تھی۔"

"محبت خریدی نہیں جا سکتی ملک صاحب!" ــــ نسیمہ نے کہا ــــ "محبت محبت کے عوض ملتی ہے۔ وہ آپ نے مجھے دی اور میرے دل سے آپ کی محبت کے سوتے پھوٹ پڑے۔"

◆◆◆

"تم بات کچھ اور سنا رہی تھیں" ــــ عمر حیات نے کہا۔

"میں سنا رہی تھی کہ ماں نے مجھے بھی اپنے جیسا بنانے کی پوری کوشش کر ڈالی تھی" ــــ نسیمہ نے کہا ــــ "اُس نے آپ کو پھانسنے کے لئے باقاعدہ مجھے ٹریننگ دی تھی لیکن میرے دل میں منیر تھا .... پہلے

میں آپ کو منیر کا قصّہ سنا لوں جو میں نے سنانے کے لئے بات شروع کی تھی۔ میں نے شاید اُس کی شکل وصورت اور جوان جسم دیکھا تھا کہ وہ مجھے اچھا لگنے لگا، پھر اُس کی طبیعت اچھی لگی۔ وہ بے غم، بے فکر اور ہنسنے کھیلنے والا لڑکا تھا لیکن قریب ہو کر اُس کی عادتیں دیکھیں تو پتہ چلا کہ اُس کے ذہن میں محبت کا مطلب کچھ اور ہے۔ اُس نے دو ہندو لڑکیوں کے ساتھ اس قسم کی محبت رکھی ہوئی تھی۔ یہ اُس کے پاس اُس کے باغ میں جایا کرتی تھیں۔ اُس کے باغ میں جانے والی ایک دو مسلمان عورتیں بھی تھیں۔ مجھے بھی منیر انہی میں شامل کرنا چاہتا تھا لیکن میں نے اُس کے آگے ہتھیار نہ ڈالے....

"میں اُس کے باغ میں چند بار گئی تھی۔ اُس پر شیطان سوار ہوتا تھا لیکن میں اُس پر سوار ہو گئی اور اُسے میں یہاں تک لے آئی کہ اُس نے خود کہنا شروع کر دیا کہ اُسے جو لذّت اور سکون میری محبت میں مل رہا ہے وہ اُسے کوئی اور لڑکی نہیں دے سکی۔ میں محبت کی پیاسی تھی۔ میری ذات سے آواز اُٹھتی تھی کہ میں اپنی ماں جیسی نہیں بنوں گی اور میرا جو خاوند ہو گا اُسے اپنے باپ جیسا خاوند نہیں بننے دوں گی۔ معلوم نہیں مجھ میں یہ خیال کہاں سے آ گئے تھے۔ ماں نے تو مجھے کوئی اور ہی راستہ دکھایا تھا۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ میری ماں منیر کو اور منیر کے ساتھ میری دوستی کو پسند نہیں کرتی تھی لیکن اُس نے منیر سے بھی معلوم نہیں کتنے پیسے اور کپڑے وصول کر لئے....

"میری نیت صاف تھی۔ اگر پاک محبت گناہ ہے تو میں گناہگار ہوں لیکن میں نے منیر جیسے گناہگار میں وہ محبت پیدا کر دی تھی جس کا تعلق رُوح کے ساتھ ہوتا ہے جسموں کے ساتھ نہیں ہوتا۔ میری ناکامی یہ تھی کہ میں اُسے ہندو لڑکیوں سے ہٹا نہ سکی۔ وہ کہتا تھا کہ وہ میری محبت کو صرف اس صورت میں پاک رکھ سکتا ہے کہ اپنا جسمانی نشہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ پورا کر لیا کرے....

"وہ ایسے ہی کرتا رہا۔ مجھ سے ملے اگر چار پانچ دن گزر جاتے تو وہ پریشان اور بے چین ہو جاتا اور جب میں اُسے ملتی تو اُس کی حالت ایسی ہو جاتی جیسے معصوم سے بچے کو گمشدہ ماں مل گئی ہو۔ اُسے میرے جسم کے ساتھ دلچسپی نہیں رہی تھی۔ اب تو وہ ایسا اشارہ بھی نہیں کرتا تھا لیکن وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ تعلقات توڑنے پر آمادہ نہیں ہوتا تھا۔ ہم نے کبھی جدا نہ ہونے کے وعدے کئے تھے مگر ابھی وہ میری فطرت کے سانچے میں نہیں ڈھلا تھا۔ میں اُسے گناہوں کی دلدل سے نکالنا چاہتی تھی ....

"پھر میری ماں نے مجھے آپ سے ملوایا۔ پہلے پہل میرا دل آپ کو قبول نہیں کرتا تھا۔ میں نے ماں سے کہہ دیا تھا۔ ماں نے ایک روز مجھے یہاں تک کہہ دیا ___ تم تو پگلی ہو تسنیمہ! خاوند عمر حیات کو بناؤ اور دوستی منیر سے رکھو۔ یہ بھی کوئی بات ہے بھلا! ___ ماں کی اس بات نے مجھے جلا دیا .... بیٹی اپنے باپ کا پیار چاہتی ہے اور باپ کو دنیا بھر کی عظیم شخصیت سمجھتی ہے اور اپنی ماں کو وہ مقدس عورت مانتی ہے۔ اپنے ماں باپ کو وہ خدا کے بعد کا درجہ دیتی ہے لیکن ماں مجھے فریب کار اور عیار بنا رہی تھی اور باپ کو جیسے احساس ہی نہیں تھا کہ اُس کی ایک جوان بیٹی ہے جو بھٹک رہی ہے اور اُس کو راہ دکھانے والا کوئی نہیں" ___ تسنیمہ کو ہچکی سی آئی اور اُس نے دوپٹہ اپنی آنکھوں پر رکھ لیا۔

عمر حیات نے اُسے ایک بازو کے گھیرے میں لے لیا اور اُس کی دلجوئی کرنے لگا۔ تسنیمہ سسکیاں لے رہی تھی۔ آنسو رُکنے میں نہ آتے تھے۔

❖

"ملک صاحب!" ___ کچھ دیر بعد اپنے آپ کو سنبھال کر اُس نے لمبی آہ بھری اور کہنے لگی ___ "میں اپنی زندگی میں اُجالا اپنے ماں باپ کے دم قدم سے دیکھتی تھی مگر غور سے دیکھا تو یہ اُجالا تاریک تھا .... میں تاریک اُجالوں میں سے گزر کر آئی ہوں۔ منیر کی محبت کا اجالا بھی تاریک تھا۔ محبت کو سمجھتے ہوئے اور دل میں میری محبت پیدا کر کے بھی وہ دوسری لڑکیوں کے ساتھ

گناہوں کے ارتکاب سے باز نہیں آتا تھا ....

"مجھ پر اپنی ماں کی باتوں کا اثر ہو گیا یا میں نے آپ کی آنکھوں اور مسکراہٹ میں اُس محبت کا اشارہ پا لیا تھا جس کے لئے میں مری جا رہی تھی، یا شاید اس لئے کہ آپ میرے ساتھ شادی کر رہے ہیں، میں نے آپ کو قبول کر لیا۔ میں نے شوکی کو دل سے قبول نہیں کیا تھا۔ میں نے اپنے دل میں آپ کے بچے کا پیار پیدا کرنے کی کوشش ہی نہ کی ....

"شادی ہوتے ہی منیر ملا اور اُس نے مجھے مجبور کرنے کی کوشش کی کہ میں اُس کے ساتھ دوسری لڑکیوں جیسے تعلقات رکھوں .... ہاں، میں بھول گئی تھی .... اُس نے میری ماں سے میرا رشتہ مانگا تھا اور میری ماں نے انکار کر دیا تھا۔ اُس نے میری ماں سے کہا تھا کہ اُسے وہ مال واپس کیا جاتے جو اُس نے میری ماں کو کھلایا تھا۔ پھر اُس نے مجھے کہا کہ میں اپنی ماں کی مرضی کے خلاف اُس کی بیوی بن جاؤں۔ میں نے بھی انکار کر دیا تو اُس نے مجھے محبت کے واسطے دیئے پھر کہا کہ میں اُس کے پاس کبھی کبھی آجایا کروں۔ پھر اُس نے مجھے دھمکیاں دیں۔ تب میں جل اُٹھی اور میں نے اُس کی بہت بے عزتی کی۔ منہ میں جو آیا کہہ ڈالا اور کہا کہ میں اپنے خاوند کو دھوکہ نہیں دوں گی۔"

"اگر تم مجھے اُس وقت بتا دیتیں تو منیر کو میں اس طرح غائب کر دیتا جس طرح تم نے کیا ہے" ___ عمر حیات نے کہا۔

"میں خود اپنے آپ کو مجرم سمجھ رہی تھی اس لئے آپ کو پتہ نہ چلنے دیا" ___ تسنیمہ نے کہا ___ "دوسری وجہ یہ تھی کہ میں نہیں چاہتی تھی کہ آپ اس غنڈے اور بدمعاش کے سامنے آئیں۔ میں نے آپ کو بچانے کے لئے ایک بڑا ہی خطرناک راز آپ سے چھپائے رکھا تھا۔"

"وہ کیا تھا؟"

"پہلے میری ماں کی کارستانیاں سُن لیں" ___ تسنیمہ نے کہا ___ "شادی کے بعد میری ماں نے مجھے کہا کہ میں آپ سے پیسے لے کر اُسے دیتی رہا

کروں۔ میں نے ایسا ہی کیا۔ آپ مجھے مانگے بغیر پیسے دیتے رہتے تھے۔ میں کچھ اپنے پاس رکھتی باقی ماں کو دے دیتی۔"

عمر حیات نے قہقہہ لگایا۔ تسنیمہ چپ ہو گئی۔

"وہ مجھ سے الگ بھی پیسے لیتی رہی ہے" — عمر حیات نے کہا — "میں تمہاری محبت کی خاطر اُس کی ہر فرمائش پوری کرتا تھا۔"

"اُس نے مجھے کبھی نہیں بتایا تھا" — تسنیمہ نے کہا — "وہ مجھ پر ہر وقت سوار رہتی تھی اور اُس کا ایک ہی مطالبہ ہوتا تھا.... پیسے، پیسے ..... اس کا جواز وہ یہ پیش کرتی تھی کہ تمہارے خاوند کی جائداد کا وارث یعنی شوکی موجود ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہارا کوئی بچہ ہی نہ ہو اور ساری جائداد تمہارے سوتیلے بیٹے کے نام ہو جائے اس لئے خاوند سے زیادہ سے زیادہ رقم کھینچو اور میرے پاس جمع کراتی رہو۔"

"کم بخت اتنے پیسوں کا بناتی کیا تھی؟" — عمر حیات نے پوچھا۔

"لالچ، ہوس!" — تسنیمہ نے کہا — "میں اور کیا بتا سکتی ہوں۔"

"میں نے ایسی مائیں دیکھی ہیں جو اپنی بیٹیوں کے ذریعے اپنے دامادوں کو کھاتی ہیں" — عمر حیات نے کہا — "تمہاری ماں کوئی عجیب حرکت نہیں کر رہی۔ ایسی مائیں اپنی بیٹیوں کو اُجاڑ دیا کرتی ہیں۔"

"خدا کا شکر ہے کہ میں جلدی سمجھ گئی" — تسنیمہ نے کہا — "اتنے میں ہمارے گھر میں پتھر گرنے لگے اور آگ لگنے لگی۔ میری ماں نے ہماری اس حالت میں اپنا اُلو سیدھا کرنے کی کوشش کی۔ پتھروں سے پہلے شوکی کو دورہ سا پڑ جاتا تھا۔ میری ماں نے میرے کانوں میں یہ ڈالنا شروع کر دیا کہ یہ اِس بچے کی نحوست ہے اس لئے بچے کو غائب کرانا پڑے گا۔ یہ سارا واقعہ تو آپ کو معلوم ہے.... ملک صاحب! اگر میری نیت خراب ہوتی تو میں ماں کے کہنے پر اپنا آپ سائیں مستانے کے حوالے کر دیتی اور وہ شوکی کو غائب کرا دیتا۔"

"مجھے تمہاری نیت پہ کوئی شک نہیں تسنیمہ!" — عمر حیات نے کہا — "تم بے دھڑک بات کرو۔"

"اس آگ اور پتھروں والی مصیبت میں جس طرح آپ نے مجھے محبت دی، اس نے مجھے آپ کا غلام بنا دیا" — تسنیمہ نے کہا — "میں اسی محبت کی پیاسی تھی۔ یہ مجھے باپ سے نہ ملی، ماں سے نہ ملی، منیر سے نہ ملی، آپ کے سچے پیار نے مجھے شوکی کی ماں بنا دیا۔ شوکی مجھے یوں نظر آنے لگا جیسے اِسے میں نے جنم دیا ہو۔ میں نے ماں کو دُھتکار دیا، باپ کو دل سے اُتار دیا، منیر پر میں پہلے ہی لعنت بھیج چکی تھی۔ میں آپ کو اپنے جسم کا حصّہ سمجھنے لگی۔"

❖

"آپ سے میں نے بڑا خطرناک راز چھپا لیا تھا" — تسنیمہ نے کہا — "حسنین کاظمی صاحب نے مجھے بتایا تھا کہ یہ جو پتھر ہمارے گھر میں گرتے ہیں اور آگ لگتی ہے، یہ منیر نے جالندھر والے خواجہ صاحب سے مجھ پر کالا جادو کرایا ہے۔ وہ ہم دونوں کو یا صرف مجھے خوفزدہ کرنا چاہتا تھا۔ ہماری خوش قسمتی تھی کہ اِسی سلسلے کے ذریعے کاظمی صاحب ہمارے گھر آ گئے اور ہماری مصیبت ٹل گئی۔ اُنہوں نے مجھے بتایا تھا کہ کالے جادو کی میعاد ختم ہو گئی ہے۔"

"تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا؟"

"کاظمی صاحب نے کہا تھا" — تسنیمہ نے جواب دیا — "وہ کہتے تھے کہ ملک صاحب حیثیت والے آدمی ہیں اور منیر بدمعاش اور بے عزت آدمی ہے۔ اگر ملک صاحب کو پتہ چلا تو وہ منیر کے گلے پڑیں گے۔ منیر ان کی بے عزتی کر دے گا اور وہ نقصان بھی پہنچا سکتا ہے۔"

"تم بے وقوف ہو تسنیمہ!" — عمر حیات نے کہا — "مجھے بتا دیتیں۔ بے شک منیر بدمعاش اور بے عزت ہے لیکن میرے ہاتھ میں اُس سے زیادہ بدمعاش اور بے عزت آدمی ہیں۔"

"میں آپ کو کسی اور مصیبت میں نہیں ڈالنا چاہتی تھی" — تسنیمہ نے

کہا ——"پھر پتھروں والا سلسلہ ہی ختم ہو گیا ..... اور ہمارے گھر ڈاکو آ گئے"۔

"یہ ہے وہ بات جو میں تم سے سننا چاہتا ہوں"——عمر حیات نے کہا——"میں مان نہیں سکتا کہ منیر ڈاکوؤں کو پکڑنے آیا تھا۔ تھانیدار ملک مختار بھی یہی کہتا ہے"۔

"یہ شک تو مجھے بھی ہے"——نسیمہ نے کہا——"لیکن مجھے کچھ پتہ نہیں یہ کیسے ہُوا۔ آپ نے اُسے دوست بنا لیا تھا، پھر بھی مجھے اُس پر شک رہا۔ ایک روز وہ آپ کی غیر حاضری میں یہاں آ گیا۔ پہلے تو اُس نے یہ احسان جتایا کہ اُس نے اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر مجھے اور میرے گھر کو ڈاکوؤں سے بچایا ہے۔ پھر اُس نے محبت کا اظہار کیا۔ آخر اُس نے اپنی بُری نیت ظاہر کر دی۔ اُس نے مجھے گناہ پر اُکسایا....

"ملک صاحب! میں بیان نہیں کر سکتی کہ میرے وجود کے اندر کیا ہُوا، جیسے میرے اندر شعلہ اٹھا اور یہ بھی خیال آتا ہے جیسے میں تنور بن گئی۔ مجھے خواب کی طرح یاد ہے کہ میرے دونوں ہاتھ آگے کو ہو گئے اور انگلیاں ذرا ذرا اندر کو مُڑ گئیں، پھر معلوم نہیں کیسے ہُوا کہ میرے دائیں ہاتھ کی انگلیاں منیر کی گردن میں اُترنے لگیں۔ اُس کی شہ رگ میرے پنجے سے نکل گئی اور میں پلنگ پر گر کر رونے لگی۔ منیر جسے سب غنڈہ اور بدمعاش کہتے ہیں ایسا بھاگا کہ کواڑ سے ٹکرایا اور غائب ہو گیا"۔

"میں نے تمہیں اس کیفیت میں دیکھا ہے"——عمر حیات نے کہا——"تم میری شہ رگ پنجے میں لینے لگی تھیں"۔

"یہ کوئی دَورہ ہے"——نسیمہ نے کہا——"میرے وجود کے اندر سے کوئی طاقت اُٹھتی ہے۔ اس کیفیت کے گزر جانے کے بعد میں اتنی کمزور ہو جاتی ہوں کہ بے اختیار رونا آتا ہے اور میں کچھ دیر روتی رہتی ہوں"۔

◆◆

رات آدھی سے زیادہ گزر گئی تھی۔ عمر حیات اور نسیمہ باتیں کر رہے

تھے۔ نیند کا نام و نشان نہ تھا۔ نسیمہ بولتے بولتے رُک گئی۔ اُس کے ذہن میں زلزلہ آ گیا۔ وہ خود کو گول کر گئی۔

"اپنے ساتھ میں آپ کو بھی پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی"——نسیمہ نے کہا——"منیر کی اِس حرکت کو میں نے آپ سے اس لئے چھپائے رکھا کہ آپ نے اُسے بڑا گہرا دوست بنا لیا تھا۔ وہ چالاک آدمی تھا۔ میں ڈرتی تھی کہ وہ آپ کے دل میں میرے خلاف کدورت بھر دے گا۔ میں یہ سارا زہر اپنے آپ میں جمع کرتی رہی۔ میں نے کتنی راتیں آنکھوں میں کاٹی ہیں۔ سچی بات ہے کہ آپ سے میں ڈرتی تھی اور حالات کا مقابلہ کرنے کے لئے مجھ میں ہمت نہیں تھی۔ میں اتنی بے حال ہو گئی کہ سہارے ڈھونڈنے لگی اور بیبیاں والی خانقاہ کا خیال آ گیا....

"شادی سے پہلے ماں مجھے اس خانقاہ پر لے گئی تھی اور دعا کی تھی کہ میری شادی آپ کے ساتھ ہو جائے۔ میں سمجھتی تھی کہ اس خانقاہ نے میری مراد پوری کی ہے۔ اب میں یہ مراد لے کر خانقاہ پر جا رہی تھی کہ خدا منیر کو ہدایت دے یا موت دے دے۔ میں خانقاہ پر سلام اور دعا کر کے نکلی تو بڑی تیز بارش شروع ہو گئی۔ میں خانقاہ میں ہی رُک جاتی لیکن شوکی کو میں اکیلا چھوڑ گئی تھی۔ میں بڑی تیز چلتی آئی....

"بارش میں ایک گھوڑا دکھائی دیا۔ سوار نے مجھے دیکھا تو گھوڑا میرے قریب لے آیا۔ میں دیکھ کر ڈر گئی۔ وہ منیر تھا۔ وہ گھوڑے سے اُتر آیا اور میرے ساتھ چھیڑ خانی کرنے لگا۔ میرے روکنے پر اُس نے مجھے پکڑ لیا۔ میں اتنی جلدی زیر ہونے والی نہیں تھی۔ اس دھینگا مشتی میں ہم ایسی جگہ جا پہنچے جہاں بارش کے سیلابی پانی کی آبشار گر رہی تھی۔ وہ گہری جگہ ہے۔ آپ کو دکھاؤں گی۔ میں اب اُسی خطرناک کیفیت یا دَورے میں تھی۔ میں نے منیر کو زور سے دھکا دیا اور وہ اتنی بلندی سے گرا۔ نیچے چھوٹی چھوٹی چٹانیں اور پتھر تھے اور سیلابی پانی بڑا گہرا تھا۔ منیر کے زندہ رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا....

"میں وہاں سے دوڑتی بھاگتی گھر آئی۔ اس کے بعد میرا جو حال ہُوا وہ

میں آپ کو کیسے سناؤں۔ مجھے منیر اس طرح نظر آتا جیسے بالکل زندہ ہو۔ میں رات کو سو جاتی تو میں جاگ اُٹھتی۔ صاف محسوس ہوتا کہ کسی نے میرے پاؤں کا انگوٹھا پکڑ کر کھینچا اور مجھے جگایا ہے۔ میری پائنتی کے قریب منیر کھڑا ہوتا۔"

"یہ سب وہم تھا" — عمر حیات نے کہا — "کاظمی صاحب مجھے تمہاری یہ کیفیت بتا چکے ہیں۔ قتل کوئی معمولی سی بات تو نہیں ہوتی۔ انسان کا خون تو پیشہ ور قاتل بھی ہضم نہیں کر سکتے۔ اب تم نے اپنا راز کاظمی صاحب کو اور مجھے دے دیا ہے۔ اب تمہیں منیر نظر نہیں آئے گا۔ اب تم آرام اور سکون کی نیند سویا کرو گی۔"

"میں ان واہموں سے گھبرا کر ایک بار پھر بیبیاں والی خانقاہ کو چل پڑی" — نسیمہ نے کہا۔

"اور گرمی اور حبس کی وجہ سے تمہیں چکر آگیا" — عمر حیات نے اتنی لمبی بات کو یہیں ختم کرتے ہوئے کہا — "اور تم بے ہوش ہو کر..."

"نہیں" — نسیمہ نے کہا — "میں گرمی اور حبس کی وجہ سے بے ہوش نہیں ہوئی تھی۔ میں اُس جگہ کے قریب سے گزر رہی تھی تو اچانک بڑی تیز بارش شروع ہو گئی۔"

"نہ نسیمہ!" — عمر حیات نے کہا — "اُس روز بارش نہیں ہوئی تھی۔"

"یہ بھی واہمہ تھا" — نسیمہ نے کہا — "کاظمی صاحب کو میں نے سنایا تھا۔ وہ کہتے تھے یہ واہمہ تھا۔ میرے سامنے وہ سارا منظر آگیا تھا جس میں میں نے منیر کو دھکا دیا تھا۔ مجھے منیر نظر آیا اور میں اتنی ڈری کہ چکرا کر گر پڑی۔ یہ تو مجھے دوسرے دن پتہ چلا کہ میرا سر پتھر پہ لگا تھا۔ پتہ اس طرح چلا کہ میں نے سر پہ ہاتھ پھیرا تو مجھے ایک اُبھار محسوس ہُوا۔ اس کے بعد جو کچھ ہُوا وہ آپ کو معلوم ہے۔ میں اب صرف آپ سے ڈرتی ہوں کہ آپ مجھے بخش دیں گے یا سزا دیں گے۔"

"سزا کیوں دوں گا؟" — عمر حیات نے کہا۔

نسیمہ کو اُونگھ آنے لگی اور اُس کی آنکھ لگ گئی۔ اتنے دِنوں بعد اُسے آرام اور سکون کی نیند آئی مگر عمر حیات نہ سو سکا۔ رات تھوڑی سی رہ گئی تھی۔ وہ اُس نے جاگتے اور سوچوں میں اُلجھ اُلجھ کر گزار دی۔ اُسے یہ مسئلہ پریشان کر رہا تھا کہ حسنین کاظمی نے اُسے بتایا تھا کہ خواجہ صاحب کہتے ہیں منیر زندہ ہے اور وہ اچھی حالت میں نہیں۔ یہ تو عمر حیات بھی سوچ سکتا تھا کہ منیر اچھی حالت میں ہوتا تو واپس آچکا ہوتا۔ عمر حیات نے یہ تو سوچ لیا تھا کہ منیر زندہ واپس آگیا تو وہ اُسے پولیس تک پہنچنے سے پہلے غائب کرا دے گا لیکن اُس نے غائب کرانے کے عملی پہلو پہ غور نہیں کیا تھا۔ اب وہ سوچنے لگا تو یہ کام دشوار اور خطرناک نظر آنے لگا۔

منیر کو اغوا کرانے کے لئے عمر حیات کو اپنے تین چار غنڈوں بدمعاشوں کی ضرورت تھی۔ وہ مُنہ مانگی اُجرت پہ یہ کام کر سکتے تھے لیکن ان آدمیوں کو وجہ بھی بتانی تھی جو عمر حیات کسی کو نہیں بتا سکتا تھا۔ بتانے میں اُس کی اپنی بیوی کی بدنامی کا ڈر تھا۔ عمر حیات کو دوسرا خدشہ یہ نظر آ رہا تھا کہ اُس کے آدمی مُخبری کر سکتے تھے۔ پولیس کو خوش کرنے کے لئے وہ عمر حیات کو دھوکہ دے سکتے تھے۔ اِدھر عمر حیات کا کام کر کے پیسے وصول کر لیتے اور درپردہ تھانیدار کو خوش کرنے کے لئے اُسے بتا دیتے کہ منیر کہاں ہے اور اس کے اغوا اور قتل کا اصل مجرم کون ہے۔

عمر حیات کو کوئی طریقہ نہیں سُوجھ رہا تھا۔ ایک خطرہ تو یہ تھا کہ منیر پولیس کو رپورٹ دے گا کہ اُسے نسیمہ نے اس طرح گرایا تھا کہ اُس کا زندہ رہنا معجزہ ہے۔ اگر منیر نے یہ نہ کیا تو وہ نسیمہ سے انتقام ضرور لے گا۔ نسیمہ کو اغوا بھی کر سکتا ہے، اسے کہیں اکیلا دیکھ کر اس پر مجرمانہ حملہ بھی کر سکتا ہے۔

انہی سوچوں میں رات گزر گئی۔ عمر حیات نے آنے والے حالات اللہ کے حوالے کر دیئے۔

بیس بائیس دن اور گزر گئے۔ نسیمہ کی ذہنی حالت نارمل رہی حسنین کاظمی دو مرتبہ اُس کے پاس آیا اور نسیمہ کے حوصلے میں نئی رُوح پھونک گیا تھانیدار نے نہ نسیمہ کو تھانے بلایا نہ عمر حیات کو۔ منیر کی گمشدگی دو مہینے پُرانی بات ہو گئی۔ وہ اپنے ماں باپ کو یاد آتا تھا اور وہ ہر لمحہ اُس کے منتظر رہتے تھے۔ وہ ماننا نہیں چاہتے تھے کہ منیر کو کسی نے کہیں لے جا کر قتل کر دیا ہے۔

ایک روز ایک خبر عمر حیات کے گھر میں بم کی طرح پھٹی۔ محلے کی ایک عورت نسیمہ کے پاس آئی اور اُسے بتایا کہ منیر کا باپ تین چار آدمیوں کو ساتھ لے کر منیر کو لینے گیا ہے۔

"منیر کو؟" — نسیمہ نے تڑپ کر پوچھا — "کہاں ہے منیر؟ کیا وہ زندہ ہے؟ ... تم نے غلط سُنا ہے خالہ! اُس کی لاش لینے گئے ہوں گے۔"

"اری نسیمہ!" — اس عورت نے کہا — "اتنے عرصے بعد لاش کا کیا رہ جاتا ہے۔ وہ زندہ ہے۔ کہتے ہیں سولہ سترہ میل دور ایک گاؤں ہے جہاں نہ ریل گاڑی جاتی ہے نہ لاری ہے، اس گاؤں کے قریب کہیں کسی بزرگ کا بڑا مزار ہے یا کوئی خانقاہ ہے۔ منیر کو وہاں دیکھا گیا ہے۔"

"کس نے دیکھا ہے؟" — نسیمہ نے پوچھا۔

"قریشی پٹواری نے!" — عورت نے جواب دیا — "وہ کہیں اُدھر کام سے گیا تھا۔ کسی نے اُسے بتایا کہ یہاں ایک مزار ہے جہاں ہر کسی کی مراد پوری ہو جاتی ہے۔ پٹواری وہاں چلا گیا۔ وہاں ملنگوں اور مجاوروں میں اُس نے ایک آدمی کو دیکھا۔ اُس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی لیکن زیادہ لمبی نہیں تھی۔ سر کے بال بھی بڑھے ہوئے تھے۔ پٹواری نے اُسے پہچان لیا لیکن اُس کے سامنے نہ گیا۔ اُس نے مجاوروں سے منیر کے متعلق پوچھا کہ اس کا نام کیا ہے اور یہ کون ہے...

"مجاوروں نے بتایا کہ دو سوا دو مہینے گزرے، اِسے بے ہوشی کی حالت میں تین آدمی یہاں لاتے تھے۔ یہ دریا کے کنارے پڑا تھا۔ اس کے کپڑے بتاتے تھے کہ یہ سیلاب میں سے نکلا ہے۔ اسے لانے والے آدمی چلے

گئے اور اِسے یہیں چھوڑ گئے۔ یہ چُپ رہتا ہے اور مقبرے کے اندر باہر جھاڑو دیتا ہے۔ کبھی کبھی بولتا ہے اور کبھی پاگلوں جیسی حرکتیں کرنے لگتا ہے .... پٹواری نے اُسے تو کچھ نہ کہا، یہاں آ کر اُس نے منیر کے باپ کو بتایا کہ اُسے ایک آدمی پر شک ہُوا ہے کہ منیر ہے۔ منیر کے باپ نے سُنا تو تین چار آدمیوں کو ساتھ لے کر چلا گیا ہے۔"

"کوئی اور ہو گا" — نسیمہ نے کہا — "تم اُسے جانتی نہیں تھیں خالہ؟ کیا وہ منیر جھاڑو دیتا ہو گا جو گلیوں میں اکڑ اکڑ کر چلا کرتا تھا؟"

"شام تک پتہ چل جائے گا" — عورت نے کہا — "اگر وہی ہُوا تو اُسے ساتھ لے آئیں گے۔"

نسیمہ نے عمر حیات کو بتایا تو عمر حیات کی آنکھیں ٹھہر گئیں۔

منیر کا باپ تین چار آدمیوں کو ساتھ لے کر صبح ہوتے ہی چلا گیا تھا۔ یہ سب گھوڑوں پر گئے تھے۔

جوں جوں دن گزرتا جا رہا تھا نسیمہ اور عمر حیات کے دل ڈوبتے جا رہے تھے۔ دونوں کے دلوں سے ایک ہی دعا نکلتی تھی کہ جسے قریشی پٹواری دیکھ آیا ہے وہ منیر نہ ہو۔

وہ منیر ہی تھا۔ اُسے سورج غروب ہونے سے کچھ دیر پہلے لے آئے تھے۔ محلے کی گلیوں میں یہی ایک خبر سنائی دیتی تھی — "منیر آ گیا ہے" — عورتیں منیر کے گھر کی طرف دوڑی جا رہی تھیں۔ نسیمہ کا تو جیسے خون خشک ہو گیا ہو۔ عمر حیات گھر نہیں تھا۔ اُسے بازار میں کسی نے بتایا کہ منیر آ گیا ہے۔ وہ اپنے گھر آیا اور دیکھا کہ نسیمہ کا رنگ زرد ہے اور اُس کے ہونٹ گھبراہٹ اور خوف کی شدّت سے خشک ہو گئے ہیں۔

"اب کیا ہو گا؟" — نسیمہ نے کانپتی آواز میں پوچھا۔

"دیکھ لیں گے" — عمر حیات نے اپنی گھبراہٹ کو دباتے ہوئے کہا — "تم اتنا نہ ڈرو۔"

"آپ باہر نہ نکلنا" — نسیمہ نے کہا۔

"نہیں نسیمہ!" — عمر حیات نے کہا — "مجھے باہر نکلنا چاہیئے" — ذرا سوچ کر بولا — "مجھے منیر کے گھر جانا چاہیئے۔"

"نہ جائیں" — نسیمہ نے کہا — "اُس کے سامنے نہ جائیں۔ وہ سب کے سامنے آپ کو کہہ دے گا کہ میں نے اُسے اُس جگہ سے گرایا تھا۔"

"مجھے دو آدمیوں نے بتایا ہے کہ منیر بولتا ہی نہیں" — عمر حیات نے کہا — "اُس کا دماغ ٹھیک معلوم نہیں ہوتا . . . میں اُس سے ملنے جاتا ہوں۔ اُسے یہ تو معلوم ہی نہیں کہ میں جانتا ہوں کہ اُسے تم نے گرایا تھا۔ وہ ابھی تک مجھے اپنا دوست سمجھ رہا ہوگا۔ اگر اُس نے تمہارے خلاف کوئی بات کی تو میں کہوں گا کہ یہ تو پاگل ہو گیا ہے۔"

عمر حیات نسیمہ کو پریشانی کے عالم میں چھوڑ کر چلا گیا۔

سورج غروب ہو رہا تھا۔ منیر کے گھر کے باہر کچھ آدمی کھڑے تھے۔ ان کی بیٹھک کا دروازہ گلی میں کھلتا تھا۔ منیر کو دیکھنے والے اندر جا رہے تھے اور نکل بھی رہے تھے۔ عمر حیات اندر گیا تو سب سے پہلے اُس کی نظر منیر پر پڑی۔ حجام اُس کی شیو کر چکا تھا۔ منیر نے ابھی وہی کپڑے پہن رکھے تھے جو نسیمہ کے دھکے سے گرنے کے وقت اُس نے پہنے ہوئے تھے۔ یہ کپڑے مٹی کے رنگ جیسے ہو گئے تھے اور قمیض دو جگہوں سے پھٹی ہوئی تھی۔

عمر حیات ذہنی طور پر ہوشیار اور چالاک آدمی تھا۔ اُس نے منیر کو دیکھ کر بے تحاشہ خوشی کا اظہار کیا اور بازو پھیلا کر اُس کی طرف بڑھا۔ منیر کے ہونٹوں پر بے جان اور پھیکی سی مسکراہٹ آگئی۔ وہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اُٹھ کھڑا ہوا اور عمر حیات سے بغل گیر ہو گیا۔ عمر حیات کو ایک تو منیر کی آہ سنائی دی اور اُس کے ساتھ اُس کی یہ سرگوشی — "نسیمہ ٹھیک ہے؟ اللہ اُسے خوش رکھے" — پھر وہ عمر حیات سے الگ ہو گیا۔ عمر حیات اُس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا اور منیر کے باپ کو مبارک دی۔

"ملک صاحب!" — منیر کے باپ نے ہنستے ہوئے کہا — "سارا شہر منیر کو دیکھنے آیا ہے۔ اس نے کسی سے ہاتھ بھی نہیں ملایا۔ آپ واحد شخص ہیں جسے یہ اُٹھ کر اور گلے لگ کر ملا ہے۔"

بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تمام آدمی ہنس پڑے۔

"محبت ہو تو ایسی ہو" — کسی نے کہا۔

"ہماری طرف تو چوہدری منیر نے دیکھا ہی نہیں" — کوئی اور بولا۔

"بے چارہ معلوم نہیں کن مصیبتوں سے گزر کر آیا ہے" — ایک اور نے کہا۔

"کسی دشمن نے تعویذ کرا دیئے تھے جی!" — ایک اور بولا۔

سب نے کچھ نہ کچھ کہا مگر منیر نے کسی کی طرف توجہ ہی نہ دی جیسے اس کمرے میں وہ اکیلا بیٹھا ہوا ہو۔ حجام نے اُس کے بال کاٹنے شروع کر دیئے تھے۔

❖

بال کٹ چکے تو باپ نے منیر سے کہا کہ وہ نہا لے۔ منیر نے جیسے سُنا ہی نہ ہو۔ اتنے میں ایک ہیڈ کانسٹیبل بیٹھک میں داخل ہوا۔

"السلام علیکم" — ہیڈ کانسٹیبل نے کہا — "چوہدری صاحب مبارک ہو۔"

منیر کے باپ نے ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ ہاتھ ملایا اور اُسے بٹھایا۔

"میں آپ کو ایک تکلیف دینے آیا ہوں" — ہیڈ کانسٹیبل نے کہا — "آپ نے اپنے بیٹے کی گمشدگی کی رپورٹ تھانے میں لکھوائی تھی۔ اللہ نے آپ کو بیٹا واپس دے دیا ہے۔ ہماری مجبوری یہ ہے کہ کاغذوں کا پیٹ بھرنا پڑتا ہے۔ ملک صاحب (تھانیدار) نے آپ کو اور چوہدری منیر کو تھانے بلایا ہے۔ بیان لکھوانے ہیں۔ زیادہ دیر نہیں لگے گی میرے ساتھ ہی آجائیں۔ ملک صاحب انتظار کر رہے ہیں۔"

منیر کا باپ چاہتا تھا کہ منیر نہا کر کپڑے بدل لے لیکن ہیڈ کانسٹیبل نے اتنی مہلت نہ دی۔ عمر حیات پریشان ہو گیا۔ تھانیدار نے یہی پوچھنا تھا کہ منیر کہاں چلا گیا تھا۔ اب خطرہ تھا کہ منیر تھانیدار سے کہہ دے گا کہ اُسے

نسیمہ نے جان سے مارنے کے لئے فلاں جگہ سے گرایا تھا۔ عمر حیات نے بڑی تیزی سے سوچ لیا کہ ایسی صورت پیدا ہوگئی تو وہ کیا کرے گا اور کیا کہے گا۔ اُسے خیال آیا کہ ایسا ثبوت یا شہادت تو ہے ہی نہیں کہ نسیمہ نے منیر کو جان سے مارنا چاہا تھا۔

"چلیں چوہدری صاحب!" — عمر حیات نے منیر کے باپ سے کہا۔ "میں آپ کے ساتھ چلتا ہوں" — اُس نے منیر کو بازو سے پکڑا اور اُسے اُٹھاتے ہوئے کہا — "چلو منیر! آؤ تھانے والوں کو بھگتا آئیں"

منیر کا ایک چچا بھی ساتھ چل پڑا اور وہ تھانے چلے گئے۔ ملک مختار اُن کے انتظار میں بیٹھا تھا۔

"یہ ہے آپ کا بیٹا چوہدری صاحب؟" — ملک مختار نے منیر کے باپ سے کہا — "یاد کریں میں نے کیا کہا تھا .... کیوں منیر چوہدری!" — اُس نے منیر سے پوچھا — "کہاں چلے گئے تھے؟"

منیر نے سر بڑی آہستہ سے گھما کر پہلے اپنے باپ کی طرف پھر عمر حیات کی طرف دیکھا۔

"بتا دو منیر!" — عمر حیات نے پیار کے لہجے میں کہا۔

"منیر چوہدری!" — تھانیدار ملک مختار نے کہا — "تم کسی ایسے نشے کا کش لگا بیٹھے تھے جس کا اثر ابھی تک نہیں اُترا اور اپنے ماں باپ کو اور ہم سب کو مصیبت میں ڈالے رکھا"

"نہیں ملک صاحب!" — عمر حیات نے منیر کی خوشامد کرتے ہوئے ملک مختار سے کہا — "منیر میرا یار ہے .... سگے بھائیوں سے بھی آگے۔ یہ کوئی نشہ نہیں کرتا"

"پھر یہ بولتا کیوں نہیں؟" — تھانیدار نے کہا — "میں اسے گرفتار تو نہیں کر لوں گا"

"بولو منیر!" — عمر حیات نے کہا۔

"میں سیلاب میں گر پڑا تھا" — منیر نے یوں کہا جیسے سویا ہوا

بول رہا ہو۔

"تم گھوڑی پر سوار نہیں تھے؟" — تھانیدار نے پوچھا — "کیا تم گھوڑی سے اُتر گئے تھے؟"

"ہاں، میں گھوڑی سے اُتر گیا تھا" — اب منیر کا لہجہ ایسا تھا جیسے اُسے ہپناٹائز کیا گیا ہو اور وہ ہپناٹائز کرنے والے کے زیرِ اثر بول رہا ہو۔

ملک مختار کے پوچھنے پر منیر نے وہی جگہ بتائی جہاں سے نسیمہ نے اُسے دھکا دیا تھا۔ ملک مختار نے اُس سے پوچھا کہ وہاں وہ کیا کرنے گیا تھا۔

"میں کہیں سے آ رہا تھا" — منیر نے سوتی ہوئی آواز میں کہا — "بارش آگئی۔ وہاں سے پانی گر رہا تھا۔ مجھے اچھا لگتا تھا۔ میں گھوڑی سے اُترا۔ آگے گیا۔ پانی نیچے گرتا تھا۔ بہت گہرا پانی تھا۔ میں نے جھک کر دیکھا۔ پاؤں پھسل گیا۔ میں توازن برقرار نہ رکھ سکا اور نیچے لڑھکتا گیا۔ پہلے چٹانوں پر لڑھکنے سے چوٹیں آئیں پھر سیلاب میں گرا۔ بہت ہاتھ پاؤں مارے۔ میں تیراک ہوں۔ سیلاب مجھے دریا میں لے گیا۔ اتنا یاد ہے کہ میں تیرتا رہا۔ دریا کے زور نے باہر نہیں آنے دیا۔ پتہ نہیں میں کہاں سے باہر آیا اور پتہ نہیں مجھے کون ساتھ لے گیا۔ کبھی اندھیرا ہوتا تھا کبھی آنکھوں کے آگے ستارے چمکتے تھے۔ پھر روشنی ہوگئی اور میں ایک مقبرے میں تھا"

"مجھے صرف یہ بتاؤ" — تھانیدار نے پوچھا — "تم خود گرے تھے؟"

"میں خود گرا تھا"

"کسی نے تمہیں اغوا تو نہیں کیا تھا؟"

"نہیں" — منیر نے نیند میں بڑبڑانے کے لہجے میں جواب دیا — "مجھے کسی نے اغوا نہیں کیا تھا"

"پھر کیا ہوا تھا؟" — ملک مختار نے کہا — "تم مقبرے میں تھے"

"میں مقبرے میں تھا" — منیر نے کہا — "وہاں لوگ آتے تھے، سلام کرتے تھے۔ دعا مانگتے تھے۔ وہ مجھے اچھے لگتے تھے۔ کہتے تھے اس مقبرے میں جو آتا ہے اُس کے دل کی مُرادیں پوری ہو جاتی ہیں۔ میں نے کہا کہ میں

مقبرے کا مجاور رہوں۔ میں وہاں جھاڑو دیتا تھا۔ پودوں کو پانی ڈالتا تھا۔ پانی کا چھڑکاؤ کرتا تھا۔ وہاں کے ملنگ اور مجاور مجھے روٹی کھلاتے تھے۔"

"تم روٹی کے لئے اُن کے پاس رہتے تھے؟" ــــ تھانیدار ملک مختار نے پوچھا۔

"میں روٹی کے لئے وہاں نہیں رہتا تھا" ــــ منیر نے غنودگی کے عالم میں کہا ــــ "وہاں میرا دل خوش ہوتا تھا۔"

"اتنے عرصے بعد گھر آکر تمہیں خوشی نہیں ہوتی؟"

"اتنے عرصے بعد مجھے گھر آکر خوشی نہیں ہوتی" ــــ منیر نے جواب دیا۔

منیر کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ ملک مختار نے منیر کے باپ سے کہا کہ وہ بیٹھا رہے اور باقی سب اُٹھ جائیں۔

◆◆◆

"بس چوہدری صاحب!" ــــ ملک مختار نے منیر کے باپ سے کہا ــــ "میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ آپ کے بیٹے کو کسی نے اغوا نہیں کیا اور اس کے ساتھ کسی نے کوئی زیادتی نہیں کی۔ مجھے آپ کا رسمی سا بیان چاہیئے کہ آپ کا بیٹا واپس آگیا ہے اور آپ کو کسی کے خلاف کوئی شکایت نہیں آپ مجھے یہ بھی بتا دیں کہ اسے آپ کہاں سے لائے ہیں۔"

"ملک صاحب!" ــــ منیر کے باپ نے کہا ــــ "میرے لئے یہ خوشی کیا کم ہے کہ میرا اکلوتا بیٹا مجھے زندہ اور سلامت مل گیا ہے۔ میری کسی کے خلاف کوئی شکایت نہیں۔ مجھ سے جو لکھوانا ہے لکھوا لیں" ــــ اُس نے سولہ سترہ میل دُور کے ایک گاؤں کا نام لے کر کہا ــــ "مجھے جونہی پتہ چلا کہ میرا بیٹا اس گاؤں کے قریب ایک مزار میں ہے تو میں نے دو چار آدمی ساتھ لئے اور وہاں پہنچا۔ منیر مزار کے باہر بیٹھا تھا۔ اس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی پھر بھی میں نے اسے پہچان لیا لیکن ایسے لگتا تھا جیسے اِس نے مجھے نہیں پہچانا۔ میں نے اسے بازو سے پکڑ کر اُٹھایا تو یہ اُٹھا۔ میں نے اسے گلے لگایا تب اس نے مری مری آواز میں کہا ــــ 'ابا کیوں آتے ہو؟' ــــ میں نے کہا کہ تمہیں گھر لے جانے آیا ہوں تو یہ

میرے ساتھ چل پڑا۔ اس کے لئے میں الگ گھوڑی لے گیا تھا۔ یہ گھوڑی پر سوار ہُوا اور میرے ساتھ آگیا۔"

"آپ نے وہاں کسی سے پوچھا نہیں تھا کہ منیر اس مزار تک کب اور کس طرح پہنچا تھا؟" ــــ ملک مختار نے پوچھا۔

"اُنہوں نے خود ہی بتا دیا تھا" ــــ منیر کے باپ نے جواب دیا ــــ "وہ کہتے ہیں کہ کوئی ڈیڑھ مہینہ پہلے یہ یہاں آیا تھا۔ اپنا نام اور اپنے گاؤں کا نام نہیں بتاتا تھا۔ اس نے مجاوروں کو یہی بتایا جو وہ آپ کو بتا چکا ہے۔ اس نے مزار کی خدمت شروع کر دی اور مجاوروں نے اسے اپنے ساتھ رکھ لیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ منیر بات نہیں کرتا۔ کچھ پوچھو تو جواب دیتا ہے لیکن بہت مختصر۔ اُنہوں نے یہ بھی بتایا کہ یہ دماغی لحاظ سے ٹھیک رہتا ہے لیکن دن میں ایک بار یا دو دِنوں بعد اس کی حالت کچھ اور ہو جاتی ہے۔ یہ آسمان کی طرف دیکھنے لگتا ہے پھر قہقہہ لگاتا پھر ہر طرف حیران سا ہو کر دیکھتا ہے۔ کبھی تو اُٹھ کر دَوڑ پڑتا ہے جیسے کسی چیز کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ فوراً رُک جاتا ہے۔ واپس آ جاتا ہے اور مزار کے دروازے میں بیٹھ کر رونے لگتا ہے۔"

"یہ خود گیا تھا" ــــ ملک مختار نے کہا ــــ "میں نہیں مانتا کہ یہ سیلاب میں گر پڑا تھا۔ یہ گانجا یا چرس پیتا رہا ہے جس کا اِس کے دماغ پر اثر ہو گیا ہے۔"

"ملک صاحب!" ــــ منیر کے باپ نے رندھیائی ہوئی آواز میں کہا ــــ "آپ تو جانتے ہوں گے۔ میرا بچہ ٹھیک ہو جائے گا؟"

"اسے دُودھ پلائیں، گھی کھلائیں" ــــ ملک مختار نے کہا ــــ "ٹھیک ہو جائے گا۔"

ملک مختار کو اس سے کوئی دلچسپی نہیں تھی کہ منیر ٹھیک ہوتا ہے یا نہیں۔ اُس نے منیر کی گمشدگی کی رپورٹ کو کنارے لگانا اور اس کیس کی فائل کو فائلوں کے قبرستان میں پھینکنا تھا۔ اُس نے منیر اور اُس کے باپ کے بیان لکھے اور دونوں کے دستخط کرا لئے۔ منیر نے اردو میں اپنا نام لکھا۔ وہ دماغی لحاظ سے ٹھیک تھا۔ ملک مختار نے انہیں جانے کی اجازت دے دی۔

"ملک عمر حیات صاحب!" — ملک مختار نے عمر حیات سے کہا — "آپ کا ان لوگوں کے ساتھ جانا ضروری تو نہیں! .... آپ سے ایک بات کرنی ہے۔"

عمر حیات نے منیر کے باپ اور چچا سے کہا کہ وہ چلے جائیں، وہ کچھ دیر تھانیدار کے پاس رُکے گا۔

"کہیں ملک صاحب!" — عمر حیات نے تھانیدار سے کہا — "کیا حکم ہے میرے لئے؟"

"آپ کو خبردار کرنا ہے" — تھانیدار نے کہا — "ایک تو اپنی ساس سے خبردار رہیں اور دوسرا منیر ہے۔"

"منیر؟" — عمر حیات نے پوچھا — "وہ کیوں؟"

"مجھے پہلے ہی شک تھا کہ آپ کے گھر میں جب ڈاکو داخل ہوئے تھے تو منیر آپ کے گھر میں پہلے سے موجود تھا" — ملک مختار نے کہا — "اُس کے موجود ہونے کی وجہ میں کچھ اور سمجھا تھا لیکن وجہ کچھ اور نکلی.... وہ آپ کو قتل کرنے گیا تھا۔ ایک طرف سے وہ آپ کے مکان میں داخل ہُوا اور دوسری طرف سے مستانہ اپنے ایک ساتھی کے ساتھ ڈاکے کی نیّت سے داخل ہُوا۔ منیر نے انہیں دیکھ لیا اور اس کے شیطان دماغ نے فوراً یہ ڈرامہ سوچ لیا جو اُس نے کھیلا، یعنی مستانے کو پکڑ کر آپ کا دوست اور شہر کا ہیرو بن گیا۔"

"آپ کو کس نے بتایا ہے؟"

"آپ کی ساس نے!" — ملک مختار نے جواب دیا — "آپ کو قتل کرانے میں اُس کا بھی ہاتھ تھا.... میں آپ کو منیر سے خبردار کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ وہ آپ کو قتل کر کے آپ کی بیوی کے ساتھ شادی کرنا چاہتا ہے۔ اپنی بیوی کو اُس سے بچائے رکھیں۔ اب منیر کا دماغی توازن ٹھیک نہیں۔ آپ اُسے دوست سمجھ رہے ہیں۔ ذرا سنبھل کر رہنا۔"

عمر حیات جب تھانے سے گھر کو جا رہا تھا تو جہاں اُسے یہ خوشی تھی کہ منیر نے تھانے میں نسیمہ کے خلاف کوئی بات نہیں کی وہاں یہ انکشاف اُسے ڈس رہا تھا کہ منیر اُسے قتل کرنے گیا تھا۔

"نسیمہ!" — اُس کے گھر پہنچتے ہی نسیمہ سے کہا — "خُدا نے تمہاری نیّت کا بہت بڑا صلہ دیا ہے۔ ایک یہ کہ منیر نے تھانے میں کہا ہے کہ وہ خود سیلاب میں گر پڑا تھا اور دوسرا یہ کہ منیر مستانے اور اُس کے ساتھی کو پکڑنے کے لئے ہمارے گھر میں نہیں آیا تھا بلکہ وہ مجھے قتل کرنے آیا تھا۔ خُدا نے ہمیں ڈاکوؤں سے بھی بچا لیا اور قاتل سے بھی۔"

عمر حیات نے نسیمہ کو تو اُس خوف اور خطرے سے بچا لیا جس نے اُس کا خون خشک کر رکھا تھا مگر وہ خود بہت پریشان تھا۔ منیر اُس کے لئے آسیب بن گیا تھا۔

پانچ چھ دن گزر گئے۔

منیر کو لوگوں نے باہر گھومتے پھرتے دیکھا لیکن وہ کوئی بات نہیں کرتا تھا۔ محلّے میں اُس کے متعلق مختلف کہانیاں مشہور ہوگئیں۔ ان پانچ چھ دنوں میں تین بار منیر کو ملک عمر حیات کے گھر کے سامنے سے گزرتے دیکھا گیا۔ اُس کی نظریں اس گھر کے دروازے پر جمی رہیں۔ اس دوران دو بار نسیمہ کو بڑی سخت مشکل کا سامنا ہُوا۔ ایک روز وہ کسی کے گھر سے واپس آ رہی تھی کہ گلی میں سامنے سے منیر آتا دکھائی دیا۔ دونوں کے درمیان فاصلہ بیس بائیس قدم ہوگا۔ نسیمہ کا جسم یکلخت بے جان ہوگیا۔ اُس میں پیچھے کو بھاگ جانے کی بھی ہمت نہ رہی۔ وہ اللہ کو یاد کرتی چلی گئی۔

منیر کے قدم رُک گئے۔ اُس کی نظریں نسیمہ پر لگی ہوئی تھیں۔ نسیمہ اُس کے قریب پہنچ گئی۔ منیر جو رُکا کھڑا تھا، ایک طرف ہوگیا۔ نسیمہ اُس کے قریب سے گزر گئی۔ آگے جا کر نسیمہ نے پیچھے دیکھا۔ منیر وہیں کھڑا اُسے دیکھ رہا تھا۔ نسیمہ نے گلی کا موڑ مڑتے پھر پیچھے دیکھا۔ منیر ابھی تک وہیں کھڑا تھا اور اُسے دیکھ رہا تھا۔

دوسری بار نسیمہ جمعرات کے روز سورج غروب ہونے سے ذرا پہلے قبرستان والی خانقاہ پر دیا جلا کر آ رہی تھی — اُس پر جو گزر رہی تھی اور جو

گزر رہی تھی، اُس نے اُسے اِس راہ پر ڈال دیا تھا جس پر مصیبت کے مارے لوگ پیروں فقیروں، خانقاہوں اور مزاروں کے سہارے لیا کرتے تھے۔

قبرستان اور شہر کے درمیان چند ایک کھیت تھے اور ایک دوسرے سے دُور دُور چند ایک جھونپڑا نما مکان تھے، نسیمہ قبرستان سے واپس آرہی تھی۔ جب اِن مکانوں کے قریب پہنچی تو اچانک منیر سامنے آگیا۔ ان کے درمیان فاصلہ بہت تھوڑا تھا۔

نسیمہ نے راستہ بدل لیا لیکن منیر اُس کے راستے میں آگیا۔ نسیمہ رُک گئی۔ اب اِن کے درمیان کوئی فاصلہ نہیں تھا۔ نسیمہ کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ دونوں کی نظریں ٹکرا رہی تھیں اور سانسیں بھی۔

"نسیمہ!" — منیر نے جیسے سسکی لی ہو۔

"ہوں!"

"سچی محبت کا اُجالا دکھا کر مجھے کس اندھیرے میں دھکیل دیا ہے؟" — منیر نے یوں دبی دبی آواز میں کہا جیسے اُس پر غنودگی طاری ہو۔

"خاوند کو دھوکہ نہیں دوں گی" — نسیمہ نے جیسے سرگوشی کی ہو۔

منیر کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے اور وہ ایک طرف ہٹ گیا۔ نسیمہ چل پڑی۔ کچھ دُور آکر اُس نے پیچھے دیکھا۔ منیر وہیں کھیت کی منڈیر پر بیٹھ گیا تھا اور اُس نے سر اپنے گھٹنوں میں دے رکھا تھا۔ منیر جب اچھا بھلا ہُوا کرتا تھا تو اس طرح کبھی گھٹنوں میں سر دے کر نہیں بیٹھا تھا۔ وہ تو شہزادہ تھا جو سر اونچا کر کے چلا کرتا تھا مگر اب وہ اُس جگہ سر نیہوڑا کر بیٹھ گیا جہاں گوبر بکھرا ہُوا تھا۔

اِن پانچ چھ دنوں میں منیر کا باپ اُسے اپنے پیر کے پاس لے گیا تھا اور پیر نے آسیبی غلبہ بتایا تھا۔ ایک عامل شاہ نے اُسے دیکھ کر کہا تھا کہ کسی نے اُس پر اُلٹے تعویذ کرا دیتے ہیں۔ مسجد کے امام نے "کتاب" نکال کر کہا تھا کہ منیر سے کسی بزرگ کی قبر کی بے ادبی ہوگئی ہے۔ امام نے کالے بکرے کا صدقہ بتایا تھا جو منیر کے باپ نے دے دیا تھا، لیکن کسی تعویذ نے اُس پر وہ

اثر نہیں کیا تھا جو اُس کا باپ چاہتا تھا۔ کالے بکرے کا صدقہ بھی بے اثر رہا۔ منیر پر خاموشی چھائی رہتی اور کسی کسی وقت اُس پر پاگل پن کا دَورہ پڑتا تھا۔

نسیمہ نے عمر حیات کو بتا دیا کہ منیر نے اُسے راستے میں روکا تھا لیکن اُس نے پریشان نہیں کیا۔

"کچھ نہ کچھ کرنا پڑے گا نسیمہ!" — عمر حیات نے پریشان سا ہو کے کہا — "اس کا دماغ صحیح نہیں رہا۔ اگر اُس نے پھر ایسی حرکت کی تو میں پولیس ہیڈکوارٹر میں جا کر ایس۔ پی کے ساتھ بات کروں گا کہ ہمیں ایک پاگل سے خطرہ ہے، اسے پاگل خانے میں داخل کرا دیا جاتے۔"

"پھر وہ کہہ دے گا کہ میں نے اُسے قتل کرنے کی کوشش کی تھی" — نسیمہ نے کہا۔

"اب کہتا رہے" — عمر حیات نے کہا — "تھانے میں اُس کا تحریری بیان موجود ہے کہ وہ خود پھسل کر سیلاب میں جا پڑا تھا۔ اب تمہیں اتنا پریشان نہیں ہونا چاہیئے .... لیکن نسیمہ! تمہاری ماں کے ساتھ میں کیا سلوک کروں؟ اُس نے مجھے منیر کے ہاتھوں قتل کرانا چاہا تھا۔"

"بھول جائیں" — نسیمہ نے کہا — "اُسے خدا سزا دے گا۔ میں جانتی ہوں میری ماں اُس کے ساتھ میرا سودا کرتی رہی ہے۔ وہ مجھے بیوہ کر کے میرا نکاح منیر کے ساتھ پڑھانا چاہتی ہے۔ منیر جب اچھا بھلا تھا تو اُس نے منیر کو پاگل بنا لیا تھا، اب تو منیر ہے ہی پاگل .... میں آپ کو ایک اور بات بتاؤں؟ .... میں نے سُنا ہے کہ گزشتہ رات منیر میری ماں کے پاس گیا تھا اور بہت دیر بعد وہاں سے نکلا تھا۔"

"اللہ ہی جانتا ہے ان کے درمیان کیا باتیں ہوتی ہیں" — عمر حیات نے کہا۔

◆◆◆

نسیمہ کی ماں اور منیر کی ملاقات کا نتیجہ اگلے روز ہی سامنے آگیا۔ عمر حیات اپنے کام کو چلا گیا تھا۔ نسیمہ گھر میں اکیلی تھی۔ ایک عورت بڑی تیز تیز نسیمہ کے

گھر میں آئی۔ وہ ہانپ رہی تھی۔

"اری کہاں ہو نسیمہ!"— اُس نے صحن میں آکر کہا۔ نسیمہ کمرے سے نکلی تو اس عورت نے ہاتھ ملتے ہوئے کہا —"ظلم ہو گیا ہے ظلم ہو گیا ہے۔ منیر نے تیری ماں کو گولی مار کر مار ڈالا .... تیری ماں کے گھر میں۔ وہ باپ کی دو نالی بندوق اُٹھاتے تیری ماں کے گھر گیا اور ایک کارتوس چلا کر بیچاری کا سر اُڑا دیا ہے۔"

وہ آخر اُس کی ماں تھی۔ نسیمہ دوڑتی باہر نکلی۔ باہر اُسے کئی آوازیں سنائی دیں کہ منیر نے ملک عمر کی ساس کو قتل کر دیا ہے۔ نسیمہ بڑی تیز چلتی گلیوں کے موڑ مڑتی گئی۔ آگے وہ کشادہ گلی آگئی جس میں نسیمہ کی ماں کا گھر تھا۔ وہاں اُس نے یہ منظر دیکھا کہ منیر کندھے سے کارتوسوں کی بیلٹ لٹکائے، ہاتھ میں بندوق پکڑے آہستہ آہستہ اِدھر آ رہا تھا جدھر سے نسیمہ جا رہی تھی۔ عورتیں اپنی منڈیروں پہ کھڑی تھیں اور آدمی دُور دُور کھڑے تھے۔ منیر اِدھر اُدھر دیکھتا تھا تو سب بھاگ جاتے تھے۔

"پاگل ہے۔ اس کے سامنے نہ ہونا۔ گولی چلا دے گا"۔ یہی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

"نسیمہ!"— کسی نے بلند آواز سے کہا —"یہاں سے چلی جاؤ۔ بھاگ جاؤ۔"

نسیمہ نہ رُکی۔ منیر رُک گیا۔ اُس نے بیلٹ سے ایک کارتوس نکالا اور بیرل کھولے۔ فائر کیا ہوا کارتوس نکال کر پھینک دیا اور اس کی جگہ نیا کارتوس ڈال کر بیرل بند کر لئے۔ بندوق کی دوسری نالی میں کارتوس موجود تھا۔

محلّے کے دو آدمیوں نے دوڑ کر تھانے اطلاع دے دی تھی۔ ملک عمر حیات کو بھی پتہ چل گیا تھا۔ وہ دوڑ پڑا۔ اُدھر سے تھانیدار تین کانسٹیبلوں کے ساتھ چل پڑا۔ اِدھر نسیمہ منیر سے پانچ چھ قدم دُور اُس کے سامنے رُک گئی تھی۔

"منیر!"— منیر کا باپ دوڑتا آیا اور دُور سے چلّایا —"بندوق مجھے دے دو"۔

منیر پیچھے مُڑا اور اپنے باپ کو دیکھا جو اُس کی طرف آ رہا تھا۔ منیر نے

بندوق کا بٹ اپنے کندھے سے لگا لیا اور باپ کا نشانہ لیا۔

"ہٹ چوہدری!"— کسی نے چلّا کر کہا —"پاگل ہے، گولی چلا دے گا"

باپ دوڑ کر ساتھ والے گھر میں گھس گیا۔ منیر نسیمہ کی طرف گھوما۔ بندوق کا بٹ اُس کے کندھے کے ساتھ اور نالیاں نسیمہ کی طرف اور انگلی ٹریگر میں تھی۔ پولیس آ رہی تھی۔ عمر حیات گھبراہٹ کے عالم میں دوڑا آ رہا تھا۔ اِدھر گلی میں کوئی منیر کے قریب آنے کی جرأت نہیں کر رہا تھا۔

صرف ایک آدمی نے جرأت کی۔ وہ اُصلا تھا۔ وہ بھی اس خبر پہ آیا تھا کہ منیر نے نسیمہ کی ماں کو مار ڈالا ہے۔ اس گلی میں آکر اُس نے یہ منظر دیکھا کہ نسیمہ منیر کے سامنے کھڑی ہے۔

"منیر! بندوق پھینک دے"— اصلے نے کہا —"اگر تم نے اس پر گولی چلائی تو میں تمہیں چیر پھاڑ دوں گا"— اُصلا نڈر ہو کر منیر کی طرف جا رہا تھا۔

منیر نے آہستہ آہستہ بندوق اصلے کی طرف گھمائی اور ٹریگر دبا دیا۔ فاصلہ بہت تھوڑا تھا۔ تمام چھرّے اُصلے کی پیشانی میں لگے۔ اُصلا گرا اور بغیر تڑپے مر گیا۔

نسیمہ وہیں کھڑی رہی۔ اُس نے موت کو قبول کر لیا تھا اس لئے وہ دنیا سے تعلق توڑ کر بے حس کھڑی تھی۔ منیر نے بندوق پھر نسیمہ کی طرف کر دی اور ایک آنکھ بند کر کے نسیمہ کا نشانہ لیا۔

"چلا دے گولی!"— نسیمہ نے کہا —"خُدا انصاف کرے گا۔"

منیر نے نشانہ لئے رکھا۔ نالیاں ساکن ہو گئیں۔ اب گولی چلنی تھی۔

"خدا کے حضور نیک پاک جاؤں گی منیر!"— نسیمہ نے بڑے تحمّل اور اطمینان سے کہا —"تجھ سے محبت کی تھی تو سچّی اور پاک محبت کی تھی۔ شادی جس سے ہوئی اُس کے ساتھ دل سے وفا کی۔ میں خُدا سے شرمسار نہیں ہوں۔"

منیر نے وہ آنکھ بھی کھول دی جو اُس نے شست لینے کے لئے بند کر رکھی تھی۔

نسیمہ نے اپنے دونوں ہاتھوں سے اپنا گریبان پکڑا اور ایک جھٹکے سے سینے سے قمیض پھاڑ ڈالی۔ اُس کا سینہ ننگا ہو گیا۔

"چلا گولی پاپی!"۔۔۔ اُس نے کہا۔

منیر نے اپنا گال بندوق کے بٹ سے اٹھا لیا پھر بندوق کا بٹ اُس کندھے سے نیچے آنے لگا اور نالیاں اُوپر اُٹھنے لگیں۔ پھر بٹ تیزی سے نیچے آگیا۔ اتنا نیچے کہ بندوق کی نالیاں منیر کی ٹھوڑی کو چھونے لگیں۔ پولیس ساتھ والی گلی میں آگئی تھی۔ عمر حیات پولیس سے آملا۔

نسیمہ منیر کے سامنے کھڑی تھی۔ منیر نے بندوق کی نالیاں اپنی ٹھوڑی کے نیچے کر لیں۔ اُس کی انگلی کی بجائے اب انگوٹھا ٹریگر پر تھا۔ نسیمہ سمجھ گئی کہ منیر کیا کرنے لگا ہے۔

"منیر!"۔۔۔ نسیمہ چلائی۔۔۔"بندوق اپنے مُنہ سے ہٹا لے!"

لیکن منیر نے انگوٹھا دبا دیا۔ بڑی زور کا دھماکہ ہُوا۔ چھرّے منیر کی ٹھوڑی کے نیچے سے اُس کے سر میں داخل ہُوتے اور اُس کی کھوپڑی توڑ کر اُوپر نکل گئے۔ منیر کے ہاتھ سے پہلے بندوق گری پھر وہ خود گرا۔

نسیمہ کی چیخ نکل گئی۔ اُسے چکر آیا۔ کسی نے اُسے اپنے بازوؤں میں لے لیا۔

"حوصلہ کرو نسیمہ!"۔۔۔ نسیمہ نے عمر حیات کی آواز سُنی۔ اُسی نے اُسے بازوؤں میں لیا تھا۔

"اُس نے اپنے آپ کو گولی مار لی ہے"۔۔۔ نسیمہ نے روتے ہُوئے کہا۔

"اللہ نے انصاف کیا ہے"۔۔۔ عمر حیات نے کہا۔

نھا نیدار منیر کی لاش پر جھکا ہُوا تھا۔